دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

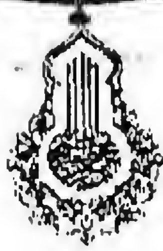
December
2014

پُراسرار نمبر

Monthly SACH-CHEE-KAHANIYAN Reg.No SC-117 December 2014 SR.12 Rs.60/-

فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720روپے افریقہ 65ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65ڈالر ایشیا یورپ 55ڈالر قانونی مشیر جی ایم بھنواینڈو کیٹ ہائی کورٹ



میں شرمندہ ہوں

میں خوف زدہ ہوں...... راتوں کو جاگتی ہوں۔ چیخیں مجھے سونے نہیں دیتیں۔ انسانی گوشت کے جلنے کی بو میری سانسوں میں بس گئی ہے۔ نوالے میرے حلق سے نہیں اترتے۔ مجھے ہر جگہ آگ محسوس ہوتی ہے۔ میرے تن بدن کو جلاتی ہے۔ کالا سیاہ دھواں مجھے سانس نہیں لینے دیتا۔ اللہ کے حضور سجدہ کرتی ہوں تو آنکھوں سے دکھ، پشیمانی اور اذیت آنسو کی شکل میں بہنے لگتے ہیں۔ مجھے اپنے چاروں جانب درندے رقص کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور اس رقص پر تالیاں بجاتی لاشیں میرے ہر سو ہیں، کام کرتی لاشیں، ہنستی بولتی لاشیں، سجی سنوری لاشیں قوم اور قومیت کی باتیں کرتی لاشیں، مذہب کی آڑ میں زندہ انسانوں کو جلانے والے درندوں کو پوجتی لاشیں...... میں ان لاشوں سے خوف زدہ ہوں۔ میں چھپنا چاہتی ہوں، میں کوٹ رادھا کشن میں جلائے گئے مسیحی جوڑے کی سوختہ لاشوں پر ماتم کناں ہوں میں ان کے معصوم جگر کے ٹکروں سے شرمندہ ہوں...... میں اپنے انسان ہونے پر نادم ہوں...... میں درندوں کے اس معاشرے کا فرد ہونے پر شرمندہ ہوں۔

منزہ سہام

کاشی چوہان کے قلم سے پہلا سلسلے وار ناول



"زہرِ عشق"

☆ عشق ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا!

☆ جنات کی حقیقت اللہ کے کلام قران اور دیگر آسمانی کتابوں سے ثابت ہے، لیکن دنیا میں ایسے بہت کم انسان رہے جو جنات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے! ایک جن نے انسانوں کی طرح جینے کی آرزو کی اور یہ کہانی پردۂ اخفا سے ظہور میں آ گئی۔

☆ یہ عشق ہی تھا جس نے اسے ایک لڑکی کا دیوانہ بنایا اور پھر اسی عشق کی آگ کو بجھانے کے لیے اور خود کو انسانوں کی دنیا سے چھپانے کے لیے اس جن نے ایسے ایسے کام اور راستے اختیار کیے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا چلا گیا۔

☆ خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

☆ تو کیا جن باتوں اور چیزوں پر یقین نہ ہو، وہ ہوتی نہیں ہیں؟

یہی وہ سوال ہے جس کا جواب حاصل کرنا ہزاروں سال سے انسان کی جستجو کا مرکز ہے۔

ایک ایسا یادگار ناول جو آپ کو مدتوں یاد رہے گا

بہت جلد "سچی کہانیاں" کے صفحات پر جلوہ گر ہو رہا ہے

کچھ اپنی باتیں

مٹی مجھے حیران کر دیتی ہے۔ خاکی رنگ کی بے جان، بے ذائقہ، بے شکل، بے ہنگم مٹی...... کہتے ہیں کہ کائنات میں موجود تمام رنگ چار رنگوں سے مل کر بنتے ہیں، لال، پیلا، نیلا اور کالا۔ یہ چار رنگ اُن تمام رنگوں کو تشکیل دیتے ہیں جو ہماری آنکھ کو نظر آتے ہیں، مگر نہ جانے کیوں یہ مٹی چیخ چیخ کر مجھ سے کہتی ہے کہ نہیں تم انسانوں کے تجربات جھوٹے ہیں۔ مجھے دیکھو! میرا رنگ خاکی ہے اور تمہارے سارے رنگ، تمہارے سارے ذائقے میرے بطن سے پھوٹتے ہیں۔ تم مجھے پاؤں تلے روندتے ہو۔ حقیر سمجھتے ہو اتنا حقیر سمجھتے ہو کہ کسی کو گھٹیا کہنا ہو تو خاک برابر کہہ دیتے ہو۔ کسی کو ذلیل کرنا ہو تو اسے خاک میں ملا دیتے ہو۔ بے نام ونشان ہونے کو خاک ہو جانا کہتے ہو۔ تم نے اپنی ساری مثالوں میں خاک کو گھٹیا پن کی علامت بنا رکھا ہے لیکن کاش تم جانتے، کاش تم غور کرتے میری کیچڑ زدہ، بدبودار حالت میں بھی تمہارے تمام پھولوں کی خوشبو محفوظ رہتی ہے۔ میرے اس خاکی رنگ میں تمہارے تمام حسین رنگ موجود ہیں۔ یہ تمہارا سرخ گلاب اپنا رنگ کہاں سے لاتا ہے۔ یہ تمہارے سرسبز لہلہاتے کھلیان ہریالی سے کہاں لاتے ہیں۔ یہ تمہارے سرسوں کے پھول پیلا رنگ کہاں سے لاتے ہیں۔ یہ تمہاری حسیناؤں کے ہاتھوں پر کھلتی ہوئی مہندی، کہاں سے چرا کر رنگ جماتی ہے۔ میں تمہارے سارے رنگ فراہم کرسکتی ہوں اور تم مجھے بے رنگ، حقیر کہتے ہو۔ تمہارے اناروں میں کھٹا میٹھا ذائقہ، تمہارے آموں کا میٹھا ذائقہ، تمہارے انگوروں کا رسیلا ذائقہ، تمہاری سبزیوں کے ذائقے، تمہارے پھلوں کے ذائقے، تمہارے مسالوں کے ذائقے، تمہارے اناج کے ذائقے، تمہاری خوراک میں شامل گوشت کے ذائقے یہ سب ذائقے مجھ میں موجود ہیں۔ ہاں ہاں مجھ میں...... اس مٹی میں جسے تم خاک برابر سمجھتے ہو۔ میں تمہارے لیے اپنے سینے میں محبت کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر لیے بیٹھی ہوں اور قطرہ قطرہ تم پر نچھاور کیے جا رہی ہوں اور آج سے نہیں ہزاروں، لاکھوں سالوں سے تم پر نچھاور کیے جا رہی ہوں۔ تمہیں خوش کر رہی ہوں، تمہارے اجداد کی پرورش کی اور تمہاری اولادوں کی بھی پرورش کروں گی مگر اے انسان! تجھ سے ایک ہی درخواست کرتی ہوں کہ مجھے 'پستی' کہنا چھوڑ دے، میں تیری بلندی ہوں۔ تیرے قدم مجھ پر جمے ہیں۔ ڈرتی ہوں کہیں یہ قدم اکھڑ نہ جائیں کیوں کہ تم غرور میں، گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ تم احسان فراموشی کے عادی مریض بن چکے ہو۔ تم اربوں کی تعداد میں میری چھاتی پر رینگتے پھرتے ہو اور میں اپنی خوشی تمہارا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ میں تمہیں کھلا پلا رہی ہوں لیکن یہ کیا ہے؟ تم میرا احسان مانو نہ مانو مگر تم مجھ سے دشمنی پر اتر آئے ہو۔ میرے دریاؤں میں زہریلا کیمیکل بھر رہے ہو، جنگلوں کو بے دریغ کاٹ رہے ہو، میری فضا کو زہریلے دھوئیں سے بھر رہے ہو، میرے وجود میں سے سانس کی صورت گیسیں نکال رہے ہو، میرے بطن کے محفوظ خزانوں کو درندوں کی طرح نوچ، کھسوٹ رہے ہو...... اے انسان باز آ جاؤ، خدا کے لیے باز آ جاؤ ورنہ کسی دن میں خلا میں گھومنا بند کر دوں گی اور کسی بلیک ہول میں غائب ہو جاؤں گی۔

میری دہلیز پر سوتی ہوئی خاک یہ کہانی مجھے اکثر سناتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا میں اربوں انسان بستے ہیں انہیں جا کر سناؤ۔ وہ کہتی ہے سناتی تو سب کو ہوں مگر سنتا کوئی کوئی ہے۔ تم سے عرض ہے کہ میری کہانی سن کر سچی کہانیاں میں چھاپ دو گے کیوں کہ اس وقت میری کہانی سے زیادہ سچی کہانی کوئی نہیں۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

شروع اللہ کے بابرکت نام سے، جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔

قارئین کرام اور احوالی ساتھیوں کو بینا تاج کا سلام۔ یہ میری بحیثیت ایڈیٹر آپ لوگوں سے پہلی ملاقات ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ سے اُمید ہے کہ آپ کا اور ہمارا ساتھ اتنی ہی اپنائیت اور خلوص سے جڑا رہے گا۔ جتنا کہ اب تک اس پرچے سے وابستہ ہو کر رہا ہے۔

عزیز ہم وطنوں، قلم کاروں، آج کیوں نہ ہم اس نام کے ساتھ آپ سے ناطہ قائم کریں جو جہانوں کا مالک اور خالق ہے "اللہ کی محبت" نبی کریمؐ نے فرمایا۔ "جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیلؑ کو آواز دیتا ہے کہ اللہ فلاں بندے سے پیار کرتا ہے۔ تم بھی اُس سے محبت کرو۔ جبرائیلؑ بھی اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر آپ تمام آسمان والوں میں آواز دیتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے۔ تم بھی اُس سے محبت کرو۔ تمام آسمان والے اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

اُس کے بعد دنیا والوں میں اس کی مقبولیت عام ہو جاتی ہے۔ حضورؐ نے کوئی شخص ایمان کی حلاوت (مٹھاس) اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک وہ اگر کسی شخص سے محبت کرتا ہے تو صرف اللہ کے لیے کرے۔

اللہ ہم سب کو ان نادر باتوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

آیئے اب اپنی رنگا رنگ بزم سجائیں کہ ساتھی بہت دیر سے بے چین ہو رہے ہیں

☒ سلیم اختر راولپنڈی سے شامل احوال ہیں عزیزہ منزہ بہن! سلامت رہیے آداب اللہ کرے آپ بہ خیریت ہوں نومبر کا "سچی کہانیاں" میرے سامنے ہے میں اسے ایک یادگار شمارہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا "لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ" میرے نام کر کے آپ نے اپنی پرخلوص چاہتوں کا جو خزانہ مجھ پر لٹایا ہے اس کا شکریہ ادا کروں تب بھی کم ہے میں آپ کی محبتوں کا مقروض ہی رہوں گا۔ آج مجھے سہام مرزا بہت یاد آرہے ہیں اور ان کی یاد نے آنکھیں نم کر دی ہیں آپ نے نہ صرف میرا بلکہ مرزا صاحب کا مان بھی بڑھایا ہے یہ الفاظ لکھتے ہوئے یوں لگ رہا ہے جیسے وہ میرے آس پاس ہی ہیں۔ ان کی خوشبو کا احساس میرے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے آپ نے دیگر رائیٹرز کو بھی ایوارڈ دینے کا اعلان کر کے ان کا مان بھی بڑھایا ہے یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور عظمت ہے۔ میں تمام ایوارڈ یافتگان کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہر رائیٹر سچی کہانیاں، کو اپنی تحریروں سے نوازتا اور سنوارتا رہے گا اور آپ بھی خلوص کے خزانوں سے ان کی جھولیاں بھرتی رہیں گی۔ میں آپ اور سچی کہانیاں کی تمام ٹیم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے

رائیٹرز کا دیرینہ مطالبہ پورا کر کے اپنے پرعزم ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ نومبر کا شمارہ دیکھ کر اور پڑھ کر یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ''سچی کہانیاں'' کا پرانا دور، عروج والا، لوٹ آیا ہے جب شمیم نوید (مرحوم) جیسے ایڈیٹر اس میں چار چاند لگایا کرتے تھے آج مجھے سب کچھ ویسا ہی لگا ہے نہایت ہی خوب صورت اور مکمل شمارہ اور اس کا کریڈٹ میں کاشی چوہان کو ہی دوں گا۔ ویل ڈن کاشی! ارادے پختہ ہوں دل میں ایک بے پناہ لگن ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی برکتوں کا منہ کھول دیتے ہیں اور پھر نومبر جیسا شمارہ مارکیٹ میں آتا ہے۔ مگر یہ کیا آپ احوال میں آئندہ ماہ سے غیر حاضر ہو جائیں گے اور ہمیں محترمہ مینا تاج کے حوالے کر دیں گے خوش آمدید...... بہنا! مینا تاج صاحبہ! اور مبارک باد کاشی کو خوبصورت شمارہ دینے پر اس ماہ میں شمارے میں نا صرف کہانیوں کا معیار اور چناؤ اچھا ہے بلکہ اس کا سرورق منزہ بہن کا اداریہ اور کاشی کی کچھ اپنی باتیں بھی توجہ طلب ہیں احوال کے تو کیا ہی کہنے سچی کہانیاں کے ستارے اپنی خوشبو بکھیر رہے ہیں پھول اور کلیاں اپنی اپنی بہار دکھا رہی ہیں ان سب کی حاضری سے احوال سجتا ہے رونق بڑھتی ہے۔ سب ہی محترم ہیں پیار کرنے اور چاہنے کے قابل ہیں۔ شاہد رفیق، ظفر، امجد علی، ارم ناز، ڈاکٹر صغیر امجد، عمران فائق، مجید احمد جائی، سیّد ہاقصی نقوی، رابعہ کنول، انیل حسین، ایم ارشد وفا، نازیہ جہانگیر، شفیق احمد، زیب ملک، جنجبل متیلو، نوید شاہ، ممتاز احمد، ایم اشفاق بٹ، پیر نوید، فیصل ندیم بھٹی، عادل حسین، سنبل، سدرہ انور علی، فریدہ جاوید، منشی محمد عزیز، نیر رضاوی، عظمی شکور، ثمرہ خان، انیسہ خاتون، نویرہ فاطمہ، نوید ہاشمی، بہترین، ثناء اشرف، علی گل، آمنہ علی، کنول عمران خان اور اسامہ ندیم آپ کی احوال میں حاضری اور تبصرے اچھے لگے ۔ بھائی صفدر علی حیدری! اب تو خوش ہیں نا آپ کے کالم کی تکمیل ہو گئی بہترین کو خوش آمدید رفعت محمود صاحب!! ایک عرصے بعد آپ کی واپسی اور حاضری بھلی لگی اب آتے رہیے گا بھائی عزیز آ جی، بیٹی مریم شاہ اور زرینہ جونیجو...... آپ کہاں ہیں لوٹ آئیں ناں۔ جنجبل متیلو، شعبان کھوسہ، نسیم سکینہ صدف، شاہانہ خان، رانا محمد شاہد، ام مناہل، شازیہ جاوید، شازی نے اچھا لکھا محمد علی اسد بھٹی نے محمد خان ڈاکو کے بارے میں اصل حقائق سے آگاہ کیا بہت خوب۔ جاوید راہی ہر ماہ بہترین تحریر لاتے ہیں۔ ایم ارشد وفا، مبارک علی شمسی، مومنہ بتول اور فوزیہ احمد نے اپنے قلم کا خوب جادو جگایا ہے تینوں قسطیں اور تحریریں پرچے کی جان ہیں۔ بھائی عادل حسین صاحب، پیر نوید صاحب، عظمی شکور صاحبہ اور اسامہ ندیم کراچی جی ہاں آپ نے ٹھیک کہا کہ ''بازگشت'' ''سچی کہانیاں'' کے مزاج کی کہانی نہیں تھی میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں آئندہ محتاط رہوں گا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ کبھی کبھی بادام کھاتے ہوئے کوئی کڑوا بادام بھی دانتوں تلے آ جاتا ہے شکریہ تمام اسٹاف کو آداب دعاؤں کے ساتھ۔

☆ سلیم اختر صاحب سدا خوش اور آباد رہیے خوبصورت لفظوں کے ساتھ سجا آپ کا خط شامل احوال ہے رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کا اس پرچے سے رشتہ ہمیشہ جڑا رہے ''آمین''

☒ طارق محمود ڈسکہ سے لکھتے ہیں پیارے کاشی بھیا اور تمام سچی کہانیاں سے محبت کرنے والوں کو ڈاکٹر طارق کی طرف سے محبتوں بھرا آداب! کیسے ہیں آپ سب۔ خدا کرے میرے وطن عزیز کا ہر ذرہ ذرہ خیریت سے ہو سچی کہانیاں ہر ماہ ایک سے بڑھ کر ایک لگتا ہے اور یہ سب کاشی چوہان اور پوری ٹیم کی کاوشوں کا نتیجہ ہے خدا سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور میرے ملک کے ہر ہر گوشے میں امن اور سلامتی کرے۔ خصوصاً کراچی امن کا گہوارہ بن جائے آپی فریدہ، جاوید فری، مقصود بلوچ، مجید احمد جائی، معاویہ عمر وٹو، انکل عبدالعزیز اور تمام دوستوں کو بہت سی دعائیں خوش رہیں اور خوش رہیں نماز اور قرآن میں

باقاعدگی ہر مسئلے کا حل ہے۔ کسی بھی بات کو برا مت منایئے اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیے اپنے لیے نہیں ان کے لیے جنھوں نے آپ سے بہت سی امید یں وابستہ رکھی ہیں خدا نے مہلت دی تو آئندہ ماہ پھر ملیں گے (اللہ نگہبان)

☆ خوش رہیں طارق اخو بصورت روشنائی سے سجا آپ کا خط شامل احوال ہے پرچہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

☒ ثانیہ بھٹی سیالکوٹ سے لکھتی ہیں اسلام وعلیکم کاشی سر اور اور تمام اسٹاف سچی کہانیاں کے قارئین کو بہت سی دعائیں اور سلام...... میں معذرت خواہ ہوں باقاعدگی سے حاضری نہیں دے پائی...... اس کی کچھ وجوہات ہیں گذشتہ تین ماہ سے سچی کہانیاں بہت تاخیر سے مل رہا ہے 10 تاریخ کے بعد ہی وصول ہوتا ہے اس سلسلے میں میں نے منیجر صاحب سے بھی رابطہ کیا انہوں نے بھی اپنی پوری کوشش کی مگر ادھر بک شاپ والوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا...... اگر میری حاضری باقاعدگی سے نہیں دے پائی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سچی کہانیاں سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا ہے سچی کہانیاں تو اب گھر کا فرد بن گیا ہے اور گھر کے فرد کو چھوڑا نہیں جاتا اکتوبر کا شمارہ 12 تاریخ کو ملا تمام کہانیاں اعلیٰ ہیں ''اب میرا انتظار کر''، ''یقین منزل ہے''، ''گناہ گار کون'' اور باقی تمام کہانیاں بھی بہتر تھیں۔ ایم اے راحت کا ناول ''ہم شکل'' پہلی قسط بہت سنسنی خیز لگی سخن آباد میں ''تیری کمی'' زبردست لگی۔ میں نے بہت سی کہانیاں بھی بھیجی تھیں جو آپ نے کہا تھا بہت جلد شائع کریں گے مگر نہیں کیں۔ ایک اور تحریر ارسال کر رہی ہوں امید ہے پسند آئے گی اور جلد ہی سچی کہانیاں کی زینت بنے گی...... میں کلاس روم میں بیٹھ کر لیٹر لکھ رہی ہوں اب اجازت چاہیے اللہ سچی کہانیاں کو مزید ترقی دے آمین۔

☆ ثانیہ بہت خوشی ہوئی یہ جان کر سچی کہانیاں تمہارے گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کر چکا ہے پر یہ بات غلط ہے کہ کلاس روم میں بیٹھ کر پڑھا جائے۔

☒ زیب ملک گھوٹکی سے لکھتے ہیں محترم کاشی چوہان اور منزہ صاحبہ اسلام وعلیکم! تمام قاری اور لکھاری اور ''سچی کہانیاں'' کی پوری ٹیم کو میری طرف سے سلام عرض، اس ماہ اکتوبر کا شمارہ گیارہ تاریخ کو ملا لیٹ ہونے کی وجہ میں خود ہوں میں گاؤں میں عید منانے آیا تھا سرورق کے دیدار نے ہوش اڑا دیے اتنی خوب صورت حسینہ ماشااللہ زندگی کا احساس...... بس مختصر سا لکھوں گا کہ بہترین مذہب...... بدترین قوم......!! کچھ اپنی باتیں...... کاشی صاحب میری طرف سے آپ کو لفظی نوبل انعام قبول ہو اپنوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

ایم اے راحت کا نیا سلسلہ پسند آیا مجد جاوید کی فیض عشق بھی بہت خوب صورت ہے ''قاتل حسینہ''، ''ڈیلیٹ آپشن''، ''بازگشت''، ''میرے لٹ نی'' اچھی رہیں۔ جاوید راہی کی ''اچھوت صاب'' سبق آموز تھی۔ آپ کی محفل میں ایک نظم اور ایک کہانی ''پیاس رحمت'' ارسال کر رہا ہوں اُمید ہے ضرور حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆ خوش رہو زیب، ترقی کرو۔ پرچہ کی پسندیدگی کا شکریہ آئندہ بھی اپنی پسند ناپسند سے آگاہ کرتے رہنا۔

☒ محمد یوسف لیہ سے لکھتے ہیں سلام وعلیکم پیارے کاشی چوہان صاحب! مزاج بخیر، سب سے پہلے منزہ سہام اور کچھ اپنی باتوں سے استفادہ کیا احوال میں ان ساتھیوں کا شکریہ جن میں اشفاق شاہین،

اسماعیل بروہی، شعبان کھوسہ، شاہد حسین، ملد رحیدری، ممتاز احمد اور بہنا سدرہ نور انھوں نے ... کہا بہنا تحسین جونیجو کی وضاحت مناسب تھی غفار ثاقب کے لیے اتنا کہنا چاہوں گا کہ خط کاٹ چھانٹ کر اور ادارے کی پالیسی کے مطابق شائع کیا جاتا ہے۔ "میں ... تو کو ایک سبق آموز کہانی تھی "گناہ گار" اور "جیون آگ کا دریا" کو پڑھ کر احساس ہوا مذہب کا معاملہ ... ہوتا ہے "شعلہ" ساں تحریروں میں ذیل ایک فیصلہ نے متاثر کیا اور تین مرد تمن کہانیاں میں نیا انتقام پڑھ کر عجیب احساس ہوا کہ انتقام ایسا بھی ہوتا ہے۔ ممکن ہو تو میری کہانی "عشق کی پکی فصلیں" کے بارے میں بتا دیں۔ شکریہ

☆ شکریہ یوسف پرچہ کی پسندیدگی کا اور اتنی نادانستہ غلطی پر نظر رکھنے کی پر بھیا ایک ہی بات کہنی ہے غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں۔

✉ شفق شیخی سیالکوٹ سے لکھتی ہیں اسلام وعلیکم، ایڈیٹر بھیا! خیریت مطلوب ہے، ایسا لگ رہا ہے ایک لمبے عرصے کے بعد احوال کی دنیا میں قدم رکھا ہو شاید ایسا ہی ہے، میں نے کافی عرصے کے بعد، سچی کہانیاں کو دیکھا اور اس عرصے میں بہت کم پڑھ پائی ہوں احوال میں بہت رونق آ جاتی ہے۔ آپ کی شاعری نے کمال کر دیا منزہ سہام کو سلام اور دعا پہنچے اور نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید میں نے کافی عرصے پہلے ایک طویل سچ بیانی ارسال کی تھی اسے قریبی اشاعت میں شامل کریں اپنی کچھ شاعری ارسال کر رہی ہوں اور ساتھ ہی ایک اور نئی "سچ بیتی" جو کہ پراسرار نمبر 3 کے لیے بھیج رہی ہوں احوال میں سب کو دعا اور سلام پہنچے "خدا حافظ"

☆ شکریہ شفق احوال میں تمہاری آمد خوش آئند لگی۔

✉ فرح انیس کراچی سے شامل احوال ہیں محترم کاشی بھائی سلام وعلیکم امید کرتی ہوں آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے میں سچی کہانیوں کی ہمیشہ خاموش قاری رہی ہوں مگر اب دل بغاوت پر آمادہ ہے کہ مجھے بھی سچی کہانیوں کا حصہ بننا ہے اور یوں برسوں کی خاموشی کو توڑ کر قلم اٹھایا سچی کہانیوں کے بارے میں کیا کہوں اس سے مجھے کیا کچھ سیکھنے کو ملا قدم قدم پر رہنمائی کی کبھی دوست کی طرح تو کبھی استاد کی طرح اس کی خصوصیات کہ تحریر میں جس معاشرے کے پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے وہ قابل تعریف ہے اگر کہا جائے کہ اس کی ہر تحریر دل پر نقش ہو جاتی ہے تو ... اب تبصرے کی طرف۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ابھی پورا نہیں پڑھ سکی۔ کچھ چند کہانیاں پڑھی ... اپنی ایک تحریر بھیج رہی ہوں۔ پلیز ضرور بتایئے گا کہ وہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ میں نے بہت امید سے آپ کو خط لکھا ہے کیوں کہ آپ کسی کو مایوس نہیں کرتے اور اپنی ایک نظم بھی بھیج رہی ہوں۔ جواب ضرور دیجئے گا یہ میرا خط نومبر کے احوال میں ضرور لگائیں۔ اللہ نگہبان۔

☆ خوش آمدید فرح آپ کی آمد یقیناً احوال میں خوش آئند ہے۔ کہانی تمہاری پڑھنے کے بعد ہی فیصلہ کریں گے اور اپنے جواب سے جلد آگاہ کریں گے۔

✉ تسلیم کوثر لاہور سے شامِ احوال ہیں۔ جناب محترم کاشی چوہان صاحب، اسلام وعلیکم میری طرف سے ماہانہ سچی کہانیاں کی ٹیم اور قارئین کو سلام، ماہنامہ سچی کہانیاں ایک معیاری ڈائجسٹ ہے اور عمدہ قلم کاروں کی تحریروں کی وجہ سے اس کا معیار دیگر ڈائجسٹوں سے اونچا ہے میری دعا ہے کہ اللہ پاک ماہنامہ سچی کہانیاں کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دیں اور ماہنامہ سچی کہانیاں سے جڑے ہر فرد کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

☆ تسلیم خوش رہو بہت خوشی ہوئی تمہارا خط پڑھ کر اللہ تمہاری دعا قبول فرمائے (آمین)

☒ امام بخش ابڑو کوئٹہ سے شامل احوال ہیں قابل احترام کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم بعد عرض ہے کہ ماہ اکتوبر کا تازہ شمارہ سچی کہانیاں میرے ہاتھوں میں ہے۔ سچی کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں خوب صورت کہانیاں اور بہترین سلسلے خاص کر کے شاعری والے چند صفحے کی تو بات ہی کچھ اور ہے انکل سلیم اختر کی کہانیاں بہترین اور معاشرے کی عکاس ہوتی ہیں۔ کاشی چوہان صاحب سچی کہانیاں کے لیے یہ میرا پہلا خط ہے، پرچہ پڑھتے ہوئے تو دو سال ہوا ہے مگر لکھنے کی کبھی نہ جسارت کی کیوں کہ ڈیوٹی از ڈیوٹی میں پوری طرح سے تبصرہ نہ کر سکا۔

☆ ''خوش آمدید'' امام بخش آپ کی آمد سچی کہانیاں کے لیے خوش آئند ہے اور آئندہ بھی سلسلے احوال سے جڑے رہیے گا، شکریہ۔

☒ سدرہ انور علی جھنگ سے شامل احوال ہیں مائی ڈیئر عزیز از جان آپی، مینا تاج آپی ڈیئر ایڈیٹرز، رائٹرز اینڈ آل اسٹاف اسلام وعلیکم! اسی امید کے ساتھ حاضر محفل ہوں کہ تمام پڑھنے والے انشاء اللہ سلامت ہونگے مینا تاج آپی سچی کہانیاں کی ایڈیٹر بننے پر مبارک باد ہو۔ اوائل سردیوں کا پہلا شمارہ ملا، منزہ آنٹی کا، اداریہ، بچپن بہت اچھا سبق دیا۔ احوال میں سبھی خطوط شاندار تھے۔ شائستہ جمال جی، مسز نوید ہاشمی ملکہ احوال تحسین مصطفی شکور السلام وعلیکم، احوال میں غیر حاضری کی وجہ؟ ذرا مزہ نہیں آیا تم سے۔ کنول جی ڈیئر میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟ شاعری پسند کرنے کا شکریہ۔ انکل سلیم اختر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بہت مبارک۔ محمد سلیم اختر کی، خواہشوں کے سراب، بابل کی پری تجمل متیلو کی، شعبان کھوسہ کی، مرد مجاہد، پسند آئی۔ بابر نایاب کی، بہاریں روٹھ نہ جائیں، نسیم صدف سکینہ کی، کیوں نہ اعتبار کیا۔ رفعت محمود کی یہی دنیا ہے، شاہانہ خان کی اعتراف اچھی کہانی تھی۔ رانا محمد شاہد کی، صلہ ویلڈن بھیا۔ محمد شعیب کی زندگی ٹھہر ذرا، ام مناہل کی ہمت کرے انسان تو، شازیہ جاوید کی بے وفا کون؟ محمد اسد علی کی، محمد خان، جاوید راہی کی بے ثبات ہے زندگی عابد علی سحر کی ایک گناہ اور...... بہت اچھی لگی اور سبق آموز تحریریں لگیں ممتاز احمد کی رستے زخم، ایم ارشد وفا کی، چشم آزار، ایم اے راحت کی ہم شکل دوسری قسط پڑھی مگر اعجاز احمد کی ناگن بہت لاجواب ہے تین مرد تین کہانیاں کا سلسلہ شاندار کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ امجد جاوید کی، فیض عشق، بخن آباد میں شائستہ جمال، ایم اشفاق بٹ، مور شاہد حسین، لبنیٰ، ظفر اللہ، اسلم راہی نے بہت خوب لکھا باقی سب نے بھی اچھا لکھا۔ عبدالعزیز انکل، سلیم اختر انکل، اشفاق شاہین انکل، رانا محمد شاہد خلیل جبار، منشی محمد عزیز بھیا مقصود احمد، محمد اسماعیل بروہی رابیل خان محفوظ کان ارحت جمال زرینہ جونیجو شائستہ جونیجو تحسین جونیجو شگفتہ شفیق آنٹی مجید احمد بھیا، صفیہ سلطانہ مغل آنٹی کو السلام وعلیکم اب تک کے لیے اتنا ہی ملتے ہیں اگلے ماہ تب تک کے لیے اپنا بہت خیال رکھیے گا اللہ نگہبان۔

☆ خوش رہو سدرہ تفصیلی خط شامل احوال ہے مبارک باد کا بے حد شکریہ امید ہے کہ ہمارا اور آپ کا خوب صورت ساتھ احوال کو مزید حسن سے نوازے گا۔

☒ ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ سے شامل احوال ہیں نومبر 2014 کا سچی کہانیاں 27 اکتوبر کو ملا۔ سچی کہانیاں کے بانی سہام مرزا سچی کہانیاں کی لائبریری سجائے نظر آئے جو کہ ہر دفعہ نظر آتے ہیں منزہ سہام کا بچپن پڑھا جو کہ ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھا تھا انہوں نے بچپن میں جو کچھ سمجھنا چاہا اس کی ہم کو سمجھ آگئی تھی کاشی چوہان نے کچھ اپنی باتیں میں بہت کچھ کہا اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مینا تاج صاحبہ کو ہم سچی کہانیاں کی

ایڈیٹر بننے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں۔احوال میں جن دوستوں نے میری کہانی 'اب میرا انتظار' کو پسند کیا ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔کہانیوں میں محمد سلیم اختر کی پہلی سچ بیانی خواہشوں کے سراب اٹل ہے کہ عورت ذات سب کچھ برداشت کر لیتی ہے لیکن اپنے خاوند اور محبوب کی محبت میں کسی دوسری عورت کا وجود برداشت نہیں کرے گی۔'نجبن متیاو' بابل کی پری'، شعبان کھوسہ' مرد مجاہد'، بابر نایاب کی 'بہاریں روٹھ نہ جائیں'، نسیم سکینہ صدف کی 'کیوں اعتبار نہ کیا' شاہانہ خان کی اعتراف ان لڑکیوں کے نام ایک پیغام ہے جو ڈائجسٹوں سے نمبر لے کر دوستی کرتی ہیں اور بعد میں پچھتاتی ہیں۔رانا محمد شاہد کی صلہ، محمد شعیب کی 'زندگی ٹھہر ذرا'، اُم مناہل کی 'ہمت کرے انساں تو'، شازیہ جاوید شیازی کی 'بے وفا کون'، محمد اسد علی بھٹی کی زندہ کہانی، محمد خان، محمد خان کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر تھی محمد خان جیسے لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔جاوید راہی کی 'بے ثبات ہے زندگی' میں رخسانہ کے لالچ نے اسے اس کے انجام تک پہنچا دیا۔ سچی کہانیاں کے زبردست رائٹر ممتاز احمد کا شعلہ، رستے زخم، تین مرد تین کہانیاں میں مومنہ بتول کی کہانی منزل عشق کے راہی، سید مبارک علی شمسی کی 'جفا کیسی'، فوزیہ فرہاد احمد کی 'جیسے کو تیسا' اچھی تحریریں تھیں۔سخن آباد کی محفل بھی ہوئی تھی عنبرین انجم، شاہد رفیق سہو، مور شاہد حسین، لبنیٰ، شائستہ جمال، ایم حسن نظامی، نصرت سرفراز، ملک عاشق، حسین ساجد، ثانیہ ثانی، ان سب نے سخن آباد کی محفل کو چار چاند لگا دیئے۔

☆ سدا خوش رہیے اشفاق بٹ، دعا اور مبارکباد کا شکریہ آپ کا مشورہ بے حد پسند آیا انشاءاللہ آپ اس میں مثبت تبدیلیاں دیکھیں گے۔

⊠ شاد چندرانی کوئٹہ سے احوال میں شامل ہیں لکھتے ہیں مجھے امید ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوگی! میری دعا ہے کہ اللہ پاک آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔'آمین' دیگر احوال یہ ہے کہ گذشتہ دنوں بلوچستان کے نوجوان ادیب افسانہ نگار ساحل ابڑو کی دعوت پر ڈیرہ اللہ یار میں بلوچستان رائٹرز گروپ کی جانب سے منعقد ہونے والے ادبی پروگرام میں شرکت کا موقعہ ملا اس شاندار ادبی پروگرام کے مہمان خصوصی سندھ کے معروف ادیب محقق و مصنف عتیق الرحمٰن تھے اس کے علاوہ اس پروگرام میں سندھ بلوچستان کے نامور شعراء اکرام اور ادیب شامل تھے۔اس پروگرام کا مقصد لکھاریوں کی حوصلہ افزائی، ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' اور ماہنامہ ''دوشیزہ'' کی ڈیرہ اللہ یار ڈیرہ مراد جمالی صحبت پور اوستا محمد اور گنداف کے لکھاریوں میں تعارف کرانا تھا۔ادیب اس معاشرے کا اہم حصہ ہیں اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں بہترین ادب تخلیق ہو رہا ہے نئے لکھاری اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ادب و فنون کے شعبہ میں بہترین کردار ادا کر رہے ہیں۔تقریب کے آخر میں اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے مہمان خصوصی عتیق الرحمٰن کہا کہ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' اور ماہنامہ ''دوشیزہ'' مرزا اسہام کے خوابوں کی تعبیر تھے۔پروگرام میں منفرد حیثیت کے حامل افسانہ نگار محترم سلیم اختر کا پیغام بھی پڑھا گیا۔ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' اور ماہنامہ ''دوشیزہ'' مرزا اسہام کی محنت کا ثمر ہیں۔انہوں نے کہا کہ میں مرزا اسہام کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں۔خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔پروگرام کے آخر میں مرزا اسہام کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے دعا کی گئی اور دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کی خاطر تواضع بھی کی گئی۔ماہ اکتوبر کی سچی کہانیاں میں شامل تمام کہانیاں اچھی تھیں شاید یہی وجہ ہے کہ ماہنامہ سچی کہانیاں نوجوان لکھاریوں میں الگ پہچان رکھتا ہے۔مگر ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' سے بلوچستان کے لکھاریوں کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر ان کی کہانیوں کو waiting list میں رکھ دیا جاتا ہے جہاں انہیں شائع ہونے

کے لیے سالوں لگ جاتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ان کہانیوں یا افسانوں میں وہ دم نہیں جو ایک اچھے تخلیق کار کی تحریروں میں ہوتا ہے۔ مگر افسوس یہ بھی ہے کہ ہر ماہ ایک ہی رائیٹر کی کہانیوں کو جگہ دی جاتی ہے تو وہاں اگر کسی اور رائیٹر کی کہانی کو جگہ دی جائے تو میرے خیال میں بہتر ہوگا۔ باقی آگے ادارے کی مرضی ہے کہ وہ کہانیوں کو شائع کرے یا پھر ردی ٹوکری میں پھینک دیں کہ یہ کہانی قابل اشاعت نہیں......؟ آخر میں، میں محمد سلیم اختر کے بارے میں یہ کہوں گا کہ ان کا بلوچستان کے تمام ادباء وشعراء اکرام سے ادبی اور مالی تعاون بھی ہوتا ہے۔ اگر تاریخی جھروکوں میں دیکھا جائے تو ''سچی کہانیاں'' کا ادارہ محمد سلیم اختر کا اپنا نہیں اور نہ ہی محمد سلیم اختر اس میں ملازم کی حیثیت سے کام کرتے ہیں مگر یہ ان کی محبت اور خلوص ہے بطور الفاظ محمد سلیم اختر کے کہ ''میں آج جو کچھ بھی ہوں اس ادارے کے تعاون سے ہوں سچی کہانیاں میری پہچان کا سبب ہے۔

☆شاد پندارنی احوال میں حاضری دینے کا شکریہ مگر افسوس کے ساتھ یہ الفاظ ادا کرنے پڑ رہے ہیں کہ اس پرچے نے ہمیشہ بلوچستان کے لکھاریوں کو جگہ دی ہے اگر آپ اس پرچے کے مستقل قاری ہیں تو یہ بات ہرگز ادا نہ کرتے کیا شعبان کھوسہ، سلیم آزاد، عمران قریشی، عمران مظہر، نور محمد، اور شاد پندرانی کا تعلق کوئٹہ سے نہیں ہے؟ اب کیا عرض کروں۔ آپ ہی اپنی اداؤں پر غور کریں ہم نے کچھ عرض کی تو شکایت ہوگی!

☒ زرینہ جونیجو بورڑی شریف سے شامل احوال ہیں محترم کاشی بھیا اسلام وعلیکم سدا آباد رہیے کاشی بھیا اور میڈم منزہ سہام مرزا صاحبہ آپ نے رائیٹرز ایوارڈ سے نوازا ہے اس کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں یہ آپ نے رائیٹرز صاحبان کی حوصلہ افزائی کے لیے بہت اچھا کیا ہے کاشی بھیا کہانیوں پر تبصرے کو کاٹ دیا جاتا ہے یہ بری بات ہے کم سے کم تبصرہ تو رائیٹر کا حق ہے صرف کہانیوں کے نام شامل اشاعت ہوتے ہیں جو کہ ناانصافی ہے مور شاہد حسین بھیا آپ نے پکارا اور ہم چلے آئے سدرہ انور علی کیسی ہیں آپ؟ شعبان کھوسہ بھیا وعلیکم ان احوال خوش رہیے ارم ناز وعلیکم جیجل متیلو کیا حال ہیں بھیا ممتاز احمد، ایم اشفاق بٹ، فیصل ندیم، فریدہ جاوید، عظمیٰ شکور، نورہ فاطمہ آپ تمام کے لیے بہت ساری دعائیں ایک نظم بھیج رہی ہوں امید کرتی ہوں کہ شامل اشاعت کریں گے جو کہانیاں پڑھ سکی ہوں میں ان میں ''بابل کی پری'' جیجل متیلو، ''مرد مجاہد'' شعبان کھوسہ، ''کیوں اعتبار نہ کیا'' نسیم سکینہ صدف، ''اعتراف'' شاہانہ خان، ''اک گناہ اور'' عابد علی سحر، ''بے وفا کون'' شازیہ جاوید شازی کی کہانیاں بیسٹ رہیں ارشد علی ارشد کا ناول ''ملکھنی'' بہت ہی اچھا جا رہا ہے اعجاز احمد نواب کی قسط وار کہانی ناگن بھی بہت اچھی جارہی ہے۔ سلسلہ مسئلہ یہ ہے تو شمارے کی جان ہے اسے میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں شکریہ۔

☆خوش رہو زرینہ اور سدا پرچے سے جڑی رہو تمہاری نظم سخن آباد کی زینت بنا رہی ہوں۔

☒ تحسین جونیجو خیر پور سے شامل احوال ہیں اچھی مینا تاج باجی السلام وعلیکم پھولوں میں لپٹی پر خلوص دعاؤں کے سنگ آپ کو اپنے احوال میں خوش آمدید کہتے ہیں امید کہ یہ سنگ سدا بہار رہے گا انشاءاللہ پیارے کاشی بھیا نے بہت ہی محنت اور اعلیٰ کام کیا ہے اور کرتے رہیں گے بہت خوشی ہوئی کہ رائیٹرز ایوارڈ کا اعزاز کے طور پر حوصلہ افزائی کی گئی جس کے لیے ہم منزہ آپی اور کاشی بھیا کے شکر گزار ہیں شاد رہیے آباد رہیے ہمیں یقین ہے کہ اب مینا باجی بھی سب کے تعاون سے قارئین کا دل جیتیں گی ہمیشہ کی طرح آپ کی آمد باعث مسرت ہے خوش رہیے خوشیاں بانٹتے رہیے اداریہ ''بچپن'' احساسات پہ مبنی خیالات اچھے

رہے" کچھ اپنی باتیں" سدا سے معلوماتی اور سبق آموز رہی ہیں سلامتی ہو اب کچھ باتیں احوال کی اشفاق شاہین بھائی دھرنے میں شمولیت اختیار کرنا ہمیں پسند نہیں خوش رہیے ارم ناز جی وعلیکم السلام آپ کی آمد بھلی لگی خوش رہیے ڈیئر سدرہ انور علی بڑے غصے میں لگ رہی ہو رانی ، ارے وہی پرانی والی تحسین ہوں آپ کا خط تبصرہ ہمیشہ ہی پیارا ہوتا ہے خوش رہو چندا۔ ملک صفدر اعوان انکل آپ کو یاد نہیں میرے دادا ابو اور آپ کے تایا ابو ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے ویسے ایک ہی بات عرض کرتی چلوں کہ گزشتہ ماہ اکتوبر میں آپ کی تحریر" دیر لگی آنے میں" جو شائع ہوئی بالکل وہی کہانی کچھ دن پہلے ہم ٹی وی چینل پر کھیل ڈرامہ " کتنی گرہیں باقی ہیں" میں آن ایئر آ چکی ہے تو آپ کیا کہنا چاہیں گے؟؟؟؟ مور شاہد حسین بھائی آپ کا خلوص ہے جی ضرور کوشش کریں گے آپی زرینہ کو بھی زبردستی لانا پڑتا ہے...... شعبان کھوسہ بھائی ، بڑی مہربانی ، اور" مرد مجاہد" میں آپ نے شہید کو خراج تحسین پیش کیا تحریر کی صورت بہت اعلیٰ رہا سلامت رہیے ۔ تحسین آباد میں (عید کا تحفہ) غزل شائستہ جمال اور جمیل منیلو نے خوب صورت کلام پیش کیا...... اب کی بار جلدی میں ہوں اور شمارہ زیر مطالعہ ہے انشاء اللہ اگلے ماہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوں گی...... (اللہ حافظ)

☆ تحسین سدا خوش رہو جلدی میں لکھو یا تفصیل کے ساتھ بس دعا ہے کہ سدا ہم سے رابطہ بنائے رکھو۔

⊠ صاحب جمالی شامل احوال ہیں عزت ماب کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم کے بعد عرض کے آپ خیریت سے ہوں گے ، کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ " سچی کہانیاں" اور " دوشیزہ" میں اپنی انٹری دوں اس دفعہ 26 اکتوبر 2014 کو ڈیرہ اللہ یار میں چند دوستوں کے سچی کہانیاں اور دوشیزہ کو فعال بنانے کے لیے اور اس کے تعارف کے لیے ایک پروگرام کیا جس میں اس بندہ ناچیز کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی اور اس میں میرے بہت سے دوستوں نے بھی شرکت کی اور مہمان خاص کے فرائض معروف ادیب اور بہترین انسان عتیق الرحمن نے سرانجام دیے آخر میں یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام کوششوں کو کامیاب کرے اور مزید ادب کو فروغ دلانے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

☆ خوش آمدید اور خوش رہیے جمالی صاحب آپ کی ادبی خدمات کے لیے ادارہ ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے۔

⊠ ساحل ابڑو بلوچستان سے شامل احوال ہیں جناب کاشی چوہان صاحب اسلام وعلیکم بعد عرض ہے کہ آج مورخہ 26 اکتوبر بروز اتوار شام 5 بجے الرضا پبلک اسکول میں سچی کہانیاں کی ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا جو بلوچستان کی مشہور ادبی تنظیم (بزگ) کی ادبی تقریب سے سچی کہانیاں دوشیزہ کو فعال بنانے کے لیے تعارفی پروگرام منعقد کیا گیا جس میں مہمان خاص ادیب و مصنف بزرگ ڈاکٹر عتیق الرحمن حیدرآباد سے آئے ہوئے تھے اور بلوچستان سندھ بھر کے تمام شعراء کرام کو بھی دعوت دی گئی تھیں جس میں مقامی ادیب و شخصیت سماجی تنظیموں نے بھی حصہ لیا تھا اجلاس کی کاروائی تلاوت کلام پاک سے ہوئی تلاوت کلام کے بعد حافظ امان اللہ نے نعت رسول مقبول ﷺ کا ہدیہ پیش کیا۔ اجلاس کی صدارت شمس مجبور نے کی اسٹیج کے فرائض راقم الحروف نے سرانجام دیے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عتیق الرحمن نے کہا کہ میں تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور کاشی چوہان ، اقبال زمان سرکولیشن کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے بلوچستان کے شہر ڈیرہ الہ یار کے تمام ادباء و شعراء کو ادب کی خدمت اور ملکی تعمیر و ترقی کے لیے سچی کہانیاں ہم تک پہنچایا جو تمام نوجوان نسل کے لیے ایک ادبی تعمیری سوچ ہے سچی کہانیاں

سہام مرزا کا خواب ہے جو ہم سب کے لیے ادب دوست تھے۔ سلیم اختر سہام مرزہ کا ادبی دوست ہے جو مسلسل لکھتا آ رہا ہے تو یہ تھیں باتیں ڈاکٹر عتیق الرحمٰن کی جو ہمارے لیے اعزاز تھیں اقبال زمان آپ کا ادبی پیغام میں نے بلوچستان کے تمام شہروں میں پہنچا دیا ہے۔ کاشی آپ سب دعا کریں کہ میری بچی کسواء جلد از جلد ٹھیک ہو جائے۔

☆ شکریہ ساحل آپکا خوبصورت خط شامل احوال ہے اللہ تبارک سے دعا ہے کہ آپ کی بیٹی کو صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین)

✉ فریدہ جاوید فری لاہور سے شامل احوال ہیں لکھتی ہیں محترم کاشی چوہان السلام وعلیکم نومبر کا سچی کہانیاں ملا ٹائٹل دلفریب لگا تمام سچی کہانیاں کے رائیٹرز اور قارئین کو دعا اس مرتبہ بھی تمام کہانیاں اے ون لگیں اپنی پیاری دوست نسیم سکینہ کی کہانی کیوں اعتبار نہ کیا بے حد اچھی لگی بابر نایاب کی کہانی بہاریں روٹھ نہ جائیں جیجل متیلو کی سچ بیانی بابل کی پری، سلیم اختر کی کہانی خواہشوں کے سراب نے مجھے متاثر کیا ،اعتراف شاہانہ خان، ہمت کرے انسان تو اُم منا ہل، بے وفا کون شازیہ جاوید، زندگی ٹھہر ذرا سب نے بہت اچھا لکھا مگر جمیل احمد کی کہانی رستے ناسور پڑھ کر بے حد دکھ ہوا کاشی جی ایسی کہانیاں میگزین خاص کر سچی کہانیاں میں شائع نہ کریں بے شک یہ سبق آموز ہیں مگر نوخیز لڑکیاں اور کچے ذہن کے نوجوان ان کو پڑھ کر کیا سبق حاصل کریں گے دیکھیں برا مت منایئے گا آئندہ خیال رکھیے گا سوری ممتاز جی پڑھ کر مجھے عجیب لگا ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں سخن آباد کی سب کی شاعری دل کو بھائی کاشی بھیا آپ نے میری شاعری نہیں لگائی اس مرتبہ غزل بھیج رہی ہوں بیماری کے باوجود آج کل بہت خوش ہوں میری کتاب مجموعہ شاعر محبت یاد رکھوں گی کی رونمائی کی تقریب منعقد الحمرا لاہور میں ہوئی جس کی صدارت ملک کے مشہور شاعر اعتبار ساجد نے کی آفتاب خاں میزبان تھے اس تقریب میں نسیم نیازی، رضوانہ کوثر اور زمر نعیم نے بھی شرکت کی فیصل آباد سے نقی صاحب اور فاروق بزمی صاحب بھی تشریف لائے اور بھی بہت سے شعراء نے شرکت فرمائی۔ سب کو دعا اور سلام ایم اشفاق بٹ صاحب میری نظم کو پسند فرمانے کا بے حد شکریہ۔ رخسانہ جی کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ سے نوازے منزہ کو بے حد پیار۔

☆ خوش رہیے فریدہ آپ کی غزل سخن آباد کی زینت بنا رہی ہوں اب تو خوش۔

✉ عمارہ جمیل بلوچستان سے شامل احوال ہیں جناب کاشی چوہان صاحب اسلام وعلیکم 26 اکتوبر بروز اتوار کو سچی کہانیاں، دوشیزہ کو فعال بنانے کے لیے ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا الرضا پبلک سکول میں جس کے مہمان خاص ادیب و دانشور ڈاکٹر عتیق الرحمٰن حیدرآباد سے آئے ہوئے تھے ہر بینر پر لکھا ہوا تھا محمد سلیم اختر کا پیغام سچی کہانیاں خود بھی پڑھو اور دوسروں کو بھی دعوت دو سلیم اختر کون تھا اس کا اندازہ تو مجھے تب ہوا جب ساحل ابڑو نے تقریب کے اختتام کے بعد ہر فرد کو سچی کہانیاں دوشیزہ گفٹ میں دیا جب گھر جا کر ورق گردانی شروع کی تو سلیم اختر بھی بہترین رائیٹر نمودار ہوئے کاشی چوہان مجھے آپ لوگوں کا یہ انداز بہت اچھا لگا جو آپ نے ہر گھر میں ادبی پیغام پہنچایا اور ہمیں ایک اچھے رسالے سے نوازا جو ہمارے لیے ایک گلدستہ (سچی کہانیاں) باعث مسرت خوشی ہے میں خود تو اسکی قاری بن گئی اور آگے بھی اس کا پیغام پہنچاؤں گی سچی کہانیاں اپنی مثال آپ ہے بہترین کہانیاں اور خوبصورت سلسلے دل کو بھاتے گئے فی الحال تو میں تمام کہانیوں پر تبصرہ نہیں کر سکتی کیوں کہ میری نظر میں یہ رسالہ نیا ہے آگے چل کر میں انشاء اللہ سچی کہانیاں دوشیزہ کی ریگولر قاری بن جاؤں گی۔ آخر میں شکر گزار ہوں نوجوان شاعر ساحل ابڑو کی کہ انہوں

نے مجھے اس تقریب کے قابل سمجھا اور مجھے لکھنے کی دعوت دی تو ساحل بیٹے میں اپنی طرف سے بھرپور کوشش کروں گی لکھنے کی مگر میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس دونوں پرچوں کو پڑھوں گی ضرور زندگی نے ساتھ دیا تو پھر کبھی لوٹ آؤں گی۔ میرے خط میں کافی غلطیاں ہوں گی جسے درست کرنا ضرور کیوں کہ ادبی اور عام زندگی میں دن رات کا فرق ہے۔ والسلام

☆ عمارہ خوش رہیے ''خوش آمدید'' آپ کا خلوص اور محبت سے رچا خط شامل احوال ہے بغیر کسی میل محبت کے آپ باقاعدہ قاری بنی رہیے شکریہ۔

☒ مہر جان بلوچستان سے شامل احوال ہیں قابل احترام جناب کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم امید ہے آپ اور آپ کی پوری ٹیم خیریت سے ہوں گے دیگر احوال اس قدر ہے کے آج 28 اکتوبر کو میں حسب معمول ڈیرہ اللہ یار سے جیکب آباد ایف ایم 98 کو پروگرام کرنے جارہا تھا کہ نئی چوک پر ایک نوجوان لڑکا وین کے اندر گھس کر بیٹھتے ہوئے تمام افراد کو سچی کہانیاں دوشیزہ سے نوازتا گیا تو اس کی یہ ادا دیکھ کر اس کو ایک سو کا نوٹ دینے کی کوشش کی تو اس نے کہا انکل ہمارا ادب اتنا سستا نہیں جو دولت پر بک جائے یہ تحفہ ادارے کی طرف سے ہمیں بخشا گیا ہے تو کاشی چوہان مجھے یقیناً آپ لوگوں کا یہ طریقہ بہت ہی اچھا لگا اور میں نے ایک گھنٹہ پروگرام سچی کہانیاں کے نام کر دیا جس کی محبت اور خلوص کی بدولت بہترین رسالہ ہے جس میں تمام لوگ قسط وار کہانیاں اور شاعری سے لطف اندوز ہورہے ہیں میں نے اس سے ادارے کا شکریہ ادا کیا ورنہ اس نفسانفسی کے دور میں کہاں کوئی اتنا خیال کرتا ہے ہاں اب میں ہر مہینے اس پرچے کا مطالعہ ضرور کروں گا کیوں کہ اس میں ایم اے راحت اور سلیم اختر کی کہانیاں شائع ہوں اور ہم نہ پڑھیں تو ہمارے لیے یہ ایک ناممکن بات ہے۔ والسلام

☆ ''خوش آمدید'' مہر آپ کا خوبصورت لفظوں سے سجا خط شامل احوال ہے قاری بننے کے ساتھ ساتھ آپ احوال سے جڑے رہیں تو دلی مسرت ہوگی۔ شکریہ

☒ محمد عمر لکھتے ہیں محترم کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم بعد عرض خیریت حال اس طرح ہے کہ آج ساحل ابڑو نے ڈیرہ اللہ یار سے کافی تعداد میں سچی کہانیاں اور دوشیزہ ڈائجسٹ بھیجے اور جناب اقبال زمان صاحب پیغام بصورت سچی کہانیاں۔ دوشیزہ ڈائجسٹ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور یہ پیغام ہم اپنے دوستوں تک بھی پہنچا رہے ہیں امید ہے سچی کہانیاں کے ادارے کا تعاون اسی طرح جاری رہے گا۔

☆ شکریہ عمر آپ کا خط شامل احوال ہے۔

☒ نیر رضا وی کراچی سے شامل احوال ہیں محترمہ مینا تاج صاحبہ السلام وعلیکم امید ہے کہ آپ سچی کہانیاں سے وابستہ تمام لوگ خیریت سے ہوں گے اور دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ہم سب کو حفظ وامان میں رکھے (آمین) نومبر کا شمارہ بلکہ یوں کہوں گا نومبر کا خوبصورت شمارہ پڑھنے کا موقعہ ملا خوبصورت تحریروں سے مزین سچی کہانیاں بہت پسند آیا خاص طور پر محمد خان ''بے اثبات ہے زندگی'' ''رستے زخم'' اور ایم اے راحت صاحب کا ہم شکل خوب جارہا ہے اک گناہ اور بھی اچھی تحریر تھی۔ میرے لیے تو اتنا ہی بہت ہے کہ پرچے میں میری بھی تحریر شائع ہوئی ہے اور (انشاء اللہ) آئندہ بھی میری تحریروں کو جگہ ملتی رہے گی ایک اور غزل ارسال کررہا ہوں امید ہے لائق اشاعت ہوگی اور جلد شائع ہوجائے گی۔

☆ نیر احوال میں حاضری اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

☒ علی دوست بلوچستان سے شامل احوال ہیں عرض یہ کہ میں پیشہ کے لحاظ سے بطور صحافت پی ٹی وی

نیوز ڈسٹرکٹ رپورٹر محبت پور میں انجام دے رہا ہوں 26 اکتوبر بروز شام ۴ بجے الرضا پبلک سکول میں سچی کہانیاں اور دوشیزہ کا تعارفی پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس میں مہمان خالص ادیب ڈاکٹر عتیق الرحمٰن تھے اس تعارفی پروگرام میں بلوچستان سے مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے بھرپور شرکت کی محفل میں کچھ لکھاری ساتھیوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا میرے خیال میں آپ کی شفقت ہمارے روبرو ہے ہمارے کاشی صاحب تمہاری محنت کی وجہ سے آج یہاں تقریب سجی ہوئی ہے سچی کہانیاں سامنے سے پڑھ کر ایک مرتبہ پھر سارے منظر سامنے آگئے تقریب اچھی رہی تھی اور لحہ بہ لحہ اپنا ہی لطف تھا محفل ہمیشہ کی طرح اپنوں سے سجی تھی دیکھ کر دل بہت خوش ہوا تو آپ کے قلم سے۔ تقریب میں قابل قدر مہمان گرامی تھے آپ کی محفل میں آمد سے ہمیں بہت خوشی ملی اب یہ ساتھ چھوٹنا نہیں چاہیے دنیا میں اپنوں کے علاوہ بھی بہت سے رشتے ہوتے ہیں جو ہمیں زندگی دیتے ہیں خدا آپ کو خوشیوں سے نوازے آمین کاشی صاحب سچی کہانیاں پڑھ کر ایک نام مجھے یاد آ گیا کیوں نہ میں کچھ ان کا ذکر کردں سلیم اختر راولپنڈی سے جو تحریر لکھتے ہیں میری دعا ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے اہل وعیال سمیت خوش رہیں۔ جن رائیٹرز نے ایوارڈ حاصل کیے انہیں بہت مبارک باد آپ سب اپنا بہت خیال رکھیں اجازت چاہوں گی فی امان اللہ۔

☆ شکریہ علی پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

☒ ملک صفدر جہانیاں سے شامل احوال ہیں جناب ایڈیٹر مینا تاج صاحبہ آداب! اس بار سچی کہانیاں جلد ہمارے ہاتھوں میں آن موجود تھا، منزہ سہام بچپن کے عنوان پر بہت اچھا بول رہی تھیں احوال کی جناب کیا بات ہے ہمیں تو سب احوالی دوست جیسے محسوس ہوتے ہیں اور باقی بھی سب احوالی جن کی کمی وقت کی وجہ سے نام نہیں لکھ سکا محترمہ میڈم تحسین جونیجو صاحبہ آپ کو ہم نے مستقل رکنیت کا ٹائیٹل اس لیے نہیں دیا تھا کہ آپ احوال میں آنا ہی چھوڑ دیں ہمیں یقین ہے کہ آپ عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں مصلے ہوتا ہے یا مطالعہ تسکین احوال میں مستقل رکنیت کے لیے اپنی شرکت کو یقینی بنائیں ہاہاہاہا۔ آخر میں اس خوب صورت محفل سے اجازت چاہتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ رہو تو پھولوں کی طرح بکھرو تو خوشبو جیسے امید کرتا ہوں۔

☆ خوش رہے صفدر آپ کا خط شامل احوال کر دیا، خوش رہ۔

☒ مسز نوید ہاشمی شامل احوال ہیں دوستوں اور ساتھیو اسلام وعلیکم خدا کی ذات سے امید کرتی ہوں کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے رخسانہ سہام مرزا کے لیے دعا گو ہوں خدا انہیں صحت عطا فرمائے آمین۔ اکتوبر احوال میں شاہین، ایم اشفاق بٹ شعبان کھوسہ ممتاز احمد کا خط پسند آیا مور شاہد حسین کی بہن اور والد کے لیے دعا گو ہوں خدا انہیں صحت عطا فرمائے آمین اکتوبر احوال میں عبدالعزیز کا شعر پسند آیا سدرہ انور علی وعلیکم واسلام امید کرتی ہوں خوش ہو گی یونہی ہنستی مسکراتی رہو پیر نوید شاہ ہاشمی بھائی آپ پیر ہیں ذرا آنکھوں سے چشمہ اتار کر دیکھیے شاہ اور مسز کا فرق واضح نظر آ جائے گا میرا نام مسز نوید ہاشمی ہے نا میں پیر ہوں نا میں شاہ او کے۔ اکتوبر میں ایم اشفاق بٹ کی کہانی پسند آئی عظمیٰ شکور کی کہانی پڑھ کر کچھ زخم تازہ ہو گئے جب کوئی اپنا جاتا ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ عمران مظہر، کرن نوزین، نازیہ بتول رضا، گڈی آپا کی تحریر اچھی تھی ملک صفدر اعوان صاحب تحریر بھی شاندار تھی ہمشکل ایم اے راحت کی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ جاوید راہی کی کہانی بہت خوفناک تھی نیفل ندیم بھٹی، عادل حسین، روبینہ شاہین، منشی محمد عزیز میمن، ازابیل آئینہ کی کہانی پسند آئی۔ ناگن اعجاز احمد نواب کی بہت ہی شاندار جا رہی ہے احوال میں نصرت سرفراز کا

خط کا جواب کاشی چوہان نے دیا بڑانٹ کھٹ شرارتی پسند آیا اشفاق شاہین، شعبان کھوسہ، ظفر علی، ممتاز احمد، حسین تابش کے جواب بھی اکتوبر میں کاشی چوہان نے دیئے دل کو چبھ گئے ۔ اکتوبر سخن آباد میں ثمیلہ لطیف، فریدہ خانم، فصیحہ آصف خان ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کی شاعری پسند آئی۔ کاشی بھیا ایک شکایت یا تکلیف بتاتی ہوں سچی کہانیاں مجھے 27 یا 28 کو مل ہی جاتا ہے مگر دوشیزہ 6 یا 7 کو ملتا تھا میں کراچی میں ہی رہتی ہو آپ کا دفتر بھی کراچی میں ہے ۔ اب اجازت دو بہت زیادہ وقت لے لیا آپ کی بہن باجی۔

☆ مسز نوید ہاشمی سدا خوش رہئیے آباد رہیے آپ کے گلے شکوے شعبہ سرکولیشن کے گوش گزار کر دیئے ہیں امید دلاتی ہوں آئندہ آپکو شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا۔

☒ مقصود احمد میاں چنوں سے شامل احوال ہیں السلام وعلیکم پیاری مینا تاج صاحبہ سدا خوش رہو میرے خیال کے مطابق دسمبر کا پرچہ آپ کی زیر نگرانی پہلا پرچہ ہی ہوگا ہم آپ سے امید کرتے ہیں کے جس طرح کاشی چوہان صاحب نے ایک بہت ہی اچھے طریقے سے سچی کہانیاں کو چلایا ہے آپ بھی اس طرح سچی کہانیوں کا معیار برقرار رکھیں گی میں کاشی چوہان صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے سچی کہانیاں کا معیار بہت ہی بلند کیا اللہ پاک کاشی بھیا کو خوش رکھے اس کے بعد میرے جن بہن بھائیوں نے میری اسٹوری ''کشف'' کو پسند کیا میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں میرے ان بہن بھائیوں میں سب سے پہلے فریدہ عالم کراچی سے، اشفاق شاہین کراچی سے، محمد اسماعیل بروہی نواب شاہ سے، ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ سے، مسز نوید ہاشمی کراچی سے، عظمی شکور سرگودھا سے، میرے فیصل بھائی ندیم بھٹی سرگودھا سے، ایم جے قریشی ڈی آئی خان سے، غلام رسول جیکب آباد سے، میں ان تمام بہن بھائیوں کا شکر گزار ہوں اس کے بعد کچھ میرے بہن بھائیوں نے مجھے سچی کہانیاں میں ''خوش آمدید'' کہا ہے میں ان کا بھی شکر گزار ہوں جن میں میرے بھائی مور شاہد حسین، ایم ارشد وفا، ممتاز احمد سرگودھا سے، بہت ہی پیاری آپی فریدہ جاوید فری شائستہ جمال شاہ فیصل کالونی سے، بہن جی نے لکھا تھا کہ کیا آجکل ایسی محبت بھی ہوتی ہے سسٹر آپ ہی بتادیں کہ کس طرح محبت کی جاتی ہے ہوسکتا ہے جو میں نے محبت کے بارے میں لکھا تھا وہ غلط ہی ہو یا پھر آپ کے ہاں محبت کرنے کا طریقہ ہی مختلف ہو اس کے بعد محمد یوسف لغاری میرے اس بھائی کو میری اسٹوری کشف بالکل بھی پسند نہیں آئی یوسف بھائی بہت بہت شکریہ آپکا وہ اس لیے کہ میری اسٹوری پسند نہ ہی سہی آپ نے ہمیں اس قابل تو سمجھا نہ کہ میری اسٹوری کو کم از کم Read تو کیا آپ نے بہت شکریہ سدرہ انور علی سسٹر جی آپ سے ایک بات پوچھی تھی آپ نے جواب نہیں دیا یا پھر جواب دینا گوارہ نہیں کرتی ہو میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ کیا آپ (حاجی انور سنگ) کی بیٹی ہیں شاہد رفیق سہو، ایم ارشد وفا، ہیں ان اپنے دونوں بھائیوں کو سچی کہانیاں میں خوش آمدید کہتا ہوں سچی کہانیاں Nov-2014 میں جن بہن بھائیوں کو ایوارڈ ملا ہے میری طرف سے ان کو بہت بہت مبارک ہو اور اس کے ساتھ سچی کہانیاں مطلب ادارے کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے رائیٹرز حضرات کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کو بیسٹ اسٹوری پر ایوارڈ دیئے ایم اشفاق بٹ، ریاض حسین شاہ، عبدالغفار عابد، سدرہ انور علی، عادل حسین، رضوانہ کوثر، نگہت غفار، جویریہ سلیم، مسز نوید ہاشمی، منشی محمد عزیز مئے، شاہانہ خان اور اسپیشل ایوارڈ میں محمد سلیم اختر صاحب کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں سچی کہانیاں بہت ہی خوبصورت رسالہ ہے کیوں کہ جو بھی ادارہ رائیٹر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے ایک شاعر افسانہ نگار، گلوکار، بس ان کو تو داد اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے جب کوئی کسی افسانہ

نگار کے افسانے کی تعریف ہی کر دے تو اس افسانہ نگار کا لکھنے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے آخر میں تمام دوستوں سے معذرت کرتا ہوں اگر کسی کی دل شکنی ہوئی ہو تو اگر زندگی نے وفا کی تو پھر ملیں گے خدا حافظ۔

☆وعلیکم السلام مقصود صاحب مبارکباد کا شکریہ آپ لوگوں کی دعائیں اور تعاون رہا تو پرچے کا معیار انشاء اللہ ضرور بلند ہو گا ویسے خوش ہو جائیں سخن آباد میں آپ کی غزل لگا رہی ہوں۔

✉ علی حسین تابش چشتیاں سے شامل احوال ہیں کاشی بھیا امید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے آپ کو تمام قارئین اور احوالیوں کو میرا اسلام قبول ہو کاشی بھیا یہ کیا بات ہوئی کہ ہم نے آپ کی محفل جوائن کی اور آپ محفل ہی چھوڑ چلے؟ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی بھائی جان! مجھے آپ کا یہ فیصلہ منظور نہیں ہے مجھے تو احوال کی محفل میں آپ کی ہی صدارت چاہیے آپ نے ہی ہم سب احوالیوں کو ایک ساتھ جوڑ رکھا ہے یہ آپ کا اخلاق ہی تو ہے جو ہم سب کو خط لکھنے اور سچی کہانیاں میں شرکت کرنے کا حوصلہ دیتا ہے اور مجبور کرتا ہے آپ کی باتوں میں کچھ کشش ہی ایسی ہے پلیز آپ واپس آ جاؤ احوال کی محفل آپ کے بنا نہیں سجے گی یا پھر ہم احوال میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیں گے جب آپ اس محفل میں نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں خیر تحریر لمبی نہ ہو جائے آتے ہیں پرچے کی طرف نومبر 2014 کا سچی کہانیاں 27 اکتوبر کو ہی مل گیا تھا منزہ جی کا اداریہ بچپن بہت ہی اچھا لگا پھر آپ کی باتیں تو دل کو چھو لیتی ہیں احوال میں سب سے پہلے میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے مجھے ویلکم کہا سدرہ جی بہت شکریہ مور شاہد حسین کا بہت شکریہ منشی محمد عزیز صاحب آپ کا بھی شکریہ احوال میں سب کے خطوط اچھے تھے اشفاق بٹ صاحب شکریہ آپ نے میری غزل کو پسند کیا سلیم اختر صاحب کی ”خواہشوں کے سراب“ میرے بہت ہی پیارے بھائی رفعت محمود صاحب کی ”یہی دنیا ہے“ بھائی جان کہانی بہت اچھی تھی آپ کو کال کی تھی مگر آپ کا نمبر off تھا بابل کی پری ”فرام جیجل متیلو“ ”محمد خان“ فرام محمد اسد علی بھٹی اور میرے ہی شہر سے عابد علی سحر کی ”اک گناہ اور“ بے حد پسند آئی سچ میں بہت اچھا لکھا تھا کاشی بھیا شکریہ آپ نے میری غزل شامل کی جب کہ شاعری ایک سے بڑھ کر ایک تھی نصرت سرفراز، اشفاق بٹ، جیجل متیلو، میرے بہت ہی محترم دوست ملک عاشق حسین ساجد صاحب آپ کی غزل تو قیامت تھی سب کی غزلیں اچھی تھیں امجد علی آپ کی غزل بھی سوری نظم اچھی ہے اور رہی بات شاہد رفیق صاحب کی آپ کی تو بات ہی کیا ہے راحت فتح علی خان کی گائی ہوئی غزل شائع کروائی ہے اپنے نام سے اور پھر اس میں بھی بے شمار غلطیاں اور دو شعر کھا گئے کیا؟ بھوک لگی تھی؟ یار ایسا مت کیا کرو تم اگر سخن آباد میں حصہ لینا چاہتے ہو تو اپنی ذاتی شاعری لے کر حاضری دو یوں کسی کے کلام کو اپنے نام سے شائع کروانا اچھی بات تو نہیں ہے اور آپ کو بتا تا چلوں اس غزل سے کون واقف نہیں ہے؟ ”یوٹیوب“ پر تقریباً 70 لاکھ افراد اسے دیکھ چکے ہیں اور Likers کی تو گنتی ہی نہیں ہے خط بہت لمبا ہو رہا ہے کاشی بھیا بس اس بار اتنا لمبا ہوا ہے آگے سے نہیں ہو گا پلیز شائع کر دینا اور ہاں پلیز واپس محفل میں لوٹ آؤ ورنہ ہم تو آپ سے روٹھ جائیں گے آخر میں سب کو سلام اللہ نگہبان۔

☆علی تابش خوش رہو کاشی جی ہمارے ساتھ ہی ہیں آپ انہیں باقاعدہ خط لکھ سکتے ہیں پر کچھ خلوص تو ہمارے حصے میں بھی آنا چاہیے نا۔

✉ عظمیٰ شکور سرگودھا سے شامل احوال ہیں ایڈیٹر صاحب آداب! اُف یہ سردی کے مزے مزے کے دن اور ”سچی کہانیاں“ کی آمد مزہ آ گیا اب مونگ پھلیاں کھائیں کہ رسالہ پڑھیں بتائیں ذرا۔ منزہ کی حسین حسین باتیں پڑھنے کے بعد، کاشی چوہان کی لکھی مختصر مگر پر اثر کہانی پڑھی ”محبت“ جی ٹھیک کہا ہے

بہت کم لوگ اس جذبے سے آشنا ہوتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں انہیں صرف بد نصیب ہی کہا جاتا ہے جو محبت کو پا کر بھی نہیں پاتے اور لاعلمی ہی میں تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ ''بابل کی پری'' بجیل متیاؤ اُف ہیں، ہیں ماریں گئیں کیا ہم کمزور دل لوگوں کو......؟ ''بابر نایاب'' صاحب ''بہاریں روٹھ نہ جائیں'' پھر سے حاضر ہوئے بہت شکریہ سمجھانے کا کہ زندگی میں اگر دکھ ہیں تو خوشیاں بھی ساتھ ہیں۔ ''مرد مجاہد'' شعبان کھوسہ صاحب ہمیں فخر ہے۔ ''کیوں اعتبار نہ کیا'' ''نسیم سکینہ صدف'' قسم سے دکھ ہوا۔ ''صلہ'' ''رانا محمد سلیم'' سچ بتائیں کیا امانت داری کا بدلہ اتنی جلدی مل جاتا ہے اور وہ بھی اس دور میں؟ بھئی زبردست اچھا لگا پڑھ کر۔ ''زندگی ٹھہر ذرا'' محمد شعیب بہت بہت شکریہ کہ اقراء کو کچھ نہیں ہوا ورنہ میں بہت دکھی ہو جاتی۔ اُم مناہل، کمال کرتی ہیں، جی ہمت کی داستان رقم کر دی واہ جی واہ مزہ آ گیا پڑھ کر۔ ''ممتاز احمد صاحب'' کی لکھی تحریر ''رستے زخم'' پہلے تو دل نا مانا پھر، ماننا پڑا۔ ایڈیٹر صاحب آپ سن کر شاید حیران ہوں کہ 102 بخار میں یہ تبصرہ لکھا ہے اسے بھی محبت کہتے ہیں۔ میں سچی کہانیاں سے محبت کرتی ہوں میری طرف سے سب ساتھیوں کو سلام

☆ عظمیٰ خوش رہو محفل میں خط لکھنے کا اور پرچے سے جڑے رہنے کا شکریہ۔

✉ ریحان آفاق حیدر آباد سے شامل احوال ہیں پیارے کاشی بھیا آداب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور یقیناً بہت مصروف بھی سچی کہانیاں میں ایم اے راحت صاحب کی کہانی ہم شکل بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے جبکہ نواب صاحب کی ناگن تو لاجواب ہے دونوں کہانیوں کو پڑھ کر بڑا مزہ آتا ہے کاشی جی بلاشبہ آپ کی محنت اور توجہ سے سچی کہانیاں مزید بہتری کی جانب گامزن ہے بس ایک آدھ مرتبہ سے ٹائٹل مزیدار نہیں لگ رہے اس بات کی نشاندہی اس لیے کی کہ کیوں کہ ہم سچی کہانیاں کے سچے دوست ہیں اللہ حافظ

☆ شکریہ ریحان آئندہ بھی آپ سچی کہانیاں سے حق دوستی نبھاتے رہیے گا۔

✉ عائشہ نور گجرات سے شامل احوال ہیں السلام وعلیکم میری طرف سے تمام اسٹاف کو اور تمام پڑھنے والوں کو پرخلوص سلام ستمبر کے شمارے میں اپنی غزل دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی مگر کچھ مصروفیات کی وجہ سے مزید شاعری بھیجنے میں تاخیر ہوگئی اور اکتوبر کے شمارے میں ڈاکٹر جمال نے میری غزل کو سراہا اچھا لگا میں نے سچی کہانیاں پرچے کے لیے ایک سچی کہانی لکھی ہے اور کچھ شاعری بھی بھیج رہی ہوں یہ کہانی سو فیصد سچ پر مشتمل ہے اور امید کرتی ہوں اس بار بھی میری حوصلہ افزائی کی جائے گی اب اجازت چاہتی ہوں

☆ عائشہ خوش رہو آپ کی شاعری شامل احوال ہے

✉ رانا محمد شاہد بورے والا سے شامل احوال ہیں نومبر کا شمارہ دلہن بنی ماڈل کے ساتھ ملا ویسے بھی شادیوں کا موسم ہے تو اس مناسبت سے اچھی کاوش تھی منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ بچپن پڑھ کر ایک شعر یاد آ گیا

بچپن کی امیری بھی نہ جانے کہاں چلی گئی
جب پانی میں ہمارے بھی جہاز اڑا کرتے تھے

کاشی چوہان کی باتیں دعوت فکر دے رہی تھیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ محبت اس دنیا کا سب سے بڑا اصول جذبہ ہے شاعر نے خوب کہا ہے

میں ہوں محبت مجھے آتا ہے نفرت کا علاج

تم ہر اک شخص کے سینے میں میرا دل رکھ دو

مینا تاج احوال کی انچارج ہوں گی۔ ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں آپ نے ایوارڈ کا قرض بھی چکا دیا یہ ایوارڈ نئے لکھنے والوں کے لیے حوصلہ افزائی کا سبب بنیں گے مریم شاہ بخاری کے حادثے کا پڑھ کر افسوس ہوا دراصل دو ماہ سے سچی کہانیاں پڑھ نہیں پائے تصاویر کا سلسلہ ختم کر کے اچھا کیا میرے خیال میں افسانے کے ساتھ ہی ٹھیک ہے اگر بہت ضروری ہو تو سب سے اہم لیٹر کے ساتھ تصاویر دے دیں ایک تجویز ہے کہ منورہ نوری خلیق صاحبہ کی تاریخی کہانیوں میں تندرمکرر کے طور پر ایک کا انتخاب دیا کریں میرے خیال میں ان کی تاریخی کہانیاں بہت زبردست انداز بیان کے ساتھ مفید معلومات بھی رکھتی ہیں

انشاء اللہ جلد کہانی بھیجوں گا سچی کہانیاں کے اسٹاف کے لیے بہت سی نیک تمنائیں اور خواہشات کے ساتھ اللہ حافظ

☆ سدا خوش رہیے شاہد مبارکباد کا شکریہ آپ کا خوبصورت اشعار سے سجا خط شامل احوال ہے۔

✉ ممتاز احمد سرگودھا سے شامل احوال ہیں محترمہ منزہ سہام صاحبہ و مدیر ماہنامہ سچی کہانیاں السلام وعلیکم سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور تمام احوالیوں اور قارئین کی خدمت میں پیار اور خلوص سے بھرا آداب دعا ہے کہ اللہ کریم ہم سب پر اپنے فضل و کرم میں اضافہ کرے آمین اس بار شمارہ 128 اکتوبر کو مل گیا اداریہ اور کاشی چوہان کی ''کچھ اپنی باتیں'' کے بعد جب احوال میں پہنچا تو کاشی چوہان نے جو خبر سنائی پڑھ کر گم صم سا ہو گیا ایک عجیب سی کیفیت ہوگئی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہوں کیا لکھوں......؟ کاشی چوہان ایک پیار کرنے والا محبتیں بانٹنے والا، پُرخلوص انسان جو ہمیشہ محبت اور اخلاص کا درس دیتا ہے اب احوال میں خطوط کے جواب نہیں دیا کریں گے اس خبر کو دل نے قبول نہیں کیا کاشی چوہان ایک انتھک محنت، سچی لگن اور اپنی بہترین صلاحیتوں سے سچی کہانیاں کا معیار پہلے کی نسبت بہت بہتر اور اونچا کر دیا ہے خدا کرے سچی کہانیاں کا معیار برقرار رہے سچی کہانیاں میرا پسندیدہ ترین محبوب پرچہ ہے تو بھلا اپنے محبوب سے کیسے جدا ہو سکتا ہوں جس نے مجھے لکھنا سکھایا ہے جو عزت مجھ ناچیز حقیر کو ایوارڈ کے اعلان کی صورت میں دی گئی ہے تو اتنی عزت اور چاہت پانے کے بعد سچی کہانیاں سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا سچی کہانیاں کی محبتوں کا بہت قرض ہے مجھ پر اور جب تک سانس چلتی رہے گی سچی کہانیاں سے ساتھ چلتا رہے گا انشاء اللہ۔ محترمہ مینا تاج صاحبہ نے ایڈیٹر کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں تو مبارکباد کے ساتھ خوش آمدید ویلکم ماہ نومبر کے شمارہ میں ایوارڈ کا اعلان کیا گیا بہت خوشی ہوئی عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کا بہت شکریہ تمام ایوارڈ یافتگان کو دل کی گہرائی سے خلوص، پیار اور چاہت سے بہت بہت مبارک ہو دعا ہے کہ اللہ کریم سب کو عزت، صحت، خوشیاں عطا فرمائے اور سب لکھاریوں کے قلم میں نکھار اور ترقی عطا فرمائے آمین احوال حسب سابق تمام احوالیوں خوبصورت خطوط اور تبصروں سے دمک رہا تھا سب سے پہلے گلبرگ لاہور کی سیدہ اقصیٰ نقوی، گھوکی کے زیب ملک اور سیالکوٹ کی کیتھرین صاحبہ کو احوال میں خوش آمدید ویلکم! پیارے بھائی مور شاہد حسین آپ جیسے پیار کرنے والے مخلص انسان کو بھلا کیسے بھول سکتا ہوں......؟ ہرگز نہیں معذرت کہ پچھلے دو تین ماہ آپ کا اور پیاری بہن سدرہ کا تذکرہ نہ کر سکا بھائی کیسے ہیں آپ......؟ چھوٹی بہنا سدرہ کیسی ہو آپ......؟ سدا خوش رہو پیارے بھائی فیصل ندیم بھٹی اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں آپ کی دعا ہے آپ کی کہانی زبردست تھی بھائی منشی عزیز آپ بھائی بھی ہیں اور دوست بھی میری دلی دعا ہے آپ ہمیشہ مسکراتے رہیں بھائی ظفر آپ کی مبارکباد کا بہت بہت شکریہ۔ بہن ام عادل اس بار احوال سے غائب کیوں ہیں......؟ بہن ثمینہ ناز

بھی غیر حاضر ہیں؟ اب آتا ہوں کہانیوں کی طرف ''خواہشوں کے سراب'' نے دل موہ لیا ''بادل کی پری'' ''بہت عمدہ پیار کا درس دینے والی کہانی تھی ''مرد مجاہد'' میں شہید محمد علی ہوسہ جیسے عظیم انسان کے حالات سے آگاہی حاصل ہوئی ہے اور دل سے ان کے لیے سلام عقیدت نکلا ''بہاریں روٹھ نہ جائیں'' شاندار اور زبردست کہانی تھی ''کیوں اعتبار نہ کیا'' یہی دنیا ہے، صلہ، ہمت کرے انساں تو...... اک گناہ اور چشم آرزو اور دشمن زندہ کیوں رہے اچھی اور بہترین کہانیاں تھیں ماہ اکتوبر چھپنے والی کہانی ''دیر لگی آنے میں'' پہلے بھی کسی اور ڈائجسٹ میں پڑھ چکا ہوں دوستو! آپ کو میری لکھی ہوئی کہانی ''رستے زخم'' کیسی لگی......؟ اپنی قیمتی اور معتبر رائے اور تبصرے سے ضرور نوازیے گا خط بہت طویل ہوگیا ہے تو اب اجازت چاہوں گا۔ اللہ نگہبان

☆ ممتاز احمد خوش رہیے دل برداشتہ نہ ہوں کاشی جی اب بھی ہمارے ساتھ ہیں اور آپ اب بھی ان سے خطوط کے ذریعے رابطے میں رہ سکتے ہیں۔

🖂 ظفر اللہ رند بلوچستان سے شامل احوال ہیں السلام وعلیکم منزہ آنٹی مدیر کاشی چوہان اور دانیال شمسی صاحب تمام اسٹاف اور پڑھنے لکھنے والوں کو سلام قبول ہواس نومبر کے مہینے میں تو سچی کہانیاں نے کمال کر دیا کہ اتنی جلدی بک اسٹال پر آئیگا سچ پوچھو تو یقین نہیں آتا مگر اٹھا کے پڑھنے لگے تو واقعی یہ تو ہر دل عزیز سچی کہانیاں ہے پھر کیا ہم نے جھٹ اور پھٹ سے خرید لیا اور رنج کلر میں دوپٹہ اوڑھی آنکھوں میں کاجل گلابی ہونٹ نگاہوں سے سلام کرتی ہوئی دوشیزہ نے بھرپور انداز سے استقبال کیا مختلف مارکیٹنگ کو چھوڑتے ہوئے ہم بچپن میں ٹھہر گئے منزہ آنٹی نے کیا خوب لکھا بچوں پر۔ ہمارے وطن پہ اللہ کرے ایسے احساس ہمارے حکمرانوں کے پاس بھی ہوں آگے بڑھے تو کچھ اپنی باتیں کاشی بھائی ملے جو دنیا کی عظیم طاقت کا ذکر کر رہا تھا سچ میں محبت اخلاق چیز ہی ایسی ہے ہر شے تک محبت سے رسائی حاصل کر سکتے ہیں دوستو ارے یہ کیا ہم تو احوال میں پہنچ گئے اور ویلکم کہنے لگے مینا تاج کو خوش آمدید ارے ارے یہ کیا دوسرے نمبر پر خط تو اس ناچیز کا ہے مگر نام نہیں مگر ہم اپنے الفاظ پہچان گئے ورنہ پتا ہی نہیں چلتا خط کس غریب کا ہے سو تھینکس کہ خط شامل اور کاشی بھائی جو کہ بالکل اچھا نہیں لگتا تھا لیکن آپ نے اس کو ہٹا کر بہت اچھا کیا عجیب لگتا تھا تصویر کا لگنا کوئی خوشی نہیں ہوتی بہرحال اچھا کیا احوال کو آگے پڑھتے گئے۔ آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ پہ ٹھٹک کے رکنا پڑا ہاں جی رائیٹرز ایوارڈ پہ یہ بہت اچھا سلسلہ ہے ان تمام رائیٹر کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں سنبل، ممتاز احمد، جاوید راہی، محمد سلیم اختر کو اسپیشل ایوارڈ ملنے پر بہت بہت مبارک باد پیش کرتے ہیں احوال میں کافی نئے لوگ آئے ہوئے تھے انہیں خوش آمدید کہتا ہوں مگر کچھ لوگ غیر حاضر بھی تھے سدرہ انور علی آپ کا تعارف تو اس پلیٹ فارم سے ہو چکا ہے تو پلیز! اب آگے کہانیوں کی طرف بڑھے تو بالکل آخر میں جا کے فیض عشق پہ ٹھہر گئے جو کہ من پسند ہے اس کے بعد سنبل کا دشمن زندہ کیوں رہے، ناگن، ہمشکل محمد خان اور اک گناہ اور پڑھنے کو ملے جو کہ بہت ہی زبردست تھے امید ہے باقی تمام کہانیاں بھی ایسے ہی زبردست رہیں گی......اب کاشی بھائی اب تک تو شاعری پہ گزارا ہے انشاء اللہ بہت جلد ہماری کہانی بھی آئے گی آپ نے شاعری دلا کر دل پختہ یقین دلایا اس یقین سے اس بار 4-3 شاعری اور کچھ مراسلہ بھیج رہا ہوں امید ہے کہ معیار پر اتریں گی باقی سخن آباد کی تمام شاعری پسند آئی اپنی شاعری تو اپنی تھی جیسا بھی اچھا لگے گا اور...... ہاں ایک بات پلیز کاشی بھائی آپ کی قینچی سے کوئی اعتراض نہیں مگر تھوڑی مہربانی کریں نا پلیز آپ خود بتائیں کہ کتنی محنت سے لکھتے ہیں اور آپ سے زیادہ اس بات کو کون جان سکتا ہے اب اللہ حافظ زندگی نے ساتھ دیا سانسوں نے مہلت دی اگلے ماہ

پھر انشاءاللہ ہم سب احوال میں ہوں گے خدا حافظ رب راکھا۔

☆ ظفر اللہ خوش رہیے مبارک باد کا شکریہ خوشی ہوئی میرے تصویریں والے فیصلے کو آپ لوگوں نے مثبت لیا امید ہے آئندہ بھی پرچے کے معیار کو آپ لوگ مثبت لیں گے۔

☒ زیب ملک گھوٹکی سے شامل احوال ہیں السلام وعلیکم اس ماہ نومبر کا شمارہ 27 اکتوبر کو ملا سرورق حسینہ بہت ہی شاندار تھی منزہ صاحبہ کا اداریہ ''بچپن'' حساس دلوں پر زلزلہ تھا کچھ اپنی باتیں کاشی بھائی جاتے جاتے تو آپ نے ڈرا دیا ہے کاشی بھائی میری طرف سے آپ کو آپ کی انتھک محنت کو سلام قبول ہو جی......احوال میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی عمران فائق بھائی میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک باد ہو جن دوستوں کا نام رائیٹرز ایوارڈ میں ہے ان کو میری طرف سے دلی مبارک باد اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف اس بار بھی سب کہانیاں بہترین تھیں ''خواہشوں کے سراب'' محمد سلیم اختر کی، مومنہ بتول کی ''منزل عشق'' اور شعبان کھوسہ کی ''مرد مجاہد'' ان سب کہانیوں نے بے حد متاثر کیا بے اثبات ہے زندگی جاوید راہی کی شاندار تھی ''دشمن زندہ کیوں'' سنبل جی کی بھی بہت اچھی لگی ''ہم شکل'' بھی اچھی رہی ''فیض عشق'' بھی اچھی رہی اول وآخر ساری ہی کہانیاں بہترین تھیں سخن آباد میں اس بار اچھی شاعری پڑھنے کو ملی ایم حسن نظامی کی غزل نایاب تھی مور شاہد حسین نے ''عید کا تحفہ'' بھی نہ جانے کیسا دیا......!! بہت ہی اچھی لگی ایسے تحفے قسمت والوں کو ملتے ہیں اور ایسے تحفے دینے والے بھی قسمت سے ملتے ہیں ''شائستہ جمال کی غزل بہت اچھی لگی شائستہ جی کی کوئی کتاب مارکیٹ میں آئی ہے اگر آئی ہے تو کون سی؟ محمد جاوید اسلم کی غزل بھی اچھی تھی ملک عاشق حسین کی غزل بھی شاندار تھی'' ثانیہ ثانی کی نظم بھی اچھی لگی ظفر اللہ رند کی نظم بھی شاندار تھی اول وآخر نومبر کا شمارہ بے حد پسند آیا ایک نظم بھیج رہا ہوں امید ہے حوصلہ افزائی کریں گے'' فی امان اللہ''

☆ خوش رہو زیب اور احوال میں جب تک تمہارا خط آئے گا وعدہ ہے وہ شامل احوال ضرور ہوگا۔

☒ فرح انیس کراچی سے شامل احوال ہیں محترمہ مینا تاج صاحبہ السلام وعلیکم امید کرتی ہوں آپ اور آپ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوں گے اور دعا کرتی ہوں رب کائنات سے کہ وہ آپ کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے (آمین) اس بار شمارہ کافی دیر سے ملا اس لیے سب سے پہلے خط لکھنے بیٹھ گئی کہ اگر لیٹ خط بھیجا تو شائع نہ ہوگا دوسری بار میں بہت امید سے خط لکھ رہی ہوں کہ شاید میری بھی قسمت جاگ جائے اور فرح انیس احوال کی محفل میں شامل ہو جائے دھڑکتے دل سے نومبر کا رسالہ کھولا اور جلدی سے احوال میں چھلانگ لگائی مگر اپنا نام نہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی پھر خود ہی اپنی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہا کیوں کہ مجھ جناب نے خط 30 اکتوبر کو ارسال کیا تھا اب جلدی ارسال کر رہی ہوں خط تاکہ میں بھی احوال کی خوبصورت محفل کا حصہ بن جاؤں پلیز مجھے مایوس نہ کیجئے گا اب تو جلدی بھیج رہی ہوں اور ایک نظم بھی ارسال کر رہی ہوں پلیز ضرور جواب دیجئے گا میری تحریر اور نظم کے بارے میں میں نے 30 اکتوبر کو اپنی ایک تحریر ''لے پالک'' بھیجی تھی اس کا کیا ہوا وہ قابل اشاعت ہے یا ردی کی ٹوکری اسے ہضم کر گئی میرا خط دسمبر میں شائع کر دیجئے گا تاکہ میں بھی اترا کر بتاؤں کہ میں بھی سچی کہانیاں کا حصہ بن گئی ہوں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی کی طلبگار ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ ہمیشہ سب پر اپنا کرم رکھے (آمین) اللہ نگہبان)

☆ سدا خوش رہو فرح پرچے سے واسطہ رہنے کا شکریہ اور ہاں تمہارے اترانے کا سامان بھی ہم نے کر دیا اب خوش۔

جس وجہ سے میری غزلیں شامل نہ کی جاتیں خیر کاشی بھائی آپ جہاں بھی رہیں خوش رہیں کوئی بات نہیں آپ نے مجھے انتظار کی سولی پر بہت لٹکایا ہے اب آئی ہوں احوال کی محفل کی طرف تو اچھے احوالیوں السلام وعلیکم امید کرتی ہوں آپ خوش خرم ہوں گے اور اس حسین محفل کو اور حسین بنانے میں لگے ہونگے آپ سب کے خط بڑے شوق سے پڑھتی ہوں اس حسین محفل میں اچھے اچھے بہن بھائیوں میں آپ کو ایک خواب سنانا چاہتی ہوں جو میں نے ایک ماہ پہلے یعنی اکتوبر کے آغاز ایک رات میں تب دیکھا جب مجھے اکتوبر کا سچی کہانیاں ملا لیکن نہ اس میں میری غزل نہ ملی دل ایک دم مایوس ہوگیا اور اگلے بار کی امید دلا کر سوگیا میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے خبر ملی کہ سچی کہانیاں کے مدیر کاشی چوہان کی سیٹ کسی اور نے سنبھال لی ہے اور میرے خط کا جواب نئے مدیر نے دیا ہے صبح اٹھ کر یہ خواب میں نے اپنے بڑے بھیا کو سنایا جو سچی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور آج یہ خبر سنی تو بڑی حیرت ہوئی کہ خواب کچھ اتنے سچے بھی ہوتے ہیں خیر خط کچھ زیادہ ہی لمبا ہوگیا اب اینڈ کرتے ہیں آخر میں مینا تاج آپی سے گزارش ہے میں اپنی ایک غزل بھیج رہی ہوں اسے شامل کر کے شکریہ کا موقع دیں اور میری پہلی کہانیوں کے بارے میں کچھ جواب دیں اگلے ماہ ایک کہانی بھیج رہی ہوں اگر زندگی رہی تو اور ہاں کاشی بھائی سوری اگر کوئی بات بری لگی ہو تو یا خواب اچھا نا لگا ہو تو بھئی کیا کریں خوابوں پہ اختیار کس کا ہے خدا حافظ

☆سویٹ ارم خوش رہو تمہاری غزل شامل سخن آباد ہے یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔

☒ عمران فائق اٹک سے شامل احوال ہیں محترم المقام جناب صاحبان ادارت! السلام وعلیکم اللہ کرے آپ بخیر الخیر ہوں ماہ نومبر 2014 کا سچی کہانیاں موصول ہوا تمام سلسلے باصرہ نواز ہوئے منزہ سہام اور کاشی چوہان نے احسن طریقے سے مردہ ضمیروں کو جلا بخشنے کی کوشش کی تمام افسانے اور کہانیاں خوب رہیں اس کے بعد ''سخن آباد'' کی شاہراہ پر گامزن ہوئے تو دل کافی اداس ہوگیا کیوں کہ باقی تمام ڈائجسٹوں کی نسبت ''سچی کہانیاں'' میں شاعری کا معیار کافی اونچا تھا اب وہ معیار نظر نہیں آتا نثری مواد اور بے وزن کلام بھی شامل اشاعت ہورہا ہے میری گزارش ہے کہ سخن آباد کی طرف متوجہ ہوں تا کہ ''سچی کہانیاں'' کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹ نہ سکے امید ہے اس جانب توجہ فرمائیں گے آخر میں تمام ان احباب کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے دعاؤں سے نوازا اور میرے کلام کو پسند کیا رب رؤف سدا خوش وخرم رکھے آمین)

☆شکریہ فائق سخن آباد کی جانب نشاندہی کرنے پر مگر ساتھی کیا کہوں سخن آباد کا گوشہ آپ لوگوں سے آباد ہے ہم تو صرف دوستی نبھاتے ہیں اب یہ دوست پر منحصر ہے کہ اس کے معیار کو کتنا اونچا اور کتنا پست کرتے ہیں۔

☒ عمران مظہر بلوچستان سے شامل احوال ہیں ڈیئر کاشی بھیا امید ہے کہ آپ اور رسالے کا تمام اسٹاف خیریت سے ہوگا سب سے پہلے رخسانہ آنٹی کے لیے بہت سی دعائیں کہ اللہ پاک انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے آمین مزید یہ کہ ساحل ابڑو کی طرف سے سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے تعارفی پروگرام کی اطلاع ملی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے میں جانہ سکا بہرحال کامیابی سے اس پروگرام کے انعقاد پر آپ سب کو مبارک باد رسالے کی طرف آتے ہیں مجموعی طور پر مجھے نومبر 2014 کا شمارہ زیادہ متاثر نہ کرسکا لیکن مصنفین کو ایوارڈ دیئے جانا آپ کی ایک مثالی کوشش ہے سرورق عام سا تھا منزہ سہام نے اداریہ ''بچپن'' میں سوئے ہوئے ضمیروں کو جگانے کی بہترین کوشش کی ''کچھ اپنی باتیں'' ہمیشہ کی طرح نصیحت آموز تھا

انسان دوست، صحافی اور بہترین شاعر



"محمود شام"

محمود شام جنہوں نے صحافت کو نئی جدت بخشی۔

محمود شام جن کی شاعری دل کو چھو لیتی ہے۔

بہت جلد **"سفر نامۂ محمود شام"** پہلی بار "سچی کہانیاں" میں نظر قارئین ہوگا۔

دسمبر 2014ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/ کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ____________________

مکمل پتا: ____________________

____

دسمبر 2014ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/ بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: __________ تعداد صفحات: __________

نام: ____________________

مکمل پتا: ____________________

____

فون/ سیل نمبر: ____________________

دسمبر 2014ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/ کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: __________ مصنف: __________

دوم، عنوان: __________ مصنف: __________

سوم، عنوان: __________ مصنف: __________

نام: __________ شہر: __________

احوال تک پہنچے مینا تاج صاحبہ کو بھی خوش آمدید کہتے ہیں کچھ ساتھی ناحق ہمیں ''شہزادہ احوال'' کے منصب سے ہٹانے پر بضد ہیں تمام دوستوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شہزادہ احوال ہم ہی تھے ہم ہی ہیں اور ہم ہی رہیں گے سینئر بلکہ بہت سینئر احوالی اس بات کے گواہ ہیں سو دوستو اب کوئی اور عہدے تلاش کر دیں۔ محمد سلیم اختر کی ''خواہشوں کے سراب'' ممتاز احمد کی ''رستے زخم'' دونوں بلاشبہ اس ماہ کی بہترین کہانیاں تھیں جبکہ عابد علی سحر کی تحریر ''اک گناہ اور'' فلمی انداز کے لیے ہوئی تھی شاہانہ خان کی ''اعتراف'' میں کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی ہے چند ایک کہانیاں رسالے کے معیار سے بالکل ہٹ کر رہیں جن میں شازیہ صاحبہ کی ''بے وفا کون'' ارشد وفا کی ''چشم آرزو'' مبارک شمسی کی ''جفا کیسی'' وغیرہ اس ٹائپ کی لو اسٹوریز ایک مخصوص ڈائجسٹ سے میل کھاتی ہیں سچی کہانیاں کے معیار سے مطابقت نہیں رکھتیں منزل عشق، یہی دنیا ہے، کیوں اعتبار نہ کیا، بہاریں روٹھ نہ جائیں، صلہ، ہمت کرے انسان تو...... بھی اچھی سبق آموز تحریریں تھیں سنبل کی ''دشمن زندہ کیوں'' شاید پہلے بھی انہی صفحات میں پڑھ چکے ہیں آخر میں تمام پڑھنے والوں کو اور رسالے کے تمام اسٹاف کو دعا سلام آپ سب بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔

☆ عمران مظہر شکریہ آپ کا غیر معیاری اور معیاری کہانیوں کی نشاندہی کرنے کا آپ کا خط ان لکھاریوں کی نظر سے گزرے گا جن کی کہانی ہم دوستی اور علاقے کا مان رکھتے شائع کرتے ہیں پھر بھی ہم پر الزام ہے؟؟۔

☒ محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے شامل احوال ہیں بڑی آرزو تھی ملاقات کی پھولوں کی طرح سدا مسکراتے رہو جناب کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم خیر دعافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں چند دن ہوئے شہر جانے کا اتفاق ہوا بک اسٹال پر ماہ اکتوبر کا پرچہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی میں بیان نہیں کرسکتا سرورق اپنی مثال آپ تھا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوئی یہ ایک معیاری پرچہ ہے جو ہمیں مقررہ تاریخ پر آسانی سے مل جاتا ہے احوال کے تحت آپ نے خط شائع کر دیا بہت بہت شکریہ آج کے اس دور میں ایسا کامیاب اور خوبصورت پرچہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے قارئین کی دعاؤں اور آپ کی محنت سے یہ کامیابی ہمکنار ہے آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا ماہ نومبر ''سچی کہانیاں'' سخن آباد میں غزل شائع کر کے آپ نے دوستی کا کا حق ادا کر دیا اس کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں اس خلوص اور محبت کی بنا پر آپ کو پھولوں کا گلدستہ پیش کرتا ہوں مگر آپ ہم سے کافی دور ہیں ویسے بھی آپ ہمارے دل کی دھڑکن میں سمائے رہتے ہیں خیر ہماری بھی مجبوری ہے خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے سچی کہانیاں کی ساری کہانیاں ہر لحاظ سے معاشرے کا جیتا جاگتا ثبوت ہوتی ہیں چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں جب آپ مناسب خیال کریں ''سخن آباد'' میں شائع کر دیں امید ہے آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے بشرط آپ کا ہمارے ساتھ تعاون ہو ماہ نومبر کا پرچہ بھی بہت اچھا تھا بچپن منزہ سہام اور کچھ اپنی باتیں بہت خوب تھیں آپ بہت مخلص اور وفادار دوست لگتے ہیں اس شمارے کی کہانیاں خواہشوں کے سراب، صلہ، منزل عشق، اک گناہ اور، بے وفا کون، فیض عشق، سے بہت متاثر ہوا ان قلمکاروں کو میری جانب سے مبارک باد ہو بڑی مشکل سے وقت ملا اور یہ حقیر سی تحریر آپ کی نظر کر رہا ہوں خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے وقت کی کمی کے باعث اجازت چاہتا ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی نیک تمناؤں کے ساتھ والسلام۔

☆ خوش رہیے محمد اسلم جاوید آپ کا خط شامل احوال ہے آئندہ بھی اپنی قیمتی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

☒ ایلون مسیح سیالکوٹ سے شامل احوال ہیں مکرمی جناب کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم کاشی بھائی

آپ کی نظر ایک شعر۔

کون سنے گا سخن میری کون پڑھے گا کتاب
پی رکھی ہے ہر کسی نے مادہ پرستی کی شراب

کاشی بھائی میرا نام ایلون مسیح ہے مجھے بچپن سے ہی شاعری کا شوق ہے اور کافی نظمیں اور غزلیں بھی لکھ ڈالی ہیں لیکن ابھی تک شائع نہیں ہو ئیں کاشی بھائی مین آپ کو ایک قطعہ بھیج رہا ہوں جو ہر لحاظ سے درست ہے میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ یہ قطعہ ''سچی کہانیاں'' میں چھپے مہربانی فرما کر میری شاعری سچی کہانیاں میں چھاپ دیں تا کہ میں آئندہ اس سے بھی اچھی اچھی شاعری بھیجوں کاشی بھائی صرف پیلے رنگ میں جو لکھا ہے وہ چھاپنا ہے کیوں کہ میں اپنا اصل نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

☆ شکریہ ایلون مسیح آپ کی شاعری انشاء اللہ جنوری کے سخن آباد میں شائع کی جائے گی۔

☒ فیصل ندیم سرگودھا سے شامل احوال ہیں السلام وعلیکم محترمہ منزہ سہام صاحبہ مدیرہ مینا تاج صاحبہ ماہ نومبر کا شمارہ دلکش حسین لڑکی کی مسکراہٹ کے ساتھ موصول ہوا ٹائٹل میں لڑکی کی مسکراہٹ اور خوبصورتی اپنی مثال آپ ہے منزہ سہام مرزا صاحبہ کا اداریہ بچپن پڑھ کر احساس ہوا کہ ہمیں اپنے بچوں کے بچپن کی معصوم خواہشات کو پورا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں، پڑھ کر ان کا محبت کا پیغام زندگی بھر یاد دلاتا رہے گا۔ ممتاز صاحب کو ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور میری پہلی کاوش کو سراہنے کا شکریہ سدرہ جی میں کون ہوں کہانی پر ایوارڈ کی مبارک باد سدرہ جی سب سے پہلے تو کہانی کی پسندیدگی اور دعا دینے کا شکریہ اللہ آپ کو سلامت رکھے آمین عمران فائق مور شاہد کو سلام نئے احوال میں شامل ہونے والے ثمرہ خان، کیتھرین، آمنہ علی شاہ کو احوال میں خوش آمدید اسامہ ندیم اور عادل حسین کو سلام میری کہانی پر تبصرہ کرنے کا شکریہ آپ نے کہانی کو اس قابل سمجھا اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف پہلی کہانی سلیم اختر کی خواہشوں کے سراب انتقام اور پیار سے جڑی ہوئی بہترین کہانی ہے، ہنجبل متیلو کی بابل کی پری، مرد مجاہد شعبان کھوسہ، بابر نایاب کی کہانی بہاریں روٹھ نہ جائیں، نسیم سکینہ صدف کی کیوں اعتبار نہ کیا سے بھی سبق ملتا ہے کہ ہمیں بے اعتباری نہیں کرنا چاہیے۔ رفعت محمود کی یہی دنیا ہے پسند آئی، شاہانہ خان کی کہانی اعتراف اس عظیم انسان کی عظمت کو سلام جس نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا، رانا شاہد کی صلہ، زندگی ٹھہر جا زارا ایک حوصلہ مند لڑکی ہوتی ہے۔ ہمت کرے انسان تو اُم مناہل کی کہانی سے سبق حاصل ہوتا ہے۔ شازیہ جاوید شازی بے وفا کون جب بد قسمتی ڈیرے ڈال لے تو بے وفائی کا مرتکب بندہ ہو جاتا ہے ایم اے راحت کا ہمشکل سلسلہ اچھا جا رہا ہے محمد علی اسد بھٹی کی بھی محمد خان ڈاکو کی کہانی اچھی ہے جاوید راہی کی بے اثبات ہے زندگی میں دولت کی حرص انسان کو اندھا کر دیتی ہے عابد علی سحر کی اک گناہ اور عبرت انگیز کہانی ہے ممتاز احمد کی ''رستے زخم'' ممتاز صاحب آپ کی کہانی پڑھ کر کئی عورتیں اپنی نفس کی بے جا خواہشات کو اپنے پاؤں تلے روند سکتی ہیں بہت سی لڑکیوں کے لیے آپ کی کہانی رہنمائی ہے چشم آزار، ناگن، منزل عشق، جفا کیسی، جیسے کو تیسا، دشمن زندہ کیوں، تجل ٹیمکس بھی قابل تعریف ہے تمام اسٹاف اور قارئین کو سلام انہی الفاظ کے ساتھ اب اجازت چاہتا ہوں اللہ حافظ

☆ شکریہ خوش رہیں فیصل پرچے کی پسندیدگی اور احوال میں آمد کا شکریہ۔

☒ اُم عادل شامل احوال ہیں لکھتی ہیں امید ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم خیریت سے ہوں گے

سب سے پہلے تو یہ بتایئے کے آپ کہاں جارہے ہیں؟ اور کیوں جارہے ہیں؟ ہمارے بہت ہی محترم اور سینئر ساتھی جناب عبدالعزیز جی آصاحب جنہوں نے کھپ کھپ کر آپ کو رائٹرز ایوارڈ پر راغب کیا اور دور دور تک کہیں نظر نہیں آرہا تھا ان کے لیے کسی خصوصی ایوارڈ کا تذکرہ ہو جاتا تو بہتر نہ تھا خیر آپ لوگ مختیار کل ہیں مگر بہت سے سینئر لکھاریوں کے ساتھ ساتھ یہ ان کے ساتھ بھی ناانصافی ہے۔ نومبر کا رسالہ آج ہی ملا ہے ابھی پڑھا نہیں کہانیاں یقیناً بہتر ہی ہوں گی احوال کے سب ہی احوالیوں کو میرا محبت بھرا اسلام قبول ہو اور جو لکھاری رائٹرایوارڈ میں ایوارڈ کے مستحق قرار پائے انہیں ڈھیروں دلی مبارک باد احوال میں اکتوبر کے خط کے میرے جواب میں جناب مور شاہد صاحب نے مجھے ویلکم کہا سر جی بہت شکریہ نوازش جہاں رہیں خوش رہیں پھر میرے پیارے بھائی جناب محترم ممتاز احمد نے اتنی محبت سے بہترین الفاظ سے میری عزت افزائی کی ہے بھیا ممتاز میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کی ممنون مشکور ہوں اور ساتھ ہی شرمندہ بھی کہ پچھلے خط میں آپ کی بہنا کے ذہن سے آپ کو عمرہ کی سعادت نصیب ہونے پر مبارک دینا فراموش ہو گیا تھا بہت بہت معذرت بھیا خدا نے آپ کو اپنے گھر کی زیارت نصیب فرمائی بہت بہت مبارک ہو کاشی بھیا ایک عدد کہانی پیش خدمت ہے انتظار نہ کروایئے گا بلکہ اپنی فائلوں سے ہماری مذید کہانیاں بھی نکالیے شکریہ۔

☆ شکریہ اُم عادل آپ کا مفصل خط شامل احوال ہے۔

✉ شاہد رفیق سہو کبیر والا سے شامل احوال ہیں السلام وعلیکم کاشی بھائی سدا خوش رہو ماہ نومبر کا شمارہ 5 تاریخ کو ملا سب سے پہلے منزہ سہام کی بچپن والی بات بہت پسند آئی اس کے بعد اپنا خط پاکر بہت خوشی ہوئی اور غزل بھی کہانیوں میں کیوں اعتبار نہ کیا نسیم سکینہ بہت پسند آئی اعتراف شاہانہ خان بہت پسند آئی بے وفا کون شازیہ جاوید راہی ان سب کی کہانیوں نے سوچنے پر مجبور کر دیا غزلوں میں عنبرین نعیم کراچی، شائستہ جمال کراچی، ایم حسن نظامی قبولہ شریف، ثانیہ ثانی سیالکوٹ، ان کی غزلیں بہت پسند آئی میری طرف سے ان سب کو مبارکباد اور خط میں مجید احمد جائی سدرہ انور اور رابعہ کنول نویرہ فاطمہ کراچی ویلڈن بہت اچھا لگا آپ کو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی خدا آپ کو بہت ترقی دے آخر میں تمام لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو خلوص دل سے سلام سچی کہانیاں کے لیے دعا گو ہیں۔

☆ خوش رہیے شاہد رفیق پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ آئندہ بھی اپنے رائے سے آگاہ ضرور کیجئے گا۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصہ بننے والے قارئین:

☆ جواد حسین۔ سانگھڑ ☆ شاہد احمد۔ کراچی ☆ نذیر علی۔ نواب شاہ ☆ علی ایم وفا بروہی بہو کھوسہ ☆ سمیع الرحمٰن۔ شاکر دورا ☆ شاہ عروج۔ کوہاٹ ☆ طارق۔ جہلم ☆ ظفر اللہ رند۔ کوئٹہ بلوچستان ☆ مریم۔ آزاد کشمیر ☆ ایم سلیم۔ پشاور ☆ فیصل شیخ۔ کراچی ☆ اسامہ امیر۔ بنوں ☆ ریاض۔ گلگت ☆ علیشہ اصغر۔ کراچی ☆ رجعہ سیماب۔ وہاڑی ☆ اسماء۔ نوشہرہ ☆ مسز ارم آفتاب۔ حیدرآباد ☆ ظفر۔ منچن آباد ☆ مجیدہ کنول۔ جلال پور پیر والا ملتان ☆ نجمہ آغا۔ سکھر ☆ فارغ ندیم۔ گلستان جوہر ☆ زوبیہ۔ لاہور ☆ نادیہ۔ اسلام آباد ☆ تالب خاکستری۔ نامعلوم ☆ فاکیہ ارشد۔ ملتان ☆ عدنان اشرف۔ نامعلوم ☆ سہیل اعوان۔ اٹک ☆ شکیل جٹ۔ نارووال۔

آئندہ ماہ انشاء اللہ تعالیٰ پھر ملاقات ہوگی، اس وقت تک کے لیے اجازت۔

آپ کی سلامتی اور خوشیوں کی طالب

مینا تاج

سانپوں والا باغ



محمد سلیم اختر

ایک ناگ اور انسان کی دوستی کی انوکھی داستان

میں سیالکوٹ کے علاقہ میں سرحد کے نزدیک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں 'سانپوں والا باغ' کا نام سن کر میں چونک گیا۔ میرے میزبان اپنے بیٹے کو وہاں سے دودھ لے کر آنے کا کہہ رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ 'سانپوں کا باغ' ایک جگہ کا نام ہے۔ وہاں سے ہمیں دودھ ایک تو خالص ملتا ہے اور دوسرا سستا بھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس جگہ کو 'سانپوں کا باغ' کیوں کہتے ہیں۔ تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مگر میرے تجسس میں اضافہ ہوگیا۔ میرے اصرار پر وہ مجھے گاؤں کے ایک بزرگ راخ والی کے پاس لے گئے۔ تو انہوں نے مجھے سانپوں کے باغ کے بارے میں پوری کہانی سنا ڈالی۔ جو میں ان کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔

☆......☆......☆

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب تقسیم ہند نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کی مصروفیات دم ہی نہیں لینے دیتی تھیں۔ نہ جانے ماضی کی کتنی ہی یادیں دھندلا گئی ہیں۔ مجھے گلو کی موت والا منظر آج بھی یاد ہے۔ ماضی کے نقوش آج پھر اُجاگر ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے، جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اس وقت میری عمر دس گیارہ سال کی ہوگی۔ گلو نے ایک بڑا سا باغ ٹھیکے پر لیا تھا۔ جو ہمارے گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ اسی باغ کے ایک کونے میں اس نے جانوروں کا ڈیرہ بھی بنایا تھا۔ جہاں اس نے اونٹ، گائے اور بھینسیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اردگرد کے دیہاتوں کو دودھ گلو ہی سپلائی کرتا تھا۔ اس کا دودھ نہایت ہی خالص ہوتا تھا۔ اس کا ریٹ بھی کم تھا۔ اس لیے لوگ اسی سے دودھ اور دیسی گھی بھی خریدتے تھے۔

گلو نے ایک خچر بھی تھا۔ جس پر وہ دودھ لاد کر گاؤں گاؤں پھر کر فروخت کرتا تھا۔ اس باغ میں سیب اور آموں کے درختوں کی کثرت تھی۔ گلو دودھ فروخت کرنے کے بعد اپنی ضرورت کا سودا سلف ہمارے ہی گاؤں میں موجود دکانوں سے خرید کر لے جاتا۔ سارے علاقے میں اس کی سلام دعا صرف میرے دادا جان سے تھی۔ وہ جب بھی کسی بھی کام سے اِدھر آتا تو میرے دادا جان سے ملتا۔ اُن کے پاس بیٹھ کر گپ شپ لگاتا تھا۔

ہمارے اس گاؤں میں دو تین گھروں کے سوا تمام آبادی ہندو اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ گلو جب بھی آتا۔ وہ دادا جان کے پاس بیٹھ کر حقے کے کش لگاتا

اور ادھر اُدھر کی باتیں بھی کرتا رہتا۔ گلو بہت ہی منکسر المزاج اور خوش اخلاق قسم کا انسان تھا۔ وہ صرف ایک ٹانگ کا مالک تھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ اسی وجہ سے تو وہ مچر پر دودھ لاد کر لاتا تھا۔ گلو کی آنکھوں میں زندگی کے تجربوں کی چمک تھی۔ اس کے چہرے پر ایک تاثر انگیز سوگواری سی چھائی دکھائی دیتی تھی۔

مجھے اب بھی یاد ہے کہ گلو کے معمول میں یہ بات شامل تھی کہ وہ جب بھی ہمارے گاؤں کا رُخ کرتا تو میرے دادا جان کے لیے کوئی نہ کوئی پھل ضرور لے کر آتا۔ کبھی آم، کبھی سیب اور کبھی آڑو، جب باہر دالان میں گلو کی بیساکھی کی ٹک ٹک سنتے تو بھاگ کر دادا کی بیٹھک میں پہنچ جاتے اور گلو تو جیسے پہلے سے ہی اس موقع کا منتظر ہوتا۔ وہ پھرتی سے فروٹ نکالتا اور ہم بچوں میں تقسیم کر دیتا اور جو باقی بچتے۔

''یہ آپ کے حصے کے ہیں۔'' کہہ کر دادا جان کے حوالے کر دیتا۔ گلو کی ایک ٹانگ کی عدم موجودگی پر بعض اوقات ہم بچے مختلف قیاس آرائیاں کرتے اور عموماً اس نتیجے پر پہنچتے کہ یہ کسی ریل گاڑی کے نیچے آیا ہوگا۔ اور اس حادثے میں اس غریب کی ٹانگ کٹ گئی ہوگی۔

گلو اکثر دادا جان کو اپنے ڈیرہ پر آنے کی دعوت دیتا رہتا تھا۔ ایک روز گلو نے مجھے اور دیگر بچوں کو باغ کی سیر کرنے کی دعوت دی تو ہم بضد ہو گئے۔ ہماری ضد کے آگے دادا جان نے ہار مان لی اور ایک روز ہم پروگرام بنا کر گلو کے باغ کی سیر کرنے کے لیے چلے گئے۔ گلو کے لیے ہماری آمد غیر متوقع تھی۔ اس نے ہماری آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔ ہمیں بھرپور طریقے سے خوش آمدید کہا اور ہماری خاطر تواضع میں دل کھول کر خرچ کیا۔ وہ ہمارے استقبال میں پیش پیش تھا۔ اس نے ہمیں سارے باغ کی خوب سیر کرائی۔ وہ مختلف پیڑوں کے پاس لے جا کر ہمیں ان کے پھلوں کی خصوصیات بتاتا رہا۔ وہ واقعی ایک بہت بڑا باغ تھا۔ گلو آگے تھے دادا جان اس کے پیچھے اور ہم دادا جان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

اچانک چلتے چلتے دادا جان نے دونوں بازو پھیلا کر ہم سب کو پیچھے ہی رُکنے کا اشارہ کیا اور پھر ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور اپنی لاٹھی سر سے اوپر اٹھا



کرکسی چیز کو مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ گلو فوراً دادا جان کی طرف لپکا اور ان کو پوری قوت سے اسی جگہ روک دیا اور پھر نہایت ہی عاجزی سے کہنے لگا۔

''میاں جی! ٹھہر جائیں اور لاٹھی نیچے کرلیں اس کو کچھ نہیں کہنا۔ یہ تو دیوتا ہے۔'' ہم نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ ایک سیاہ اور زرد دھاریوں والا سانپ راستے سے گزر رہا ہے وہ ہمارے سامنے آیا اور نہایت تیزی سے دوسری طرف جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ دادا اور ہم گلو کے اس عجیب سے رویے پر حیران ہوئے اور کچھ غصہ بھی آیا اس پر، مگر گلو کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ بولا اور کہنے لگا۔

''میاں جی! معاف کردیں اور غصہ بھی نہ کریں۔ آپ کو ضرور یہ حیرانی ہوگی کہ میں نے آپ کو اس سانپ کو مارنے سے کیوں روک دیا۔ کیونکہ لوگ تو سانپ کو انسان کا ازلی دشمن سمجھتے ہیں۔ مگر میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا خیال اور نظریہ اس سے مختلف ہے۔ اگر یہ سانپ ایک نہایت ہی مشکل اور تکلیف دہ گھڑی میں میری مدد نہ کرتا تو میں آج اس دنیا میں نہ ہوتا۔''

دادا جان گلو کو دیکھے جارہے تھے۔ اُن کے چہرے پر تکدر سا تھا اور وہ خاصے مضطرب نظر آرہے تھے۔ گلو نے یہ محسوس کرکے دادا جان کو بازو سے پکڑ کر واپس ڈیرے کی طرف لے جانا چاہا۔ اور راستے میں کہنے لگا۔

''اتفاقاً ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ آپ کو بتائے بغیر اب کوئی چارہ نہیں رہا۔'' ہم نے مزید سیر نہ کی اور گلو کے ڈیرے پر پہنچ کر چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ گلو دودھ اور لسی کے جگ بھر کر لے آیا۔ تو ہم پھر سے دودھ اور لسی پینے لگے۔ پھر دادا جان کے استفسار پر گلو نے اپنی عبرت انگیز اور رونگٹے کھڑے کردینے والی داستان یوں سنائی۔

☆......☆......☆

میاں جی! آپ دیکھ رہے ہیں ناں کہ میں ایک ٹانگ سے لنگڑا ہوں۔ میری یہ ٹانگ میری اپنی ہی غلطی سے ضائع ہوئی تھی۔ ان دنوں میں اٹھارہ انیس سال کا گھبرو جوان تھا۔ میرے والد شتربان تھے۔ ہم دھرم شالہ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ جو یہاں سے تین میل کی مسافت پر مشرق کی سمت میں واقع ہے اور اس کا نام اب ''ٹھیکریاں والا'' ہے۔ گاؤں سے میرے والد صاحب اونٹوں پر سامان لاد کر شہر اور شہر سے تاجر لوگوں کا سامان اِدھر اُدھر کے دیہاتوں میں لایا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے پاس پانچ اونٹ تھے۔ ان دنوں بار برداری کا پیشہ کافی منافع بخش تھا کیونکہ اس وقت گاڑیاں کم ہی ہوتی تھیں۔ لوگ بیل گاڑی اور اونٹوں پر سفر بھی کرتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھار ابا جان کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ اور خوب سیر بھی کرتا تھا۔

ان دنوں بار برداری کا کام بہت زیادہ تھا۔ اس لیے والد صاحب نے شکر گڑھ کے علاقہ سے ایک نیا اونٹ خریدا۔ جو بہت ہی صحت مند اور خوبصورت بھی تھا۔ اس کو خریدنے کے لیے والد صاحب نے اپنے دو اونٹ فروخت کردیے کیونکہ یہ نیا اونٹ بہت زیادہ وزن اٹھاتا تھا۔ میں نے ابا جان سے اس اونٹ کی خصوصیت پوچھی تو وہ کہنے لگے۔

''یہ اونٹ پچاس من بوجھ اٹھا کر چل سکتا ہے۔ لیکن یہ غصے کا بہت ہی کڑوا ہے اور ہر وقت سرکشی پر مائل رہتا ہے۔ شتربان ایسے اونٹ کو عموماً شہ زور کہتے ہیں۔ جو بہت زیادہ وزن اُٹھا کر کھڑا ہو سکے۔ والد صاحب نے اسے آزمانے کے لیے پندرہ بوری گندم لاد دی تو اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ آرام سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں بہت حیران ہوا کہ میں نے ایسا اونٹ زندگی میں کم ہی دیکھا تھا۔ وہ بڑا شاندار اور جی دار اونٹ تھا۔ بڑا سا کوہان، فربہ جسم، عام اونٹوں سے طویل قامت، پیشانی پر چاند تارے کی مانند سفید نشان اس کی شان میں اضافہ کرتا تھا۔ وہ اکثر بلبلی مارتا رہتا تھا۔ اور ہمیشہ ہی دوسرے اونٹوں سے لڑنے مارنے پر تُلا رہتا۔ دوسرے اونٹ اس سے خائف رہتے تھے۔ اس وجہ سے مجھے وہ اچھا نہ لگتا تھا۔ ابا جان اس کا بہت

خیال رکھتے اور اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتے۔ اس کو نہلاتے اور تیل سے اس کی مالش بھی کر دیتے۔

☆......☆......☆

ایک دن اس اونٹ نے ایک دوسرے اونٹ کی گردن پر اس زور سے کاٹا کہ اس کا گوشت اُدھڑ گیا۔ ابا جان گھر نہ تھے۔ مجھے اونٹ کی اس حرکت پر بے حد غصہ آیا۔ میں نے اسے ایک مضبوط رسی لے کر درخت سے باندھ دیا اور پھر ایک لاٹھی لے کر اسے اتنا پیٹا کہ میں تھک کر ہانپنے لگا۔ اونٹ مار کھاتا رہا۔ مگر اس نے زبان سے ذرا بھی آواز نہ نکالی۔ اُس دن کے بعد ہم نے اسے ہمیشہ علیحدہ کر کے باندھ کر ہی رکھا۔ مگر میں نے یہ محسوس کیا کہ اب میں جب بھی اس کے قریب سے گزرتا ہوں تو وہ مجھے بڑی غصیلی اور خونخوار نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اپنی گردن ٹانگیں غضب ناک انداز میں پٹختا ہے۔

میں نے اس بارے میں والد صاحب کو بتایا اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ مجھے اس اونٹ سے ڈر لگتا ہے کہ یہ کہیں مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ مگر والد صاحب نے مجھے احتیاط کرنے کی تلقین کر کے میرا خوف دور کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ میں اس سے دور ہی رہا کروں۔

اِدھر والد صاحب نے اسے بڑے شوق سے خریدا تھا۔ وہ بار بار اس کی جسامت اور طاقت کا ذکر کرتے رہتے کہ ان کا اونٹ اتنا بوجھ اٹھاتا ہے، یہ کرتا ہے، وہ کرتا ہے، لہٰذا یہ بہت ہی کارآمد اور منافع بخش جانور ہے۔

☆......☆......☆

رات کو جس پڑاؤ میں ہم اونٹوں کو باندھتے تھے۔ وہاں...... میں والد صاحب اور ملازم سویا کرتے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ایک دن والد صاحب کسی کام کے سلسلے میں گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے اور ہمارا ملازم بھی اپنے گھر والوں سے ملنے گیا ہوا تھا۔ میں باڑے میں اکیلا ہی تھا۔ جو گاؤں سے باہر واقع تھا۔ میری چارپائی اونٹوں سے کچھ فاصلے پر تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ ہوا میں بھی گھٹن سی تھی۔ میں مشکل سے دو گھنٹے ہی سویا ہوں گا کہ کسی انجانے سے خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔ باڑے کے ایک کونے میں دو بلیاں آپس میں لڑ رہی تھیں۔ اور ان کی چیخ و پکار بڑی ہی خوفناک تھی۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ کسی انجانے سے خطرے کا خوف میرے اندر سرایت کر گیا تھا۔ میں بے اختیار ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اپنے بستر کا تکیہ لمبے رُخ چارپائی پر ڈال کر اس کے اوپر چادر ڈال کر اسے ڈھانک دیا تاکہ دیکھنے والے کو احساس ہو کہ میں چارپائی پر سویا ہوا ہوں۔

میں جلدی سے باڑے سے باہر نکلا اور گاؤں چلا آیا۔ گھر میں داخل ہوا تو دیکھا۔ والدہ صاحبہ جاگ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔

”میں نے تمہارے متعلق ایک بہت ہی بُرا اور خوفناک خواب دیکھا ہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ تمہیں جا کر باڑے میں دیکھوں۔ اچھا کیا کہ تم خود ہی آ گئے ہو۔ تم ٹھیک تو ہو ناں؟“

”جی ماں جی! میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے انہیں مطمئن کر دیا۔

میں اس رات کو گھر میں ہی سویا۔ صبح دن چڑھے باڑے میں پہنچا تو ملازم وہاں پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی میری توجہ چارپائی کی طرف مبذول کرائی۔ میں نے دیکھا کہ چارپائی اس طرح ٹوٹی پھوٹی تھی کہ اس کا ایک ایک حصہ بکھرا پڑا تھا۔ بستر کی دھجیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اچانک میرے ذہن میں شہہ زور کا خیال آیا۔ اس اونٹ کا نام ہم نے شہہ زور ہی رکھ دیا تھا۔ اور وہ اس وقت باڑے میں موجود نہ تھا۔ مجھے خوف کے ساتھ فکر بھی لاحق ہو گئی کہ وہ کہاں چلا گیا ہے؟ اگر وہ نہ ملا تو والد صاحب ڈانٹیں گے۔

میں نے ملازم کو اس کی تلاش کے لیے روانہ کیا۔ وہ پاؤں کے نشانات دیکھتا ہوا باہر کھیتوں کی طرف

نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس کی نکیل پکڑے واپس آرہا تھا۔ اونٹ کی پیٹھ پر جا بجا خراشیں تھیں۔ جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ اسی اونٹ نے ہی یہ حرکت کی ہے اونٹ کا یہی طریقہ انتقام ہے کہ وہ اپنے حریف کو پچھاڑنے کے بعد اسے اپنے پیٹ کے نیچے رکھ کر پوری طاقت سے مسلتا ہے اور الٹ پلٹ ہو کر اپنا انتقام پورا کرتا ہے۔

شام کو والد صاحب لوٹ آئے تو میں نے انہیں تمام ماجرا سنایا اور والدہ صاحبہ نے انہیں اس اونٹ کو فوری طور پر فروخت کرنے پر زور دیا۔ میں جانتا تھا کہ والد صاحب شہہ زور سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ مگر والدہ کے اصرار اور میرے خوف نے انہیں مجبور کر دیا اور انہوں نے بھی بہتری جانی کہ اس اونٹ کو فروخت کر دیا جائے۔ مگر اتنی جلدی اور اچانک گاہک تلاش کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ ایک دو شتربان خریدار آئے مگر انہوں نے قیمت بہت کم لگائی۔ یوں ہی دس بارہ دن گزر گئے تھے۔ جس روز اونٹوں کا کوئی کام نہ ہوتا اور وہ فارغ ہوتے تو ملازم انہیں چرانے کے لیے گاؤں سے باہر درختوں کے جھنڈ میں لے جاتا تھا۔ اور عصر کے بعد اس وقت لوٹ کر آتا جب ان کے پیٹ بھر چکے ہوتے۔ اس روز اونٹ بہت ہی خوش بھی دکھائی دیتے تھے۔

☆......☆......☆

اس روز بھی اونٹوں کا کوئی کام نہ تھا۔ اس لیے ملازم انہیں باہر لے کر گیا ہوا تھا۔ دو پہر ہوئی تو ساتھ والے گاؤں سے ایک مہاجن آ گیا۔ اس نے شہر سے اجناس کی بوریاں لاد کر لانے کو کہا۔ اس نے پیشگی کرایہ اور مزدوری والد صاحب کو ادا کر دی اور تاکید کرنے لگا کہ غلہ دو دن کے اندر پہنچ جانا چاہیے۔

وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ اس لیے ابا جان نے اسی روز شہر جانے کی ٹھانی اور تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں گاؤں سے باہر جاؤں اور چراگاہ سے اونٹ لے کر آ جاؤں۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور چراگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اونٹ مجھے نظر آ گئے۔ اونٹ چر رہے تھے مگر ملازم نظر نہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ مگر کوئی جواب نہ ملا، میں اسے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر ڈھونڈنے لگا۔

میں اپنے دھیان میں تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ شہہ زور سرپٹ میری طرف دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ ہمارا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ سو گز ہو گا۔ میں اس وقت ایسی جگہ پر تھا کہ اگر میں گاؤں والے راستے کی طرف بھاگتا تو اونٹ فوراً ہی مجھے گھیر لیتا۔ قریب کوئی ایسا بڑا درخت بھی نہیں تھا کہ میں بھاگ کر اس پر چڑھ جاتا۔ مزید سوچنے کی مہلت بھی تو نہ تھی چنانچہ میں بلا سوچے سمجھے مخالف سمت کو بھاگ کھڑا ہوا۔ دُور نزدیک کوئی ایسا متنفس بھی نظر نہیں آتا تھا۔ جو میری پکار سن کر میری مدد کرنے آتا۔ شہہ زور کے تیور سخت خراب لگ رہے تھے اور وہ تیزی سے میرے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ چراگاہ سے آگے باغ تھا۔ اس میں ایک سوکھا ہوا کنواں تھا۔ اس کے قریب ایک پیپل کا درخت تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس درخت تک پہنچ جاؤں تو اس پر چڑھ جاؤں تو بچ سکتا ہوں۔ میرا اور اونٹ کا فاصلہ اب بیس پچیس گز رہ گیا تھا۔

میں ہانپتا کانپتا درخت کے قریب تو پہنچ گیا مگر اس کا تنا اس قدر موٹا تھا کہ تیزی سے پھلانگ کر اس پر چڑھنا مشکل تھا۔ اس عرصے میں اونٹ اور بھی آگے آ گیا تھا۔ اب میرے اور اس کے درمیان چند گز کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ مجھ سے درخت پر نہیں چڑھا جا رہا تھا۔ سانس بُری طرح پھول گیا تھا اور اعصاب جواب دے گئے تھے۔ موت مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتی نظر آ رہی تھی۔ درخت پر چڑھنے کے لیے سہارے کے لیے کوئی ٹنڈ یا تنا درخت کے نچلے حصے پر نہیں تھا۔ جب میں ہر طرف سے ناکام اور مایوس ہو گیا۔ تو میں نے مجبوراً کنوئیں میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ کنواں خشک تھا۔ اس کے اندر نیچے جھاڑ جھنکاڑ اُگے ہوئے تھے اس کی گہرائی پندرہ فٹ کے لگ بھگ ہو گی۔ عام حالات میں شاید میں خود یہ فیصلہ نہ کر پاتا مگر یہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ مجھے اپنی جان پیاری تھی۔ اونٹ اپنی تھوتھنی اس انداز سے آگے کیے بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز اُچک

لینے کی فکر میں ہو۔ میرے اور شہہ زور کے درمیان آٹھ نو فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اونٹ کی تھوتھنی اور میرا فاصلہ تو چار پانچ فٹ ہوگا۔ میں نے اس بے چارگی کی حالت میں کنویں میں چھلانگ لگادی۔

کانٹے دار جھاڑیوں میں میرے کپڑے اُلجھ گئے۔ زیادہ چوٹ تو نہ آئی مگر جسم میں جابجا کانٹے چبھ گئے۔ چند لمحوں تک تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جب حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے کنویں کی منڈیر کی طرف دیکھا۔ تو اونٹ کنویں کے باہر کھڑا نظر آیا۔ وہ سخت غصے میں تھا اور بلبلانے کے انداز میں پھنکار رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی گردن نیچے کرتا اور کنویں میں جھانکتا۔ مگر اب میں اس کی گرفت سے دور تھا۔ اونٹ بار بار اپنے گھٹنے کنویں کی منڈیر پر ٹیک کر اپنی تھوتھنی نیچے لاتا۔ مگر میں اس کی پہنچ میں نہ تھا۔ آخر وہ اسی حالت میں کنویں کی منڈیر پر ہی بیٹھ گیا اور اپنی تھوتھنی منڈیر پر رکھ دی۔

مجھے یہ یقین تھا کہ اگر ملازم نے شہہ زور کو ریوڑ سے غائب پایا تو وہ اسے ڈھونڈے گا اور وہ اسے ڈھونڈتا ہوا اس طرف بھی آئے گا۔ وہ کنواں راستے سے ذرا ہٹ کر تھا۔ میں پھر بھی خوفزدہ تھا کہ کہیں اونٹ کنویں کے اندر ہی نہ کود جائے اس لیے میں نے مایوسی کے عالم میں ملازم کا نام لے کر اسے پکارنا شروع کردیا۔ ساتھ ہی میں نے رونا اور بین کر کرنا بھی شروع کردیا کہ اس عالم میں کوئی تو میری مدد کرے۔

آنسو میرے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ مگر میری آوازیں باہر نہ جاتی تھیں۔ وہ کنویں میں ہی دب جاتی تھیں۔ اسی طرح یون گھنٹہ گزر گیا ہوگا۔ اب میری حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی۔ اونٹ بدستور تھوتھنی منڈیر پر لٹکائے بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اپنے اندر ہمت پیدا کی اور صورت حال سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کرنا شروع کردیا اور سوچنے لگا کہ اس آفت سے کیسے نجات حاصل کروں۔

اتنی ہی دیر میں اچانک کنویں کے اندر ہی جھاڑیوں سے سیٹی کی آواز میں سنسناہٹ سنائی دی۔

میں نے اس طرف دیکھا تو اینٹوں میں موجود ایک دراڑ سے ایک سانپ برآمد ہوا۔ اس کے جسم پر بھی ایسی ہی دھاریاں تھیں۔ جیسی آپ نے باغ میں ابھی اس سانپ پر دیکھی ہیں۔ سانپ کو دیکھ کر اور اس کی پھنکار سُن کر مجھے یقین ہوگیا کہ میری موت اب یقینی ہے اور میں لمحوں کا مہمان ہوں۔ میں ایک موت سے تو بچ گیا تو دوسری موت سامنے آکھڑی ہوئی ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں کہیں بھاگ بھی نہیں سکتا اور نہ حرکت کرسکتا ہوں۔

میں نے مایوس ہوکر خود کو تقدیر کے حوالے کردیا کہ اگر میری موت اسی طرح لکھی ہے تو اسے کون ٹال سکتا ہے۔ میں نے اپنے ماں باپ کو یاد کیا اور پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اور سانپ کی طرف دیکھا۔ سانپ کچھ دیر اسی بل کے دہانے پر بیٹھا رہا۔ جیسے وہ حالات کا جائزہ لے رہا ہو۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے بے اختیار ہوکر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے جیسے میں سانپ سے معافی مانگ رہا ہوں اور واقعی ایسا ہی تھا۔ میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔

''ناگ بھیا! مجھے معافی دے دو۔''

چند ہی لمحوں بعد سانپ نے حرکت کی اور پھر اس نے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنا شروع کردیا میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے تھا۔ شاید سانپ نے میری پکار سُن لی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کنویں سے باہر نکل گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ موت ایک دفعہ پھر ٹل گئی ہے۔

تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ سانپ دوبارہ نیچے اترنے لگا۔ میں پھر خوفزدہ ہوگیا کہ اب میری خیر نہیں ہے۔ مگر وہ سانپ چپ چاپ اُسی بل میں داخل ہوگیا جہاں سے وہ باہر نکلا تھا۔ میں کچھ دیر تک صورت حال سمجھنے سے قاصر رہا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ سانپ باہر کیوں گیا تھا اور اب اتنی جلدی واپس کیوں آگیا ہے۔

میں نے پھر یہ دیکھا کہ اونٹ جو غصے سے بار بار بلبلاتا تھا۔ اب وہ خاموش ہے۔ اس کی آنکھیں اسی

طرح کھلی تھیں اور پہلے جو اُس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اب اس کی جگہ خون کی دھاری بہہ رہی تھی۔
میں سوچنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اسی حالت میں بہت سارا وقت گھنٹوں کے حساب سے گزر گیا۔ میں نے قریب سے ٹوٹی ہوئی دیوار کے ایک گوشے سے اینٹ کا ایک ٹکڑا نکالا اور اسے اونٹ کے منہ پر مارا مگر اس کا اونٹ پر کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ بلکہ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اونٹ زندہ نہیں ہے۔ یہ مر گیا ہے، میرے تو حواس ہی معطل ہو گئے۔ میں اب بھی صحیح صورتِ حال سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ لیکن یہ یقین سا ہو گیا کہ اونٹ مر گیا ہے۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ اسے اس سانپ نے ڈسا ہوگا۔ اس کے علاوہ اچانک اونٹ کی موت کی وجہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے اب کنویں سے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے ہمت کی اور بڑی مشکل سے خود کو جھاڑیوں سے چھڑایا۔ کنویں کی دیوار کے ساتھ پیپل کے درخت کی جڑیں نکلی ہوئی تھیں۔ جو کافی موٹی تھیں، میں آہستہ آہستہ ان جڑوں کے سہارے کھسکنے لگا اور باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اونٹ کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں اب بھی شش و پنج میں تھا کہ اونٹ کیسے مرا۔ اس نے تو مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ اونٹ مر گیا ہے تو میں نے طیش کے عالم میں اس کے پیٹ پر پاؤں سے ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ تو میرا پاؤں پنڈلی تک اس کے پیٹ میں گھس گیا اور زرد رنگ کا لیس دار مادہ باہر نکل کر بہنے لگا۔ میرا پاؤں اس گندے مواد سے آلودہ ہو گیا۔

میں اس عجیب سی صورتِ حال پر حیران سا کھڑا تھا کہ مجھے دور سے والد صاحب اور ملازم تیز رفتاری سے میری طرف آتے دکھائی دیے۔ ان کو آتا دیکھ کر میری ڈھارس بندھ گئی۔ مگر ٹانگ اور پاؤں میں جس جگہ مواد لگا تھا وہاں شدید قسم کی جلن شروع ہو گئی۔ کوئی ایسی چیز قریب نہ تھی کہ میں اپنا پاؤں ہی صاف کر لیتا۔ چنانچہ میں نے اپنی قمیص اُتار کر جو پہلے ہی پھٹ چکی تھی۔ اس سے ٹانگ اور پاؤں کو صاف کیا مگر جلن پھر بھی ختم نہ ہوئی بلکہ وہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اتنے میں والد صاحب اور ملازم میرے قریب پہنچ گئے۔

میں نے انہیں تمام قصہ سنایا۔ تو وہ فکر مند اور حیران ہو گئے۔ مگر مجھے زندہ دیکھ کر اُن کو سکون مل گیا اونٹ کے کانوں اور ناک سے بھی لیس دار مادہ نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ جس میں سے بدبو بھی آنے لگی تھی۔ اس لیے ہم مزید وہاں نہ ٹھہرے اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے پاؤں پانی سے دھویا۔ مگر جلن ختم نہ ہوئی۔ شام تک پاؤں اور ٹانگ پر آبلے اُبھر آئے اور ان میں سے زرد رنگ کا پانی بہنے لگا اور جلد گلنے لگی۔ جلن اور درد کی وجہ سے میری چیخیں نکلنے لگیں۔

ابا جان نے دوسرے گاؤں سے جھاڑ پھونک کرنے والا ایک سیانا بلوایا۔ اس نے ساری بات پوچھی اور کہنے لگا کہ زہر میرے جسم میں سرایت کر گیا ہے۔ اور بہت دیر ہو گئی ہے، اب اس کا علاج بہت ہی مشکل اور ناممکن ہے۔ اس نے ایک سفوف کا لیپ بنا کر لگایا اور واپس چلا گیا۔ مگر اس سے معمولی افاقہ بھی نہ ہوا بلکہ تکلیف بڑھتی ہی گئی۔ رات میں نے جاگ کر اور تڑپتے ہوئے گزاری اگلے دن میری حالت اور بھی بدتر ہو گئی۔ زخم اوپر کی طرف سرایت کرنے لگا۔

گاؤں کے لوگوں نے مجھے اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ تو والد صاحب مجھے لے کر دھرم شالہ اسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر نے میری ٹانگ پاؤں اور زخم کا معائنہ کر کے مشورہ دیا کہ ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔ ورنہ یہ مرض لاعلاج ہو جائے گا اور زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا۔

اس کے بعد میں دو ماہ اسپتال میں رہا۔ میری ٹانگ کاٹ دی گئی تھی اور بیساکھی میری زندگی کی مستقل ساتھی بن گئی۔ میں نے تو اپنے نامکمل وجود کا رونا، رونا ہی تھا۔ ابا جان اور والدہ صاحبہ کو بھی شدید

صدمہ پہنچا تھا۔ میری والدہ کو دکھ تھا کہ ان کا جوان گھبرو بیٹا معذور ہو گیا ہے۔ میں جب دو ماہ بعد اسپتال سے ڈسچارج ہو کر بیساکھی کی کھٹ کھٹ کے ساتھ گاؤں پہنچا تو سارا گاؤں میرا دکھ بانٹنے کے لیے میرے گھر چلا آیا۔ میرے ساتھ بیتے ہوئے اس سانحہ سے ایک اور بڑی تبدیلی آئی۔ وہ یہ تھی کہ والد صاحب نے تمام اونٹ فروخت کر ڈالے تھے اور شتربانی کے کام سے توبہ کر لی۔ اونٹوں کو فروخت کر کے جو رقم ملی۔ اس رقم سے انہوں نے ایک تو یہ باغ خرید لیا اور یہاں پر بھینسوں کا باڑہ بنا لیا۔ میں اس تبدیلی پر بہت خوش ہوا۔ آہستہ آہستہ میں بیساکھی کے سہارے چلنے کا عادی ہو گیا اور سب کام بھی کرنے لگا۔ بھینسوں کے لیے چارہ بناتا اور انہیں چرانے لے جاتا۔ اور ان کا دودھ بھی نکالتا اور پھر گاؤں گاؤں جا کر فروخت کرتا۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

ابا جان کو سانپوں سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اُس کنویں کو کچرا اور مٹی ڈال کر بند کر دیں۔ تا کہ یہاں سے سانپوں کا نام ونشان تک مٹ جائے۔ میں نے پہلے تو ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ تو سانپوں کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ میری زندگی بھی سانپ نے ہی بچائی تھی۔ یہ اس کا مجھ پر احسان تھا۔ ورنہ تو اونٹ کے بجائے مجھے ڈس لیتا۔ تو آج میں سانس نہ لے رہا ہوتا۔ وہ سانپ تو میرا محسن ہے۔ لہٰذا میں نے ابا جان کو منع کر دیا کہ وہ اس کنویں کو بند نہ کریں۔ انہوں نے میری بات سے اتفاق کیا اور ارادہ ملتوی کر دیا تو میں مطمئن سا ہو گیا۔

ایک روز میرے جی میں آیا تو میں نے مٹی کے دو پیالوں میں دودھ ڈالا اور کنویں کی منڈیر پر رکھ آیا۔ صبح جا کر دیکھا تو پیالے خالی تھے۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ سانپ نے دودھ پی لیا ہے۔ میں بہت خوش ہوا کہ اس طرح میں اس کے احسان کا بدلہ اُتار دوں گا۔ اب میں روزانہ ہی شام سے پہلے کنویں کی منڈیر پر رکھے پیالوں میں دودھ ڈال دیتا اور سانپ اسے پی لیتا۔ پھر میں نے اس کو معمول بنا لیا۔ اب میں جب کنویں پر دودھ لے کر جاتا تو سانپ میرا منتظر ہوتا۔ پھر سانپوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ تو میں نے دودھ کی تعداد بھی زیادہ کر دی۔ سانپ اب مجھے کچھ نہیں کہتے اور نہ ہی مجھے اُن سے خوف آتا۔ ابا جان نے منع بھی کیا مگر میں باز نہ آیا۔ اور ان کو دودھ پلانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

کچھ عرصہ بعد میری شادی ہو گئی۔ میری بیوی ناہید میری برادری کی ہے اور نہایت ہی محبت کرنے والی ہے۔ چار سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس عرصے میں ابا جان اور امی دونوں کا انتقال ہو گیا۔ اب میں دو بچوں کا باپ ہوں۔ زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔ باغ سے اور دودھ سے ہونے والی آمدنی سے گزر بسر بہتر انداز میں ہو رہی ہے۔ سانپ باغ میں بھی اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ مگر ہمیں ان سے خوف نہیں آتا کہ یہ میرے دوست ہیں۔

☆......☆......☆

گلو نے اپنی داستان ختم کی۔ تو ہم نے وہ کنواں دیکھنے کی خواہش کی۔ تو اس نے ہمیں وہ کنواں صرف دُور ہی سے دکھایا۔ بس اس دن سے اس باغ کا نام ’سانپوں والا باغ‘ پڑ گیا۔ برسوں بیت گئے ہیں۔ گلو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ناہید بھی چل بسی تھی۔ اب گلو کی اولاد نے دودھ کا کاروبار سنبھال رکھا ہے اور باپ دادا کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ مگر وہ باغ کو نہیں سنبھال سکے باغ اُجڑ گیا ہے مگر وہ کنواں اسی حالت میں موجود ہے۔ نئی نسل اس کنویں کی طرف جاتے ہوئے خوف کھاتی ہے کہ کہیں سانپ اُن کو ڈس نہ لیں۔ مگر یہ جانور اتنا برا نہیں ہے جتنا ہم انسانوں نے سمجھ رکھا ہے۔

☆......☆......☆

میں نے بھی اس کنویں کو دور ہی سے دیکھا اور واپس لوٹ آیا۔ کیونکہ اس کی منڈیر کے گرد اب گھنی جھاڑیاں اور سرکنڈے اُگ آئے ہیں پھر بھی لوگ ’سانپوں والے باغ‘ کو نہیں بھولے کیونکہ اس جگہ کا نام ہی اب ’سانپوں والا باغ‘ ہے۔

☆......☆......☆

بنگلہ نمبر D-36

اسماء اعوان

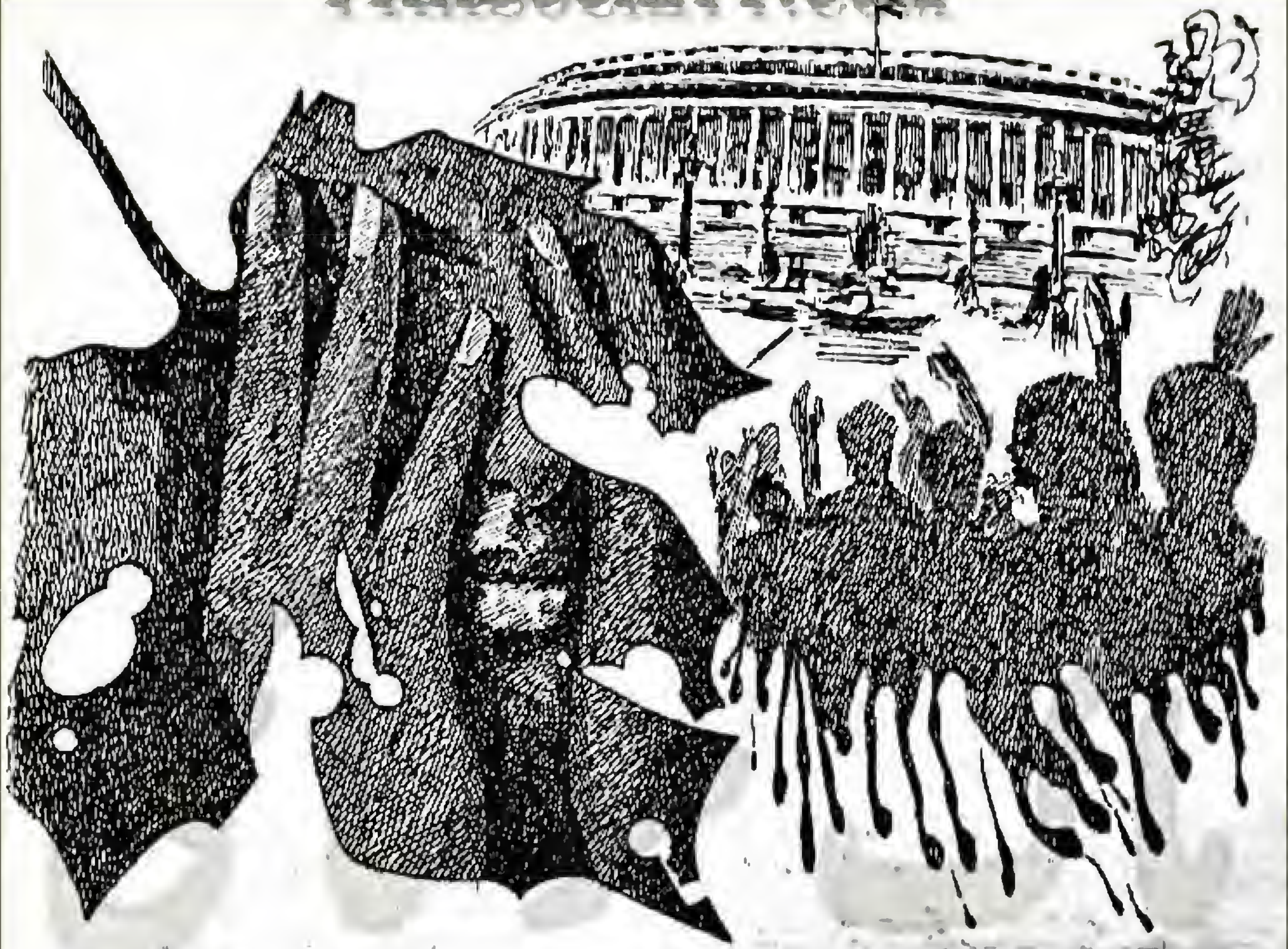
ایک ایسے گھر کی کہانی، جس میں داخل ہونے والا بس اُسی کا ہو گیا

بے روزگاری کھوپڑی کے اوپری حصے میں باریک باریک سوراخ کر دیتی ہے۔ جن سے مایوسی کی ہوا اندر داخل ہو کر انسان کے ذہن و دل کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ امنگوں کے جراثیم مردہ ہو جاتے ہیں۔ بزدلی کے باریک ذرات اس ہوا کی خوراک حاصل کر کے طاقتور ترین ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بے روزگار انسان کبھی خود کشی کرتے ہیں۔ کبھی جرائم، میرے خیال میں ہر مجرم بزدل ہوتا ہے۔ تحریک جرم، بزدلی کی پیداوار ہے۔ دلیر انسان جرائم کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی دلیری سے ناگفتہ بہ حالات کو اپنا مطیع کرتا ہے۔ کسی بھی سلسلے میں کوئی مجرمانہ خواہش دلیری سے شکست کھاتی ہے اس کے برعکس بزدل انسان اس خواہش سے مجبور ہو کر تکمیل جرم کر بیٹھتا ہے۔

میں اپنے ان نظریات پر سختی سے کاربند تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ مایوسی کی ہوا کو اپنے جسم میں سرایت نہ ہونے دوں۔ پورے ایک سال سے بے روزگار تھا اور ہر وہ کوشش کر چکا تھا جو میرے بس میں تھی لیکن ملازمت ملنی تھی نہ ملی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پُراسرار غیبی قوت میرے اور ملازمت کے درمیان حائل ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ ویسے خدا کا شکر تھا کہ میرے اوپر کوئی بہت بڑی ذمہ داری نہیں تھی والد صاحب ریلوے سے ریٹائر تھے انہیں قلیل پنشن مل جاتی تھی جو اتنی ضرور تھی کہ اس سے آٹا اور دال خریدی جا سکے وہ اس قابل نہیں تھے کہ مزید کچھ کریں۔ گھر میں ضعیف والدہ اور ایک چھوٹی بہن کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ سب کی نظریں میری ملازمت پر لگی ہوئی تھیں۔ زندگی آٹے دال سے ہی تو نہیں گزر سکتی تھی۔ چنانچہ میں ملازمت کے حصول کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہر جگہ ناکامی میرا استقبال کرتی تھی۔ کبھی کبھی مایوسی کی زہریلی ہوا میرے قریب سے گزر جاتی تھی۔

لیکن ایسے اوقات میں میرے اصول مجھے اس ہوا سے محفوظ رکھتے تھے اور ابھی تک میں نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ میرا روزمرہ کا معمول تھا کہ کسی ریسٹوران میں جا کر اخبار میں 'ضرورت ہے' کے کالم دیکھتا اور کسی بھی ضرورت کی جگہ درخواست ارسال کر دیتا یہ درخواستیں میں نے درجنوں کی تعداد میں ٹائپ کر کے رکھی ہوئی تھیں۔

اس شام جب میں ملازمت کی تلاش میں حسب



معمول ناکام رہ کر گھر میں داخل ہوا تو خلاف معمول گھر والے قدرے بشاش تھے۔ والد صاحب قبلہ کے ہونٹوں پر سوکھی ہوئی سی مسکراہٹ تھی۔ رشیدہ کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں اور اماں جان کے چہرے پر بھی امیدیں جھلک رہی تھیں۔ گھر والوں کے اس موڈ سے مجھے بھی خوشی ہوئی اور میں نے دن بھر کی ناکامی کا بوجھ ہلکا محسوس کیا۔ باورچی خانے میں مسور کی دال کے 'سوپ' میں روٹی بھگو کر کھاتے ہوئے میں نے دبی زبان سے والدہ صاحبہ سے اس مسرت کی وجہ پوچھی۔ 'کھانا کھالو اس کے بعد تمہیں ایک خوشخبری سنائی جائے گی۔' والدہ صاحبہ نے جواب دیا اور اس خوشخبری کو جلد از جلد سننے کے لیے میں نے سامنے رکھی ہوئی روٹیاں اور دال چشم زدن میں صاف کر دیں اور پانی پینے کے بعد والدہ صاحبہ سے اس خوشخبری کا مطالبہ کیا۔

اس مطالبے کے جواب میں والد صاحب نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا جسے کھول کر پڑھ لیا گیا تھا۔ بہر حال مجھے اس کے پڑھے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے لفافے میں رکھا ہوا کاغذ نکال لیا۔ ایک نفیس لیٹر پیڈ تھا۔ جس پر ڈی ایم رانا لکھا ہوا تھا اس کے نیچے ٹائپ کی ہوئی تحریر تھی اور تحریر میرے لیے بے حد دل خوش کن تھی۔ تقریباً ایک ہفتہ قبل میں نے ایک اشتہار کے جواب میں درخواست بھیجی تھی اور یہ اس درخواست کا جواب تھا۔ مجھے اس ملازمت کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ درج ذیل پتے پر مسٹر رانا سے ملاقات کر لوں۔ ملاقات کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا تھا جس کا مقصد تھا کہ یہ ملاقات کسی بھی وقت کی جا سکتی ہے۔ دوسرے دن کا انتظار دوبھر تھا میں نے والدہ سے کہا کہ میں اسی وقت مسٹر رانا کے پاس جاؤں گا۔ والد صاحب نے کہا بھی کہ دوسرے دن صبح کو میں وہاں جاؤں لیکن میرے لیے کل تک کا انتظار مشکل تھا۔ چنانچہ مجھے اجازت مل گئی۔

میں نے جلدی جلدی شیو کیا، کپڑے دھونے کے صابن سے دوبارہ منہ دھویا، میری چھوٹی بہن نے جلدی جلدی میرے گرد آلود جوتے پر پالش کردی۔ اور دھوبی کے ہاں سے آئے ہوئے کپڑوں سے صاف بشرٹ اور پتلون نکال دی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد والد صاحب نے ایک پانچ کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھمایا اور میں والدین کی دعاؤں کے ساتھ دروازے سے باہر نکل آیا۔

''ٹوٹے دروازے۔'' جانے والی بس کی سیٹ پر بیٹھا میں اپنی ملازمت کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ خدا کرے میں ان لوگوں کی توقعات پر پورا اتروں۔ معمولی ملازمت بھی نہیں تھی بلکہ ایک بڑے آدمی کو سیکریٹری کی ضرورت تھی۔ اور یقیناً سیکریٹری کی حیثیت معمولی نہیں ہوتی۔

ٹوٹے دروازے کا علاقہ شہر کے انتہائی سرے پر تھا۔ اس کے بعد صنعتی علاقہ شروع ہوتا تھا۔ ویسے یہ علاقہ بھی رہائشی نہیں تھا بہت پرانی آبادی تھی جہاں اکا دکا بنگلے نظر آجاتے تھے اور ان بنگلوں میں سرپھرے ہی رہتے تھے۔ کیونکہ یہاں کوئی سہولت نہیں تھی۔ بازار میلوں دور تھے۔ بہرحال مجھے ان باتوں سے کیا سروکار ہوسکتا تھا میں بس کنڈیکٹر کی آواز پر نیچے اتر گیا۔ ٹوٹا دروازہ بنگلہ نمبر چھتیس میں نے زیرلب پتا دہرایا۔ اور گردن ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ اب مجھے ان بنگلوں میں بنگلہ نمبر چھتیس تلاش کرنا تھا۔ اس بنگلے کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ بنگلہ نمبر چوبیس کے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے میں نے بنگلہ نمبر چھتیس کا پتا پوچھا۔

''چھتیس نمبر۔'' چوکیدار نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کچھ سوچا۔ اور پھر گیٹ کے چند قدم باہر آکر بنگلوں کا حساب لگانے لگا۔ پھر چونک کر بولا۔ ''ٹھیک ہے وہی ہوسکتا ہے، مگر اس بنگلہ کا پتا آپ کیوں پوچھ رہے ہیں صاحب!''

''مجھے اس میں ڈی ایم رانا صاحب سے ملنا ہے۔''

''ڈی ایم رانا۔'' چوکیدار نے تعجب سے کہا مگر صاحب بنگلہ نمبر کوئی اور ہوگا۔ چھتیس نمبر میں تو کوئی بھی نہیں رہتا خدا جھوٹ نہ بلائے دس سال سے تو میں یہاں ہوں میں نے اس بنگلے میں کسی کو نہیں دیکھا۔''

''اور مجھے چھتیس نمبر بنگلہ ہی لکھا گیا ہے۔'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چھتیس نمبر وہی ہے صاحب۔ وہ جس کی دیوار پر سلاخیں ابھری ہوئی ہیں آپ دیکھ لیں ممکن ہے کوئی وہاں آگیا ہو۔'' چوکیدار نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ اور میں حیران سا آگے بڑھ گیا۔ لیکن اب میرے دل میں دھکڑ پکڑ ہورہی تھی۔ تمام امیدوں پر اوس پڑتی نظر آرہی تھی۔ اگر کسی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہو تو گھروالوں کے دمکتے ہوئے چہرے ماند پڑجائیں گے اور مایوس زندگی کو جو منزل کی جھلک نظر آئی ہے وہ وسیع ویرانوں میں گم ہوجائے گی۔ یاخدا ایسا نہ ہو میں نے صدق دل سے دعا مانگی اور آگے بڑھتا رہا۔

چھتیس نمبر چوبیس نمبر بنگلے سے ایک فرلانگ کے قریب تھا میں چند منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ گیٹ پر پیتل کی چھوٹی سی تختی لگی تھی جس پر ڈی ایم رانا لکھا دیکھ کر میں نے دل میں مسرت کی لہریں محسوس کیں۔

منحوس چوکیدار نے مجھے مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔ گدھا کہیں کا اسے کیا معلوم کہ اس کے اس مذاق نے میرے دل کی کیا حالت کردی تھی میں نے لباس درست کیا اور دھڑکتے دل سے مکین کے گیٹ پر دستک دی۔

گیٹ پر چڑھی ہوئی مٹی کی تہہ نیچے کھسکتی ہوئی نظر آئی اور میں بنگلے کے مکینوں کے بارے میں اندازہ لگانے لگا۔ نفاست پسند لوگ نہیں ہیں، شاید مفلوک الحال بھی ہوں کیونکہ بنگلے کی عمارت بالکل بوسیدہ تھی۔ بہرحال مجھے ان باتوں سے کیا غرض مجھے ملازمت چاہیے۔ اگر وہ مفلوک الحال بھی ہوتے تو سیکریٹری کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ ممکن ہے وہ لوگ صرف انٹرویو یہاں لینا چاہتے ہیں۔ میری دستک کے جواب میں ابھی کوئی تحریک نہیں ہوئی تھی چنانچہ میں نے دوبارہ دستک دی۔

پھر قدموں کی چاپ سنائی دی اور آخر گیٹ کی ذیلی کھڑکی جو زنگ آلود تھی تیز چرچروں کی آواز کے ساتھ کھل گئی سب سے پہلے مجھے جو چہرہ نظر آیا وہ بے حد کریہہ تھا۔ لمبوترہ چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن کی سفیدی دائروں سے باہر ڈھلک رہی تھی، ٹیڑھی ناک، چوڑی بدنما تھوڑی جس پر شیو خود رو گھاس کی طرح اُگی ہوئی تھی، میلے غلیظ دانت جو بڑے ہونے کی وجہ سے ہونٹوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ غرض کراہت کا جس قدر تصور ذہن میں آ سکتا ہے وہ اس شخص کے چہرے پر نمودار تھا۔ اوپر سے اس کی آواز۔

''کیا ہے؟'' اس نے پھٹے ڈھول جیسے بے سرے لہجے میں پوچھا۔ اور میں نے جلدی سے سلام داغ دیا۔ لیکن اس سلام کا جواب نہیں ملا۔ اور وہی سوال پھر دہرایا گیا۔

''میں رانا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنی سعادت مندی برقرار رکھی۔

''کیوں!'' وہی کرختگی۔

''رانا صاحب نے مجھے یاد کیا ہے۔ یہ دیکھو میری یہ درخواست کا جواب۔'' میں نے جیب سے کاغذ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ اور اس نے کاغذ پر ایک نگاہ دوڑائی۔ پھر پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا مجھے یہ بددماغ شخص بالکل برا نہ لگا۔ اس کی بددماغی کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ میں تو ہر حال میں ملازمت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک بار پھر مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کھڑکی بند کر رہا تھا۔ مجھے رُکے ہوئے دیکھ کر بولا۔

''سیدھے چلے جاؤ۔ رانا صاحب راہداری کے آخری کمرے میں ہوں گے۔'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور راہداری میں آگے بڑھ گیا۔ تمام کے تمام کمرے بوسیدہ تھے۔ صرف وہی کمرہ کچھ مناسب نظر آ رہا تھا۔ جہاں مجھے پہنچنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔ میں نے کمرے کے دروازے کو آہستگی سے دھکا دیا اور دروازہ کھل گیا۔

''میں اندر آ سکتا ہوں جناب۔'' میں نے انتہائی شائستہ لہجے میں پوچھا۔ اور اندر ایک نرم آواز ابھری۔

''تشریف لائیے۔'' اس آواز کی نرمی اور شرافت محسوس کر کے دل بڑھ گیا اور میں بے جھجک اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا ماحول باہر کے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔ کمرہ نہایت صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ فرش پر نرم اور قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر پرانے طرز کی تصویریں آویزاں تھیں۔ آبنوس کے فرنیچر سے پورا کمرہ سجا ہوا تھا۔ ایک طرف چند آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ انہی میں ایک کرسی پر ایک بھاری بھرکم شخص بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر نفیس قسم کا تھری پیس سوٹ تھا' ناک پر ایک عمدہ عینک بھی رکھی ہوئی تھی اور گھٹنوں پر ایک کھلی کتاب موجود تھی۔ جسے شائد اس نے پڑھتے پڑھتے رکھ دیا تھا۔ کمرے میں چونکہ تاریکی تھی اس لیے اس شخص کے سرہانے ایک میز پر اونچے شیڈ کا پرانے طرز کا لیمپ بھی رکھا تھا۔ جس کی روشنی نے کمرے کے ماحول کو اور خوشگوار بنا دیا تھا۔

اس نے ناقدانہ نظروں سے میرے چہرے کا اور پھر جسم کا جائزہ لیا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہوں تو آپ ہی مسعود صاحب ہیں۔''

''جی۔'' میں نے دل ہی دل میں اس کی قیافہ شناسی کی داد دی۔

''تشریف رکھیے۔'' اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اور میں شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا تعلیم ہے آپ کی؟''

''بی اے ہوں۔''

''خوب، شادی شدہ ہو؟''

''جی نہیں۔''

''اور کوئی ہے؟''

''جی والدین، اور ایک بہن۔'' میں نے جواب دیا۔

''بات یہ ہے مسعود صاحب کہ آپ کو قصبہ رتولی جانا ہوگا۔ داور محمود صاحب وہیں رہتے ہیں، رتولی کے بائیں سمت، پنڈت رام سرن کی دھرم شالہ ہے

اس کے پیچھے ان کی رہائش گاہ ہے۔ رتولی اسٹیشن پر اتر کر آپ کسی تانگے والے سے کہیں گے، تو وہ آپ کو رام سرن کی دھرم شالہ پہنچا دے گا۔ بس اس کے پیچھے پگڈنڈی پر چلے جائیے آپ کو دور ہی سے داور صاحب کی حویلی نظر آجائے گی۔ مگر ہاں میں آپ کو یہ سب کچھ قبل از وقت بتا رہا ہوں، پہلے تو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ اس ملازمت کو پسند بھی کریں گے یا نہیں۔"

میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا، کسی دوسری جگہ ملازمت کرنے کے بارے میں والدین سے کوئی اجازت نہیں لی تھی، لیکن اس بارے میں اجازت لینے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ بے روزگاری نے اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا کہ یہ ملازمت نعمت عظمیٰ معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"جی میں ان لوگوں کو چھوڑ کر رتولی جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے، آپ وہاں بہت خوش رہیں گے، کوئی خاص کام نہیں کرنا ہوگا، ان کے اہل خاندان میں سے ایک ہوں گے۔ ہاں تو آپ کیا تنخواہ قبول کریں گے؟"

"اس سلسلے میں فیصلہ آپ ہی صادر فرما دیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بھئی آپ معیاری انسان نکلے تو داور صاحب کو ہر تنخواہ منظور ہوگی۔ ویسے فی الحال پانچ ہزار روپے ماہور مناسب ہوں گے۔ یہ پانچ ہزار روپے آپ کے والدین کے لیے ہوں گے آپ کے تمام اخراجات داور صاحب کے ذمہ۔"

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔ میں تو ڈیڑھ دو ہزار کا منتظر تھا، پانچ ہزار تو میرے تصور میں بھی نہیں تھے، تاہم میں نے خود پر کنٹرول حاصل کیا اور بمشکل بولا۔

"مجھے منظور ہے جناب۔"

"خوب، ٹھیک ہے، تم خود کو داور صاحب کا سیکریٹری محسوس کرو۔ اور ہاں، یہ ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی قبول کر دتا کہ سفر کے انتظامات میں دقت نہ ہو۔ رتولی کب تک پہنچو گے؟"

"جی، دو دن کے اندر اندر۔" میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ یہ پانچ ہزار روپے پورے گھر کی قسمت بدل سکتے تھے۔

"میری طرف سے مزید دو دن، چوتھے دن تمہیں رتولی میں ہونا چاہیے۔"

"بہت بہتر۔" میں نے ادب سے جواب دیا۔ اور رانا صاحب کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ادب سے کھڑا ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ بات ختم ہو گئی ہے اور مجھے جانے کی اجازت ہے۔ میں بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ کریہہ صورت چوکیدار مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس وقت اس چوکیدار سے بھی عقیدت ہو گئی تھی جس کے بارے میں، میں نے سوچا تھا کہ اس کی شکل دیکھی ہے، ملازمت کیا ملے گی۔ بس اسٹاپ، میں دوڑتا ہوا پہنچا۔ میری خوشیاں عروج پر تھیں اور میں گھر کے دوسرے لوگوں کو بھی جلد از جلد ان مسرتوں سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔ بس میں بیٹھے ہوئے میں نے پانچ ہزار روپے کے نوٹ احتیاط سے رکھ لیے خدانخواستہ میری مسرتوں کو کوئی لوٹ نہ لے جائے۔ مجھے ڈرائیور کی سست رفتاری پر غصہ آ رہا تھا۔ کئی بار میں نے بس کا بٹن دبایا اور کنڈیکٹر مجھے بری نظروں سے گھورتا رہا۔

خدا خدا کر کے گھر پہنچا سب میرے منتظر تھے۔ میرے چہرے پر شادمانی دیکھ کر سب کے چہرے کھل اٹھے۔ اور میں نے جلدی سے پانچ ہزار روپے کے نوٹ نکال کر والدہ کے قدموں میں ڈال دیے۔ والدہ نے نوٹ دیکھے اور ان آنکھوں میں تشکر کے آنسو چھلک آئے۔ انہوں نے نوٹ اٹھا کے والد صاحب کو دیے اور خود وضو کرنے چلی گئیں۔ انہیں شکرانے کے نفل پڑھنے تھے۔ میں والد صاحب کو اپنی ملازمت کے بارے میں بتانے لگا۔ دوسری جگہ جانے کی خبر سن کر والد صاحب کے چہرے پر کچھ تفکر کے آثار ابھرے لیکن وہ مطمئن ہو کر بولے۔

غار

میں اپنی سالگرہ نہیں مناتا، لیکن ہر سال 25 دسمبر کو قائداعظمؒ کی سالگرہ ضرور مناتا ہوں۔ مجھ پر جتنے احسانات میرے عزیز واقارب، میرے احباب اور دوسرے مہربان افراد نے کیے ہیں، اُن میں سب سے بڑا احسان میرے قائداعظمؒ کا ہے جنہوں نے مجھے، آپ کو، ہم سب کو ایک آزاد وطن پاکستان دیا تاکہ ہم اور ہماری آنے والی نسلیں اس وطن میں آبرومندانہ زندگی بسر کرسکیں۔ میرا، آپ کا جنت نشاں وطن پاکستان! جس میں وہ سب کچھ ہے، جس کی تمنا کی جاسکتی ہے۔ رب کریم نے کتنی فیاضی سے پاکستان کو وہ سب کچھ عطا کردیا ہے جو اچھی انسانی زندگی کی ضرورت ہے۔

(سہام مرزا کی کتاب 'جاگتے رہنا' سے ایک اقتباس)

''ٹھیک ہے بیٹے، رتولی زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ مہینے میں ایک بار تو تم ضرور ہی آؤ گے۔''

''ضرور ابا جان۔ میں اپنی کارکردگی اور طرز عمل سے ان لوگوں کو اس قدر خوش کرلوں گا کہ مجھے یہ سہولت مل جائے گی۔''

والدہ بھی نماز پڑھ کر واپس آگئیں اور والد صاحب انہیں میری ملازمت کے بارے میں تفصیل بتانے لگے۔ والد صاحب کی طرح وہ بھی قدرے پریشان ہوئیں لیکن پھر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ قصبہ رتولی بہت زیادہ دور بھی نہیں تھا اور کسی بھی وقت وہاں سے واپس آیا جاسکتا تھا۔ بہرحال اس دن سے میری روانگی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اور تیسرے دن میں رتولی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اسٹیشن پر میرے والد، والدہ اور بہن چھوڑنے آئے تھے اور میں ان کی نیک دعاؤں کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ گیا۔ اب میں صرف اپنی ملازمت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے کیا کرنا ہوگا بہرحال میں بے حد پُرخلوص تھا اور پروگرام بنا رہا تھا کہ کسی کو اپنی طرف سے شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

خیالات کے ہجوم میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوسکا ٹرین کئی بار مختلف اسٹیشنوں پر رُکی اور پھر رتولی کا چھوٹا سا اسٹیشن آگیا۔ میں نے پلیٹ فارم پر لکھا ہوا بورڈ پڑھا اور جلدی سے اپنے چھوٹا اٹیچی لے کر نیچے اتر گیا میرے ساتھ دو تین آدمی اترے تھے۔ پلیٹ فارم کے باہر دو تین تانگے کھڑے تھے۔ جن کے گھوڑے مریل تھے تانگے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ تانگے والے بھوکی نظروں سے پلیٹ فارم سے نکلنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک تانگے والے کو اشارہ کیا اور اس نے تانگے سے کود کر میری طرف دوڑ لگائی اور پھر آتے ہی میرے ہاتھ سے اٹیچی چھین لی جیسے اسے خدشہ تھا کہ کوئی اور میری اٹیچی نہ اُچک لے۔

''کہاں جائیں گے بابو جی؟'' اس نے

کھکھیاتے ہوئے کہا۔

''مجھے رام سرن دھرم شالہ جانا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور تانگے والا ایک لمحے کے لیے چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''آیئے بابو جی۔'' اور میرا اٹیچی لے کر آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے تانگے پر بیٹھ گیا اور پھر میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

''کتنے پیسے لوگے بھائی؟''

''جو دل چاہے دے دیں بابو جی۔'' تانگے والے نے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔ اور تانگہ چل پڑا۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ فاصلے کا اندازہ کر کے پیسے دوں گا۔ تانگے والا غیر معمولی طور پر خاموش تھا، لیکن مجھے اس وقت اس کی خاموشی پر دھیان دینے کی فرصت کہاں تھی۔ میں تو اپنی ملازمت میں مگن تھا۔ دھرم شالہ اسٹیشن سے کافی دور نکلی، گھوڑا بھی سست رفتار تھا، اس نے یہاں تک پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ لگا دیا۔ ویسے دھرم شالہ ریتولی کے آخری مکان سے بھی کم از کم ڈیڑھ میل دور تھی۔ دھرم شالہ سے پچاس گز دور ہی تانگے والے نے تانگہ روک لیا۔

''وہ سامنے دھرم شالہ ہے بابو جی۔''

''چلو بھئی اس کے قریب چلو۔'' میں نے تانگے والے سے کہا۔

''بابو جی، جناور ڈر جائے گا، یہیں اُتر جائیں۔'' اس نے بدستور کھکھیاتے ہوئے کہا۔

میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن اس کے کھکھیائے ہوئے لہجے نے مجھ پر اثر کیا اور میں نیچے اُتر گیا اور پھر میں نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پوچھا۔ تانگے والے کے منہ سے دعاؤں کی بھرمار ہوگئی۔ میں نے اس کے چہرے پر وہی خوشی دیکھی تھی جو مجھے پانچ ہزار روپے اور ملازمت ملنے کے بعد ہوئی تھی۔ بہر صورت میں اپنا اٹیچی لے کر چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد دھرم شالہ کے قریب تھا۔ میرا خیال تھا کہ دھرم شالہ میں کوئی ہوگا لیکن دھرم شالہ ویران پڑی تھی۔ پکی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی یہ عمارت انتہائی بدرونق اور بھیانک نظر آتی تھی۔ صحن میں پیپل کا درخت تھا جس کے پیلے سوکھے پتے پورے صحن میں بچھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بے نور عمارت سے خوف کا احساس ہوا۔ اور میں نے اپنے خوف کو دور کرنے کے لیے زور سے آواز دی۔

''کوئی ہے؟''

میری آواز کی بازگشت دیر تک گونجتی رہی اور پھر دھرم شالہ کا کہن سال دروازہ کھلا اور ایک فٹ بال نما چہرہ نظر آیا۔ یہ ایک موٹا تازہ ہندو تھا جس کے چہرے پر بال کا نام و نشان نہ تھا۔ بھنویں تک منڈی ہوئی تھیں۔ صرف سر کی پشت پر ایک چوٹی نظر آ رہی تھی۔ اوپری جسم ننگا تھا اور گردن میں جنیئو پڑا ہوا تھا۔ اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا اور بولا۔

''کیا بات ہے؟''

''داور محمود کی حویلی کس طرف ہے؟'' میں نے پوچھا اور اس نے متنفرانہ انداز میں پیچھے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پھر کچھ کہے بغیر دروازہ بند کر لیا۔ میں نے شانے ہلائے اور دھرم شالہ کے پیچھے کی طرف چل پڑا۔ یوں بھی رانا صاحب نے پتا بتا دیا تھا۔ دھرم شالہ کے عقب میں ایک پگڈنڈی صاف نظر آ رہی تھی۔ اور پگڈنڈی کے اختتام پر وہ سیاہ حویلی نمایاں تھی۔ اگر میں کسی سے نہ پوچھتا تب بھی وہ حویلی مجھے نظر آ جاتی۔ میں اطمینان سے حویلی کی طرف چل پڑا۔ خاصی دور تھی۔ پگڈنڈی کے دونوں سمت سرسوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے ان پر کھلے پیلے پھول بہت پسند آئے اور میں ان سے لطف اندوز ہوتا آگے بڑھتا رہا۔ اور اب حویلی صرف چند گز دور تھی۔ میں نے رُک کر ناقدانہ نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔ سرمئی رنگ کی پتلون اور کریم کلر ہاف آستین بشرٹ میں، میں خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ بے روزگاری نے کس بل نکال دیے تھے۔ ورنہ بچپن ہی سے اچھا پہننے کا شوق تھا۔ چند لمحات کے بعد میں حویلی کے گیٹ پر تھا۔

عظیم الشان گیٹ سنسان پڑا تھا۔ دور دور تک کسی کا پتا نہیں تھا۔ میں نے ہمت کر کے گیٹ کی کھڑکی سے اندر قدم رکھ دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ باہر سے یہ حویلی پرانی اور بد رونق نظر آتی تھی، لیکن اندر سے کافی صاف ستھری اور شاندار تھی۔ گیٹ سے لے کر اندرونی صدر گیٹ تک مہندی کی باڑھ چلی گئی تھی جسے نفاست سے تراشا گیا تھا۔ میں باڑھ کے درمیان چلتا ہوا صدر گیٹ کی طرف جانے لگا اور پھر میں باڑھ کے اختتام تک پہنچا ہی تھا کہ کوئی اچھل کر میرے سامنے آیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک آواز نکلی۔

''ہاؤ۔''

اور میں سچ مچ اچھل پڑا۔ اس ویران اور پُر اسرار ماحول میں یہ آواز مجھے بے حد خوفناک لگی تھی لیکن پھر کانوں میں شہد گھل گیا۔ ایک مترنم قہقہہ گونج اٹھا تھا۔

''ڈر گئے۔'' وہ بے تحاشا ہنستے ہوئے بولی۔ اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس پُر اسرار ماحول میں اس الٹرا ماڈرن لڑکی کی موجودگی میرے لیے سخت حیرت کا باعث تھی۔ اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گھٹنوں سے اونچے اسکرٹ میں اس کا حسین سڈول جسم بے حد دل کش نظر آ رہا تھا خدوخال بے حد دلکش اور دل موہ لینے والے تھے اور چہرے پر معصوم سی معصومیت تھی۔ ہنسنے سے اس کے گالوں میں باریک گڑھے پڑ جاتے تھے جو اس کی دلکشی میں اور اضافہ کر دیتے تھے۔ اس وقت بے تحاشہ ہنسنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے معصومانہ انداز میں چہرے پر بکھرے ہوئے بال سمیٹے اور ہنسی روک کر بولی۔

''میں نے تمہیں دور سے ہی دیکھ لیا تھا اور اسی وقت فیصلہ کیا تھا کہ تمہیں ڈراؤں گی۔''

''میں سچ مچ ڈر گیا تھا خاتون۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''خاتون۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''میرا نام خاتون نہیں، شمسہ ہے شمسہ۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''مسعود۔'' میں نے جواب دیا۔

''خوب، یہاں کیوں آئے؟''

''مجھے ڈی ایم رانا صاحب نے بھیجا ہے۔ داور محمود صاحب سے ملنا ہے۔''

''ڈی ایم رانا نے بھیجا ہے اور داور صاحب سے ملنا ہے۔'' وہ بولی اور ہنس پڑی۔ کافی دیر تک ہنستی رہی۔

گو اس کی ہنسی بے محل تھی اور مجھے اُلجھن سی ہو رہی تھی، لیکن اس ہنسی کے حسن سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔

''اگر تکلیف نہ ہو محترمہ شمسہ تو مجھے داور محمود صاحب کے پاس لے چلیں۔'' میں نے درخواست کی۔

''آؤ۔''

اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیٹنے والے انداز میں لے کر چل پڑی۔ میں کچھ جھجک محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کی بے تکلفی میری ملازمت کے لیے خطرہ نہ بن جائے، لیکن ابھی مجھے اس کی پوزیشن بھی نہیں معلوم ہوئی تھی۔ مالکان کے تو ایک ایک فرد کا خیال رکھنا پڑتا ہے، چنانچہ میں نے تعرض نہیں کیا۔ وہ گیٹ کے اندر داخل ہو کر ایک راہداری میں چلتی رہی اور پھر ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئی۔ اس نے بے تکلفی سے دروازہ کھولا اور ہنستی ہوئی بولی۔

''لیجیے ڈیڈی، اپنے مہمان کو وصول کیجیے انہیں ڈی ایم رانا نے بھیجا ہے اور داور محمود سے ملنا چاہتے ہیں۔''

میں چونکہ روشنی سے اس تاریک کمرے میں آیا تھا، اس لیے ایک لمحے کے لیے آنکھوں میں اندھیرا چھایا رہا۔ اور جب میں دیکھنے کے قابل ہوا، تو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

یہ ڈی ایم رانا تھا۔ وہی شخص جو مجھے میرے شہر میں ملا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''آؤ مسعود! تم شمسہ کے ہاتھ کیسے لگ گئے؟'' اس نے اپنائیت کے لہجے میں کہا۔

میں نے اٹیچی ایک طرف رکھ دی اور اسے سلام

کر کے آگے بڑھ آیا۔"

"بیٹھو بھئی، دراصل میرا نام ہی داور محمود رانا ہے۔ یعنی ڈی ایم سے داور محمود بنتا ہے۔" اور میری سمجھ میں لڑکی کی ہنسی آگئی۔ وہ اب بھی ایک دیوار سے لگی ہوئی ہنس رہی تھی۔

"تھینک یو شمسہ۔" داور محمود نے کہا۔

"تم جاؤ میں ان سے گفتگو کروں گا۔"

"پرائیویٹ گفتگو ہے ڈیڈی۔ میں خود بھی یہاں بیٹھنا چاہتی ہوں۔" لڑکی ضدی لہجے میں بولی۔ اور داور ہنسنے لگا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے، بیٹھو۔" اور لڑکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم بھی بیٹھو مسعود۔" اور میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہم نے سیکریٹری کے لیے اشتہار دیا تھا نہ شمسہ بیٹے، میں نے مسعود صاحب کو بہ حیثیت سیکریٹری رکھ لیا ہے۔ اب تمہاری تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔"

"اوئی ونڈر فل ڈیڈی، آپ نے بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔" شمسہ نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا اور جلدی سے بولی۔ "آپ کو بلیرڈ آتی ہے مسعود صاحب۔"

"نہیں آتی ہو، تو تم سکھا دینا۔" داور محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور وہ بھی مسکرانے لگی۔ "فی الحال تمہارے لیے کوئی کام نہیں ہے مسعود میاں، یہاں عیش و آرام سے رہو۔ کوئی تکلیف ہو تو فوراً بتا دینا۔ جب کوئی کام ہوگا۔ تو میں تمہیں اطلاع دے دوں گا گھر کے دوسرے لوگوں سے بھی تمہاری ملاقات کرا دی جائے گی۔ شمسہ تم انہیں ان کا کمرہ دکھا دو۔"

"اور وہ گفتگو ڈیڈی جو آپ ان سے کرنے والے تھے؟"

"وہ کوئی خاص نہیں تھی، بس رسمی سی باتیں تھیں جو کسی وقت بھی ہو جائیں گی۔ اور کے مسعود۔" داور نے کہا اور میں جلدی سے کھڑا ہو گیا میں نے آگے بڑھ کر اپنی اٹیچی اٹھائی اور شمسہ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح اچھلتی جا رہی تھی اور اس کی ادائیں بے حد بھا رہی تھیں۔ ان تمام حرکتوں میں معصومیت تھی، حالانکہ اس کی عمر انیس سال سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔

پوری حویلی آرائش کے سامان سے آراستہ تھی۔ میرے لیے جس کمرے کا بندوبست کیا گیا وہ بھی قیمتی فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ میں نے ایسے کمرے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بہرحال میں اس کمرے میں مقیم ہو گیا۔ شمسہ ابھی تک میرے کمرے میں تھی۔ اور مجھے حویلی کے نقشے سے آگاہ کر رہی تھی۔ پھر بولی۔

"ڈیڈی کو آپ سے کوئی کام نہیں ہو سکتا، دراصل میں تنہائی سے گھبراتی تھی اس لیے انہوں نے آپ کو صرف میرے لیے ملازم رکھا ہے۔ بہرحال جب تک انہیں آپ سے کام نہ ہو، آپ میرے ساتھ رہیں گے، میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو قطعی بور نہیں کروں گی۔ آپ کو میرے ساتھ بلیرڈ کھیلنا ہوگا۔ میں آپ کو کھیل کے اوقات سے بہت جلد مطلع کر دوں گی۔ اب میں چلتی ہوں، آپ آرام کریں۔" اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کمرے سے نکل گئی۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر ایک آرام کرسی میں دراز ہو کر قصبے سے دور اس پُراسرار حویلی کے اس خوبصورت ماحول پر غور کرنے لگا۔ سونا سونا ماحول بہت دلکش لگ رہا تھا۔ یہاں کس قدر سکون تھا۔ حویلی میں شاید بہت کم لوگ رہتے تھے۔ ابھی تک میں نے رانا صاحب اور شمسہ کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا تھا ویسے شمسہ کی شخصیت بڑی پُرسحر تھی۔ وہ کس قدر معصوم اور الہڑ تھی، کتنی بے تکلف۔ کیا یہ بات درست تھی کہ محمود رانا نے مجھے اس کا دل بہلانے کے لیے ملازم رکھا تھا، لیکن اس کے لیے ایک نوجوان لڑکا ہی کیوں، کوئی عورت بھی رکھی جا سکتی تھی۔ بظاہر کوئی ایسا کام بھی نظر نہیں آتا تھا جس کے لیے رانا صاحب کو کسی سیکریٹری کی ضرورت پیش آئے۔ میں غور کرتا رہا۔ اور میرے لیے شام کی چائے آ گئی۔ ایک ملازمہ تھی جو خود بھی نوجوان تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جس میں چائے کے برتنوں کے ساتھ ڈرائی فروٹس کی



پلیٹ بھی تھی۔ ملازمہ چائے رکھ کر خاموشی سے چلی گئی۔ اور میں سنبھل گیا یہ میرے ساتھ ملازمانہ برتاؤ کا پہلا مظاہرہ تھا مجھے چائے میں اپنے ساتھ شریک نہیں کیا گیا تھا اور یہ بات اچھی ہی ہوئی۔ اس ماحول نے مجھے بھٹکا دیا تھا لیکن اس چائے نے میرے حواس درست کردیے اور مجھے احساس ہوا کہ مجھے کھال ہی میں رہنا چاہیے۔ شمسہ کی بے تکلفی اور التفات سے کوئی غلط نتیجہ نہیں اخذ کرنا چاہیے اور اس سے مالک کی لڑکی کے تصور کے ساتھ ہی ملنا چاہیے۔

تقریباً چھ بجے شمسہ میرے کمرے میں گھس آئی۔

''آیئے مسعود صاحب، میں آپ کو بلیرڈ سکھاؤں گی۔''

اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھے کوٹھی کے ایک دور افتادہ حصے میں لے گئی۔ اور اب مجھے کئی ملازم اور دوسرے لوگ نظر آئے۔ سب خاموشی سے اپنے اپنے کاموں میں معروف تھے۔ بلیرڈ روم کافی کشادہ تھا اور وہاں اعلیٰ درجے کی بلیرڈ ٹیبل پڑی ہوئی تھی۔ میں اس کھیل میں اناڑی تھا۔ اور شمسہ کافی ماہر، وہ میرے اناڑی پن پر ہنستی رہی اور مجھے کھیلنا سکھاتی رہی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے حیرت سے کہا۔

''آپ تو حیرت انگیز طور پر ذہین ہیں، بڑے اچھے شارٹ لگا رہے ہیں۔'' اور پھر کھیل میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ہم دو گھنٹے تک کھیلتے رہے۔ پھر شمسہ ہی اکتا گئی۔ میرے اوپر تو اس کی معیت کا سحر ہی طاری تھا۔ چنانچہ میں نے بالکل تھکن محسوس نہیں کی۔ اس نے بلیرڈ روم سے نکلتے ہوئے کہا۔

''طویل عرصے کے بعد میں نے خوشی محسوس کی ہے، درحقیقت میں بہت خوش ہوں، اب کل ملاقات ہوگی۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے کہا اور شمسہ مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے آئی۔ رات کے آٹھ بجے کھانا آ گیا۔ یہ کھانا بھی خاصا پُرتکلف تھا۔ لیکن میں نے تنہائی پھر بھی محسوس کی اور دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔ یہاں ملازمت کرنے آیا ہوں مہمان نہیں آیا۔

وقت گزرتا رہا۔ اب میں یہاں کی محدود زندگی کا عادی ہوگیا تھا لیکن مجھے شدید حیرت تھی۔ یہ کیسی ملازمت تھی معلوم ایسا ہی ہوتا تھا جیسے مجھے صرف شمسہ کا دل بہلانے کے لیے بلایا گیا ہو۔ داور محمود سے میری دو تین بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے ابھی تک مجھے کوئی کام نہیں دیا تھا جبکہ میں سیکریٹری ان ہی کا تھا بہرحال جب مالکان کی یہی خواہش تھی تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ویسے ماحول کا عادی ہوجانے کے باوجود یہاں کی کچھ باتیں ابھی تک میری سمجھ سے باہر تھیں۔ یہ لوگ نہ کہیں جاتے تھے نہ کوئی ان سے ملاقات کرنے آتا تھا۔ لیکن بعض اوقات جب میں اپنے کمرے میں ہوتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے پوری کوٹھی ویران پڑی ہو۔

یہاں میرے علاوہ کسی ذی روح کا وجود نہ ہو۔ ایک بار میں اس کا تجربہ بھی کرچکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت کوٹھی میں کوئی نہیں ہے۔ میں اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اور درحقیقت پوری کوٹھی میں مجھے ایک فرد بھی نظر نہیں آیا۔ تھک ہار کر میں اپنے کمرے میں بند ہوکر ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کھیل کے وقت شمسہ میرے کمرے میں پہنچ گئی اور میں نے اس سے پوچھا۔

''سب لوگ کہاں چلے گئے تھے؟''

''اپنے اپنے کمروں میں ہوں گے، کیوں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''لیکن مجھے تو کوئی نہیں ملا۔''

''کیا تم نے تلاش کیا تھا؟'' شمسہ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا اور شمسہ کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نظر آئی پھر اس نے خود کو سنبھال کر مسکراتے ہوئے کہا کہ آج وہ مجھ سے زبردست مقابلہ کرے گی۔ میں نے بھی زیادہ چھان بین مناسب نہیں سمجھی۔ لیکن میرے ذہن میں ایک چبھن سی پیدا ہوگئی تھی۔ میں بلیرڈ میں شمسہ کا ذرا بھی مقابلہ نہ کرسکا اور بہت جلد ہار گیا۔ شمسہ بھی میری اس کیفیت کو سمجھ رہی تھی، چنانچہ ایک دو گیم کے بعد ہی اس نے اسٹک رکھ دی۔

''اب کل کھیلیں گے، میرا خیال ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اوں، ہاں شمسہ کچھ گرانی محسوس کر رہا ہوں۔''

اور شمسہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں مسعود۔''

''شکریہ شمسہ، تمہاری یہ ہمدردی میرے لیے کافی ہے۔'' میں نے جذبات ممنونیت سے کہا۔ یہ حقیقت تھی، بہرحال وہ لوگ میرے آقا تھے اور میں ملازم وہ جس ہمدردی سے میرے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکتا تھا۔ شمسہ کافی دیر تک میرے پاس بیٹھی گفتگو کرتی رہی۔ آج میں نے اس کے انداز میں ایک خاص بات دیکھی تھی۔ عام دنوں میں ایک الہڑ شمسہ تھی۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے اپنے دل شکن حسن اور قیامت خیز جسم کی محشر سامانیوں کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ وہ بیباکی سے اپنے جسم کے پوشیدہ حصے عریاں کردیتی تھی اور ایسے موقعوں پر میں ہی نظریں جھکا لیتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ فطرتاً معصوم ہے، لیکن آج اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت انگڑائی لیتے دیکھی تھی۔

''شکریے کی ضرورت نہیں ہے مسعود۔ میں تمہارے اس قدر قریب آ گئی ہوں کہ اب میں تمہاری کسی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتی ہوں، میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میں۔'' اس نے گردن جھکا لی۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ شمسہ کے لیے میرے دل میں بھی پسندیدگی کے جذبات تھے۔ بحیثیت لڑکی میں نے اسے بغور دیکھا تھا اور دل کے گوشوں میں اس کے حسن کے نقوش محفوظ کرلیے تھے، لیکن اس سے آگے بڑھنے کے معاملے میں، میں نے دل سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ میں نے خود سے کہا تھا کہ مجھے اپنی حیثیت سے نہ بڑھنا چاہیے میں ملازمت کرنے آیا ہوں، ملازمت کروں اور بس۔ اگر میری کسی حرکت سے یہ ملازمت بھی چھوٹ گئی تو اس کے بعد کا تصور بے حد خوفناک تھا۔

چنانچہ شمسہ کے ان لفظوں میں کھو جانے کے بجائے میں نے خود کو سنبھالا اور بولا۔ ''میں محسوس کرتا ہوں محترمہ شمسہ، آپ بے حد مہربان اور صاف دل خاتون ہیں، میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں۔''

شمسہ نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، صرف عزت اور میں ان نظروں کے جواب میں آنکھیں جھکا لینے کے علاوہ کچھ نہ کرسکا۔ شمسہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔ لیکن اس رات میں سکون سے نہ سو سکا۔ شمسہ کی آج کی کیفیت جہاں میرے دل کو گدگدا رہی تھی، وہیں مجھے اپنے مستقبل کا بھی خوف تھا۔ میں ان نوجوانوں میں سے تھا جنہیں حالات کے تھپیڑوں نے رومان کی وادیوں کی طرف بھٹکنے بھی نہیں دیا تھا۔ میں نے محنت و مشقت میں آنکھ کھولی تھی اور اس کے بعد حالات حد سے بدتر ہوتے گئے۔ میرے اوپر جوان بہن کی ذمہ داری تھی۔ بوڑھے والدین کا احساس تھا۔ رومان جیسی چیزوں کی میری زندگی میں گنجائش نہیں تھی۔ لیکن میں فطرت کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ میں نے خود کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن شمسہ کے الفاظ نے میرا سکون چھین لیا۔ میرا دل چیخ چیخ کر اپنا حق طلب کر رہا تھا۔ اور وہ رات سخت کشمکش میں گزری، لیکن دوسری صبح میں پُرسکون تھا۔

اس روز میری محمود رانا صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے۔

''بیٹھو مسعود۔'' انہوں نے نرم آواز میں کہا اور میں شکریہ ادا کرکے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم بھی سوچتے ہو گے یہ کیسی ملازمت ہے نہ کام نہ کاج۔ میرا خیال ہے میں اس سلسلے میں وضاحت کردوں گا۔'' میں خوفزدہ نظروں سے رانا صاحب کو دیکھنے لگا۔

''گھر کے ماحول پر جمود سا طاری ہو گیا ہے۔ دوسرے تمام لوگ تو اپنے اپنے کاموں میں معروف ہیں، لیکن شمسہ نوجوان ہے، اس کے ذہن میں ابھی بچپن ہے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں، چنانچہ صحیح معنوں میں، میں نے تمہیں اسی کے لیے رکھا ہے مجھے مسرت ہے کہ تم نے شمسہ کی توقعات پوری کردی ہیں، میں اسے خوش دیکھ رہا ہوں۔ میں چاہتا

ہوں کہ وہ ہمیشہ اسی طرح خوش رہے اور یہی تمہاری ذمہ داری ہے۔ ویسے شمسہ کی سفارش پر تمہاری تنخواہ ڈبل کردی گئی ہے۔ یعنی اب تم دس ہزار روپے ماہوار وصول کرو گے۔''

میرا خوف مسرت میں تبدیل ہوگیا لیکن اس کے ساتھ ایک خلش سی تھی۔ شمسہ نے کل جس خیال کا اظہار کیا تھا اگر میں اس کی پذیرائی کرتا تو غداری کا مرتکب ہوتا۔ اس سلسلے میں رانا صاحب سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس میں میرے دو نقصان تھے۔ رانا صاحب مجھے ملازمت سے فوراً نکال سکتے تھے۔ اور پھر شمسہ کی سفارش بھی کام نہ آتی مجھے صرف اپنی ملازمت بچانی تھی، اس لیے میں خاموش ہی رہا اور رانا صاحب نے مزید کچھ گفتگو کے بعد مجھے رخصت کردیا۔

اس شام شمسہ میرے پاس نہیں آئی، ورنہ روزانہ وہ مجھے بلانے آجاتی تھی۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ اور جب خاصی دیر گزر گئی، تو میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ اور جب خاصی دیر گزر گئی تو میں خود اس کی طرف چل پڑا۔ شمسہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا بلیرڈ روم کی طرف پہنچا۔ شمسہ وہاں موجود تھی۔ وہ بلیرڈ ٹیبل سے ٹکی ہوئی خلاء میں گھور رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چونک پڑی، اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار تھے۔

''مس شمسہ۔'' میں نے اسے آواز دی اور وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''آپ ناراض ہیں۔'' میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا اور میرے لہجے کی لرزش نے شاید اسے متاثر کیا۔

''ہاں......'' وہ بولی۔

''میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مس شمسہ۔''

''کس بات کی؟'' وہ بدستور سنجیدگی سے بولی۔

''میری جس بات سے بھی آپ ناراض ہوئی ہیں۔''

''میں ناراض نہیں ہوں مسعود صاحب۔ میں تو، میں تو سوچ رہی تھی کہ، میں تو...... اپنی شکست پر شرمندہ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کسی اور کو پسند کرتے ہیں۔ مجھے خود پر افسوس ہے کہ میں نے یہ معلوم کیے بغیر آپ کو کیوں پسند کیا۔ میں اپنے آپ پر شرمندہ ہوں۔''

''مس شمسہ۔ میری زندگی محرومیوں کی داستان ہے۔ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی۔ اس میں رومان کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے اب تک جدوجہد میں وقت گزارا ہے، چنانچہ کسی اور کو پسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے پہلی بار پسند کے الفاظ سے آشنا کرایا ہے۔ میں اس بات پر اپنی قسمت پر نازاں ہوں، لیکن میری محرومیاں مجھے خوفزدہ کررہی ہیں۔ پورے ایک سال کے کرب کے بعد آپ لوگوں کی خوشگوار چھاؤں ملی ہے۔ میں اس سائے سے محروم نہیں ہونا چاہتا، لکھوں کی برابری کی کوشش نے آج تک کسی کو کچھ نہیں دیا ہے۔ میری بے بسی مجھے مجبور کررہی ہے، ورنہ میرے ذہن میں آپ کے نقوش جڑ پکڑ چکے ہیں۔'' شمسہ میرے الفاظ سمجھنے کی کوشش کررہی تھی اور جب وہ میری بات سمجھ گئی تو اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔

''ڈیڈی نے شاید یہ بات آپ کو نہیں بتائی کہ انہوں نے میری تنہائی دور کرنے کے لیے آپ کو بلایا ہے۔ ہم سب لوگ آپ کو پسند کرتے ہیں اور ڈیڈی کو ہمارے کسی بھی معاملے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ میرا قول ہے۔ اگر آپ ملازمت کی طرف سے خوفزدہ ہیں تو میں اس کی ضمانت دیتی ہوں۔ ویسے بھی آپ کی پریشانیاں دور کرنا ہمارا فرض ہے۔ آپ نے آج تک اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کی تھی۔''

''اگر یہ بات ہے شمسہ تو مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ میں دل کی گہرائیوں سے آپ کو پسند کرتا ہوں۔'' میں نے نہ جانے کس طرح یہ الفاظ ادا کیے اور شمسہ بے خود ہوگئی۔ اس کے خوبصورت بال میرے سینے پر پھیل گئے اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ کئی منٹ بے خودی کے عالم میں گزر گئے پھر وہ سنبھل کر بولی۔

''آیئے، پھر کھیل ہوجائے، آج میں دل سے

کھیلوں گی۔''

''میں کھیل سے قبل ہار تسلیم کرتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''آپ سے ہار کر جس قدر خوشی ہوتی ہے جیت کر نہیں۔ جیتنے کے بعد آپ کے رخساروں کی شفق دنیا کا سب سے حسین نظارہ ہوتی ہے۔''

''بڑی خوبصورت باتیں کرتے ہیں آپ، آیئے۔'' اور کھیل شروع ہو گیا۔ کھیل شروع ہوئے ایک ماہ گزر گیا دس ہزار روپے میرے گھر پہنچ گئے تھے جس کی رسید مجھے دے دی گئی۔ میں نے اپنے والدین سے ملنے کے لیے چھٹی مانگی جو رانا صاحب نے منظور کر لی۔ لیکن شمسہ کو میری جدائی گوارا نہیں تھی۔ اور میں بھی اسے نہ چھوڑ سکا۔ ویسے اس نے درست کہا تھا۔ حویلی کے کسی بھی فرد کو ہم لوگوں سے کوئی بھی سروکار نہیں تھا۔ سب بے تعلق تھے۔ سب گم سم، خاموش، وہ مجھے نظر ہی بہت کم آتے تھے سب اپنے اپنے کمروں میں رہتے تھے، کوئی ضرورت ہوئی تو باہر نکل آئے ورنہ۔ میرے لیے وہی اصول برقرار تھا۔ تینوں وقت ناشتہ کھانا اور چائے وغیرہ میرے کمرے میں ہی آجاتی تھی۔ کبھی میں نے کسی کو حویلی سے باہر جاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں شاید کافی مقدار میں موجود تھیں۔ شمسہ میرے بہت قریب آ گئی تھی۔ اور اب ہمارا تمام دن ہی ساتھ گزرتا تھا۔ اس وقت جب ملازمہ میرے لیے کھانا لائی تو شمسہ میرے کمرے میں ہی موجود تھی۔ ملازمہ کھانا رکھ کر چلی گئی۔ پھر شمسہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم کھانا کھاؤ، کھانے کے بعد میں آؤں گی۔'' شمسہ نے کہا۔

''شمسہ۔'' میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت کہا۔ اور وہ رک گئی۔

''شمسہ تم نے میرے اور اپنے درمیان تمام تکلفات دور کر دیے ہیں، لیکن ایک تکلف ابھی قائم ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس وقت ہم دونوں ساتھ ہی کھانا کھائیں۔'' میری دانست میں یہ معمولی بات تھی اور مجھے یقین تھا کہ شمسہ میری بات فوراً مان لے گی۔ لیکن میں نے دیکھا شمسہ کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ وہ عجیب انداز میں میری شکل دیکھ رہی تھی اور میں اس کی حالت پر حیران تھا۔

''اگر میں اس سے انکار کر دوں تو تمہیں دکھ ہوگا مسعود؟''

''ہاں شمسہ، میں دوسرے لوگوں کے لیے تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن تم پر تو اب میرا حق ہو گیا ہے۔ میں تمہیں اس کے لیے مجبور کر سکتا ہوں۔''

''تمہیں میرے اوپر پورا پورا حق ہے مسعود۔ لیکن تمہیں اس حق کا خراج ادا کرنا ہوگا۔ میں آج رات تمہیں تفصیل سے آگاہ کر دوں گی اور آج رات تم ہمیشہ کے لیے میرے ہو جاؤ گے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی۔''

میں شمسہ کی بات نہیں سمجھ سکا تھا، چنانچہ میں بولا۔

''میں ہر خراج ادا کرنے کو تیار ہوں، لیکن اس وقت تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانا ہوگا۔''

''ہم لوگ کھانا نہیں کھاتے مسعود، ہم میں سے کوئی کچھ نہیں کھاتا، اس گھر میں کھانا صرف تمہارے لیے آتا ہے۔ ہم اس چکر سے مبرا ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور میں شمسہ کے چہرے پر سنجیدگی تلاش کرنے لگا۔ ظاہر ہے یہ بات عقل سے باہر تھی۔

''میں نہیں سمجھ سکا۔'' آخر میں نے کہا۔

''میری درخواست ہے، اس وقت کچھ نہ سمجھو، کھانا کھا لو، میں گیارہ بجے تمہارے پاس آؤں گی اور پھر ہماری زندگی کا نیا دور شروع ہو جائے گا۔ ایک ایسا دور جس میں شادمانیاں ہوں گی، اجازت دو مسعود صرف گیارہ بجے تک کے لیے، پلیز!'' اور وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گئی۔ میں کافی دیر تک انتظار کرتا رہا، لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہ لوگ کھانا نہیں کھاتے، پھر زندہ کیسے ہیں، میں نے سوچا اور پھر میں نے اس بات کو شمسہ کی ظرافت پر محمول کیا۔ وہ بعض اوقات سنجیدگی سے مذاق کرتی تھی اور مجھے زچ کر دیتی تھی۔

مجھے گیارہ بجنے کا بے چینی سے انتظار تھا گھڑی کی

سوئیاں جیسے جامد ہوگئی تھیں۔ خدا خدا کر کے گیارہ بجے، شمسہ نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر آگئی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی۔ اندر آکر اس نے دروازہ بند کرلیا اور میری طرف بڑھی حسب معمول اس کے جسم پر ایک چست اسکرٹ تھا۔ جو گھٹنوں سے اونچا تھا اور اس کی سڈول رانیں نمایاں تھیں۔ خاص انداز میں تراشے ہوئے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے، لیکن اس وقت صرف ایک بات مختلف اور میرے لیے حیرت انگیز تھی، اس کی کمر میں بندھی ہوئی پیٹی میں ایک لمبا اور نوکدار خنجر اڑسا ہوا تھا جس کی ضرورت میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ تاہم میں سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔

''مسعود۔'' اس کی سرسراتی آواز سنائی دی۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

''بے پناہ۔''

''میری محبت کا خراج ادا کرو گے؟''

''دل و جان سے۔''

''وعدہ کرتے ہو؟''

''وعدہ۔''

''مجھے تم پر اعتماد ہے میرے محبوب، اور میں آج اپنے راز سے تمام پردے ہٹا رہی ہوں۔ آج میں تمہیں ہمیشہ کے لیے حاصل کرلوں گی اور ہمارے درمیان کوئی دوری نہیں رہے گی، کیا تم اس کے لیے تیار ہو۔''

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے ڈارلنگ۔'' میں نے محبت سے کہا۔

''تو سنو، آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی بات ہے قصبہ رتولی اس وقت قصبہ نہیں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور یہ گاؤں میرے ڈیڈی یعنی داور محمود کی ملکیت تھا۔ ہم لوگوں نے گاؤں سے باہر یہ خوبصورت حویلی بنوائی تھی۔ میں نے شہر میں زندگی گزاری تھی اور اس وقت میں انیس سال کی تھی جب گرمیوں کی چھٹیوں میں، میں شہر سے یہاں آئی مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اچانک گاؤں میں پلیگ پھیل گئی۔ ہمارا گھرانہ پلیگ کا شکار ہوگیا اور ہم سب چند گھنٹوں کے فرق سے مرگئے۔ امدادی جماعتیں جب یہاں پہنچیں تو گاؤں میں چند افراد ہی زندہ بچے تھے۔ پھر یہ گاؤں بالکل اُجڑ گیا اور پورے بیس سال کے بعد یہ دوبارہ آباد ہوا۔ جو اب ایک قصبے کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ ہم لوگ اسی وقت سے اس عمارت میں رہتے ہیں، باہر کی دنیا سے الگ تھلگ، کیونکہ اب زندہ لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں زندگی سے کچھ نسبت ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کچھ نہیں کھاتے پیتے۔ میں نوجوان مری تھی۔ میرے دل میں آرزوئیں تھیں اور میرے ڈیڈی کو میری اُداسی بہت بری لگتی تھی، چنانچہ سوچ بچار کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شہر سے کسی زندہ نوجوان کو یہاں لے آئیں اور میں اس سے ربط بڑھالوں، اگر وہ مجھے پسند کرنے لگے، تو پھر اسے بھی مرنے کی دعوت دوں اور وہ اگر میرے لیے مرنے کو تیار ہوجائے تو پھر مرنے کے بعد میں اسے ابد تک کے لیے اپنالوں۔ میں نے تمہیں اور تم نے مجھے پسند کرلیا ہے مسعود۔ تمہارے آنے کے بعد ڈیڈی نے تجویز پیش کی کہ تمہیں خوراک میں زہر دیا جائے تاکہ تم اس سے مرجاؤ لیکن میں نے ان سے اختلاف کیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ پہلے میں تمہیں مرنے کے لیے آمادہ کرلوں، اور پھر خود تمہیں قتل کرکے ہمیشہ کے لیے اپنالوں۔ وہ وقت آگیا ہے میرے محبوب، آج تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ اور پھر ہمارے، تمہارے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہے گی۔''

''یہ کیا مذاق ہے شمسہ۔'' میں نے ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں محسوس کیں، مگر مجھے شمسہ کے اس مذاق پر یقین نہیں آیا تھا، لیکن یہاں کا ماحول اور شمسہ کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے بھی شک ہونے لگا۔

''مذاق نہیں مسعود یہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے، کیا تم نے میرے جسم میں زندگی کی حرارت محسوس کی ہے۔ میں زندہ نہیں ہوں مسعود۔'' اور میرا شبہ حقیقت میں بدلنے لگا۔ میں کئی بار شمسہ کے جسم کے بارے میں بھی

سوچ چکا تھا۔

"مجھے میری محرومیوں سے نکال لو مسعود، میری طویل زندگی کو مسرتوں سے ہمکنار کردو۔ آج میں تمہیں اپنائے بغیر نہیں چھوڑوں گی۔" شمسہ نے پیٹی میں اُڑسا ہوا خنجر نکال لیا اور میری طرف لپکی۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ اب میں بھی گومگو کی حالت میں تھا۔ لیکن شمسہ نے وار کردیا اور خنجر کی نوک میرے کوٹ میں داخل ہوکر شانے کو زخمی کرگئی۔ اس زخم کے بعد خود فریبی کی گنجائش نہیں تھی۔ میرے جسم سے پسینہ بہہ نکلا اور میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگادی۔ لیکن شمسہ نے پاؤں اڑا کر مجھے گرادیا۔ اور مٹھی میں خنجر دبائے ہوئے میرے اوپر جھکی۔ میری آنکھوں میں موت ناچ رہی تھی۔ میں نے زندگی کی آخری کوشش کی اور شمسہ کی پنڈلی پکڑ کر اسے زور سے دھکا دیا۔ میری کوشش کامیاب رہی اور نازک اندام شمسہ زور سے نیچے گری۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا۔

اور دروازے سے نکل کر بے تحاشا بھاگنے لگا۔ داور محمود شاید میرے دوڑنے کی آواز سن کر ہی کمرے سے نکل آیا تھا۔ وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے مسعود۔" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"وہ، وہ شمسہ، نہ جانے اس پر کیسی دیوانگی کا دورہ پڑا ہے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتی ہے، کہہ رہی ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے وہ مجھے قتل کرکے اپنانا چاہتی ہے۔" میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا اور داور محمود نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"وہ درست کہہ رہی ہے بیٹے۔ اس نے جو کچھ کہا ہے درست کہا ہے۔ میری درخواست ہے کہ تم اس کی خواہش پوری کردو۔"

"م...... مگر میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، میں اپنے والدین، اپنی بہن کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مجھے بچایئے۔" میں نے کہا۔

"بچی کا شوق ہے، اس کی خواہش ہے بیٹے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ مجھے افسوس ہے۔" داور محمود نے کہا۔ اسی وقت راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ شمسہ کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

"جانے نہ پائے ڈیڈی، یہ بچ کر نکل گیا تو پھر، تو پھر۔" میں نے اللہ کا نام لے کر باہر کی طرف چھلانگ لگادی اور مجھے نہیں معلوم کہ میں کس رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ شمسہ کی چیخیں مجھے دھرم شالہ تک سنائی دیتی رہیں، وہ کہہ رہی تھی۔

"رُک جاؤ مسعود، رُک جاؤ، میں تمہارے بغیر چین نہیں پاسکتی۔ رُک جاؤ...... مسعود...... میرے مسعود...... میرے محبوب۔"

رتولی تک میں اسی رفتار سے دوڑتا رہا۔ میرے شانے سے خون بہہ رہا تھا لیکن مجھے اس کا ہوش نہیں تھا۔ رتولی پہنچ کر میں نے سانس لیا۔ اور پھر بہ ہزار وقت اپنے والدین کے پاس پہنچ سکا۔ یہاں کچھ حیرتیں میری منتظر تھیں میرے والدین عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں پچاس پچاس ہزار کے دو منی آرڈر ملے تھے۔ اور دس ہزار کا ایک...... پچاس پچاس ہزار کے منی آرڈر کسی شمسہ داور نے بھیجے تھے۔

میرے شانے کے زخم کے علاج میں کئی ہفتے لگ گئے۔ ویسے میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ والدین سے صرف اتنا کہا تھا کہ ملازمت چھوڑ دی ہے اور والد صاحب ناراض تھے کہ اتنی عمدہ ملازمت کیوں چھوڑ دی۔

فی الوقت مجھے ملازمت کی زیادہ پریشانی نہیں تھی، لیکن فکر ضرور تھی اور آج ضرورت ہے کہ کالم میں یہ اشتہار دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"ضرورت ہے۔"

ایک پرائیوٹ سیکریٹری کی، نوجوان اور ذہین انسان کو ترجیح دی جائے گی۔ خوش شکل اور خوش پوش ہونا ضروری ہے، معقول تنخواہ پیش کی جائے گی۔ ضرورت مند اس پتے پر رجوع کریں۔

"ٹوٹا دروازہ۔ بنگلہ نمبر چھتیس ڈی ایم رانا۔"

☆☆......☆☆

آسیبی چکر

عذرا فردوس

کراچی سے، لالچ میں ڈوبے ایک قاتل کی کہانی



مائر کی نظر جیسے ہی اس بنگلے پر پڑی خوف کی سرد لہر اس کے جسم میں اتر گئی بنگلے کے باہر کھڑا وہ یہ سوچ رہا تھا۔ کہ اس کے اندر جائے یا نہ جائے کافی سال سے غیر آباد رہنے کی وجہ سے اس کا رنگ روغن جگہ جگہ سے جھڑ رہا تھا در و دیوار سے وحشت ٹپک رہی تھی باہر لان میں موجود پودوں نے جھاڑ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کا ذہن کشمکش کا شکار تھا۔ ''ڈرنے کی ضرورت نہیں اندر آجاؤ'' اپنے آس پاس اسے ایک آواز سنائی دی۔

مائر نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن ارد گرد کوئی دکھائی نہ دیا وہ ذہن پر زور دینے لگا کہ یہ آواز کسی مرد کی ہے یا کسی عورت کی ''ڈرنے کی ضرورت نہیں اندر آجاؤ'' دوبارہ پھر سرگوشی نما آواز سنائی دی۔ مائر نے دوبارہ اطراف کا جائزہ لیا مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ کچھ سوچ کر وہ بنگلے میں داخل ہوا اندر داخل ہوتے ہی سامنے کی طرف اسے زینہ دکھائی دیا اس نے سوچا پہلے اندر کا جائزہ لے لے پھر اوپر کی طرف جائے گا۔ زینے کے ساتھ دو دروازے تھے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا وہ فوراً کھل گیا وہ اندر داخل ہو کر کمروں میں گھومنے لگا کمرے خالی اور دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے مائر اپنے اندر بے چینی اور خوف محسوس کر رہا تھا۔

بنگلے کے اندر کا ماحول باہر کے ماحول سے زیادہ پراسرار اور دہشت زدہ کر دینے والا تھا۔ جا بجا مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر کئی جگہ رنگ کے ساتھ ساتھ پلستر اکھڑا ہوا تھا ہر شے پر گرد جم چکی تھیں فضا میں ایک عجیب سی بُو رچی ہوئی تھی۔ مائر بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے قدم من من بھر کے ہوں اور اپنے پیچھے اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا وہ فوراً مڑا مگر وہاں کوئی نہیں تھا کمروں سے ہوتا ہوا وہ صحن میں آ گیا دوبارہ اسے اپنے پاس کسی پُراسرار اور نادیدہ وجود کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ مڑا ایک سایہ اس کے پاس سے آ کر گزر گیا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے وہ زینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

خوفزدہ ہو کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا مڑ کر اس کی نظر ہاتھ رکھنے والے شخص پر پڑی ''جوزف اتم'' ہکلاتے ہوئے اس کا منہ سے صرف اتنا نکلا۔

''ہاں میں اتم سمجھ رہے تھے مجھ کو مار کر تم بچ جاؤ





گے؟ مگر ایسا ہرگز نہیں میں تم سے اپنی موت کا انتقام لے کر رہوں گا۔"

جوزف کا ہاتھ اب اس کی گردن پر تھا بڑی مشکل سے اس نے جوزف کو دھکا دے کر خود کو چھڑایا خوف سے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا وہ بے تحاشا دوڑتا ہوا بیرونی گیٹ کی طرف بھاگا اس کا پاؤں لان میں موجود گھاس میں الجھ رہا تھا۔ وہ گیٹ کھول کر باہر بھاگا۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا پورے ماحول اور فضا میں وہی بنگلے کے اندر والی اداسی اور پراسراریت چھائی ہوئی تھی۔ ہر شے سحر زدہ لگ رہی تھی۔ بنگلے کے گیٹ سے دائیں طرف بلندی کی طرف جاتا سڑک نما ایک کچا راستہ دور تک نظر آ رہا تھا راستے کے دونوں طرف اونچے اونچے پیپل کے درخت ستونوں کی طرح کھڑے تھے جن کے سوکھے پتے جھڑ کر راستے میں بکھرے ہوئے تھے۔

مائر نے پیچھے مڑ کر دیکھا، جوزف سائے کی طرح دوڑتا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کا بھرا وجود بہت ہی پر اسرار اور خوفناک لگ رہا تھا۔

"رک جاؤ تمہارا بھاگنا بے سود ہے" جوزف کی کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

اس سے بچنے کے لیے اس نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی لمحہ بہ لمحہ خوف مائر کے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا اس کا سارا بدن پسینے سے بھیگ چکا تھا جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح بھاگ رہا ہو اور جوزف کا سایہ اس کے تعاقب میں ہوا اچانک اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹکرایا تکلیف کی ایک لہر اس کے پیر میں اٹھی، توازن قائم نہ رکھنے کے سبب اس کے قدموں نے زمین کو چھوڑ دیا وہ قلابازیاں کھاتا ہوا ایک مہیب خلا میں گرنے لگا اچانک اس کی آنکھ کھل گئی کافی دیر تک وہ بستر پر بیٹھا سوچ رہا تھا، جو کچھ اس نے دیکھا ہے کیا واقعی وہ خواب تھا؟ مائر کا سارا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

رات کے بوجھل سناٹے میں اسے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس خواب نے

مائر کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ یہ خواب اسے پچھلے کئی ہفتوں سے مسلسل نظر آ رہا تھا۔ ہر بار آنکھ کھلنے پر وہ کسی نادیدہ ہستی کے وجود کو کمرے میں محسوس کرتا تھا وہ بستر سے اٹھا کمرے کے پردے اٹھا کر دیکھنے لگا اس کی نگاہ وال کلاک پر پڑی رات کے دو بج رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کمرے میں اس کا علاوہ کوئی اور موجود ہے۔

''میرا وہم ہے کوئی بھی تو یہاں نہیں ہے'' دل کو تسلی دیتے ہوئے اس نے خود کو کرسی پر پڑی ہوئی چادر میں لپیٹ لیا۔ سخت سردی کے باوجود کمرے سے باہر لان کی طرف چلا گیا ہر طرف گہرا سکوت چھایا ہوا تھا اُسے لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے تقریباً پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ آس پاس سے عجیب سی مسحور کن خوشبو کا احساس ہوا وہ حیران تھا کہ یہ خوشبو کسی پھول کی نہیں بلکہ اس پرفیوم کی ہے، جو جوزف استعمال کرتا تھا۔ مائر جس درخت کے نیچے کھڑا تھا اس کے پتوں کی سرسراہٹ مائر کے کانوں میں پہنچی وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درخت کے اوپر دیکھنے لگا وہاں کچھ نہیں تھا اس لمحہ اس کے پاس آتی ہوئی خوشبو ایک دم غائب ہوگئی۔

سوزین اس کی بیوی تھی۔ اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا اس گھر میں وہ سوزین کے ساتھ بہت اچھا وقت گزار چکا تھا اس لیے وہ اسے بھول کیسے سکتا تھا؟ مائر نے بیرون ملک جانے کا فیصلہ کر لیا تھا یہ سوچ کر کہ اس طرح وہ سوزین اور جوزف کی یادوں سے چھٹکارا حاصل کر لے گا۔ سوزین کی جائیداد اب اس کے قبضے میں تھی وہ اسے آہستہ آہستہ فروخت کر کے اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر رہا تھا۔

اس کا ارادہ شہر سے دور گاؤں میں سوزین کے گھر اور اس کے آس پاس کی زمینوں کو فروخت کرنے کا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ تین چار روز میں وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ وہ اس سے پہلے کبھی گاؤں کی طرف نہیں گیا تھا، مگر اب جائیداد فروخت کرنے کے لیے اس کا جانا بہت ضروری تھا۔

یہ خواب جو اسے کئی راتوں سے مسلسل نظر آ رہا تھا وہ اس خواب کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا وہ پُر اسرار خواب اور نادیدہ وجود اس کی موجودگی کا احساس ایک اٹل حقیقت کی طرح اس کے سامنے تھا وہ جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس پر جتنا سوچتا اتنا ہی الجھ جاتا جوزف جب مر چکا تھا۔ تو اس کا خواب میں آنا بار بار کوئی مقصد رکھتا تھا۔ کہیں اس کی روح مجھ سے انتقام تو نہیں لینا چاہتی تھی۔ آخر ایک ہی خواب کا بار بار آنا کوئی تو بات ہے؟ اگر یہ بات کسی شخص کو بتاؤں تو وہ مجھے ذہنی مریض سمجھے گا۔ کچھ دن کی بات ہے جب میں دوسرے ملک میں ہوں گا تو یہ شہر اور اس سے وابستہ تمام یادوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔

باہر کی فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ مائر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس کی نظریں سوزین کی تصویر پر پڑی ذہن کے پردے پر سوزین سے وابستہ یادیں چلنے لگیں۔

☆......☆......☆

سہارنپور وہ گاؤں تھا۔ جہاں مائر نے جنم لیا باپ تو اس کا بچپن میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اسے کسی نہ کسی طرح پڑھا دیا۔ بی اے کرنے کے بعد اسے گاؤں میں ایک اسکول میں نوکری مل گئی، مگر اسے یہ نوکری پسند نہ تھی۔ وہ بمبئی جا کر اپنے خوابوں کی تکمیل کرنا چاہتا تھا ماں کی بیماری کی وجہ سے اس کو اکیلا چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ مائر کی ماں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کے علاج کے لیے بہت سارا پیسہ چاہیے تھا جو مائر کے پاس نہیں تھا مائر نے اپنی بساط کے مطابق اس کا علاج کروانے کی پوری کوشش کی مگر بے سود رہا۔ ایک دن وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی۔ ماں کی موت کے بعد اس کے لیے گاؤں میں کچھ نہیں بچا یہاں اس کا اپنا گھر تک نہیں تھا۔ وہ ماں کے ساتھ ایک کرائے کے کمرے میں مقیم تھا۔ کچھ سوچ کر وہ بمبئی آ گیا کہ یہاں کوئی اچھی اور ایسی نوکری ڈھونڈ لے گا۔ جو اس کے سارے درد دور کر دے گی دن رات محنت کر کے بہت سارا روپیہ جمع کر لے گا۔ مگر شہر آ کر اسے پتا چلا

کہ وہاں اس کے لیے سہار نپور سے زیادہ تاریکی تھی۔ اس نے نوکری کی تلاش میں کیا کچھ نہیں کیا لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اول تو اسے کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں ملی، اگر ملی تو وہ بھی عارضی اس کی جمع پونجی تیزی سے خرچ ہو رہی تھی۔ اتفاق سے اس کی ملاقات سمیر سے ہوگئی۔ سمیر اس کے گاؤں کا رہائشی تھا۔ کافی عرصے پہلے وہ ملازمت کے لیے وہ کویت چلا گیا تھا۔ سمیر کے سامنے مائیر نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں کویت میں ملازمت دلوا دوں گا۔ کچھ رقم ہے تمہارے پاس؟ یہ تو تم جانتے ہو گے تمہارے ویزے اور آنے جانے کے اخراجات ہوں گے۔'' سمیر اس کے حالات جاننے کے بعد بولا۔

''میرے پاس تو اتنی رقم نہیں ہوگی جو پیسے جمع کیے تھے وہ یہاں آ کر بے روزگاری کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ مائر نے فکر مند لہجہ میں کہا وہ باہر جانے کا موقع ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔''

''سمیر تم وہاں جا کر مجھے بلوالو میں وعدہ کرتا ہوں ملازمت کر کے تمہارا ایک ایک پیسہ واپس چکا دوں گا۔''

''یہ ممکن نہیں، تمہیں رقم کا بندوبست کرنا ہوگا اگر کچھ کمی ہوگی تو میں پوری کر دوں گا۔ تمہارے پاس دو دن کا وقت ہے، اچھی طرح سوچ لو اور پیسوں کا بندوبست کر لو، ایسے موقعے بار بار نہیں ملتے۔'' سمیر نے اس سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا اپنے کمرے میں واپس آ کر مائر کچھ دیر سوچتا رہا۔

آخر کار اس نے ماں کی چوڑیاں بیچنے کا فیصلہ کر لیا جب ماں نہیں رہی تو اس کی چوڑیاں نشانی کے طور پر ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ جس کوٹھری میں رہ رہا تھا اس کا کرایہ بھی مہینوں کا چڑھا ہوا تھا۔ مالک مکان نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر دو دن کے اندر کرایہ ادا نہ ہوا تو وہ اس کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ اسے کرائے کے پیسے بھی ادا کرنے تھے مائر نے سوچا کہ چوڑیاں بیچ کر وہ کرایہ بھی ادا کر دے گا اور سمیر سے ویزے کے سلسلے میں بھی بات کرے گا۔

مائر کی خوش قسمتی تھی کہ سمیر نے کویت جاتے ہی اس کی ملازمت کا بندوبست کر لیا اور اُسے وہاں بلوالیا۔ مائر کویت میں آ کر اپنی جاب سے مطمئن تھا کم از کم دن رات محنت کر کے وہ کچھ پیسے تو بچا رہا تھا ایک دن جب وہ صبح سو کر اٹھا تو اس نے اپنے پیٹ میں بہت شدید درد محسوس کیا۔ اس کے ساتھی نے اسے اسپتال پہنچایا اسے اپینڈکس کا درد اٹھا تھا فوری آپریشن سے مائر کی حالت سنبھل گئی۔ سوزین اس اسپتال میں نرس تھی جہاں مائر ایڈمٹ تھا۔ مائر کے بارے میں جب سوزین کو پتہ چلا کہ وہ انڈین ہے تو وہ اس پر اور توجہ دینے لگی۔

سوزین کا تعلق کلکتہ سے تھا۔ مائر چند دن اسپتال میں رہ کر رخصت ہو گیا۔ مگر اس کے اور سوزین کے درمیاں دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا مائر اور سوزین کی اکثر ملاقات ہونے لگی تھی۔ سوزین کافی باتونی اور ہنسنے ہنسانے والی لڑکی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ بالکل غیر محسوس طریقے سے مائر کی زندگی کے تمام حالات پوچھ لیے تھے مائر کو یوں لگ رہا تھا وہ آہستہ آہستہ سوزین کی محبت میں گرفتار ہو رہا ہے۔ اگر سوزین اس سے ملنے نہیں آتی یا اس کا فون نہیں آتا تو اسے یوں لگتا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔

ایک دن اس نے سوزین کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ''میں تم سے شادی نہیں کر سکتی تم سے شادی کرنے کا مطلب ترستی ہوئی زندگی گزارنا ہے جو مجھے کسی صورت قبول نہیں'' سوزین نے فوراً انکار کر دیا مائر کو اس بات کی توقع نہیں تھی۔

''سوزین'' مائر نے اس کی بڑی بڑی آنکھیں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا ''تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو؟''

''ہاں مگر محبت کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم سے شادی کر لوں۔ کسی خوشحال آدمی سے شادی کر کے باقی زندگی عیش و آرام میں گزارنا چاہتی ہوں۔ کم عمری سے میں مشقت کر چکی ہوں۔ تم سے شادی کا مطلب اوسط سے کم درجے کی زندگی گزارنا ہے جو مجھے ہرگز قبول نہیں'' سوزین نے صاف منع کر دیا۔

اس دن کے بعد مائر اور سوزین کی ملاقاتیں ہوتی رہیں مائر نے دوبارہ اس کے سامنے شادی کی خواہش کا ذکر نہیں کیا۔ ایک دن سوزین نے بتایا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر کلکتہ جا رہی ہے۔ اس نے مائر کو اپنا پتہ اور فون نمبر دیا ایک ہفتے بعد وہ چلی گئی اس کے جانے کے بعد مائر کا بالکل دل نہیں لگ رہا تھا مگر وہ جاب نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ پانچ سال بعد اپنے وطن جانے کے موقع مل گیا۔ وہ سیدھا کلکتہ پہنچا سوزین نے جانے کا بعد اس سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ سوزین کے دیے ہوئے پتے پر جب وہ پہنچا وہاں اس کی خالہ موجود تھیں۔

''سوزین کی تو شادی ہوگئی ہے'' انھوں نے انکشاف کیا۔

کس سے؟ مائر کو دھچکا لگا وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ سوزین کو ایک دفعہ پھر شادی کی پیش کش کرے گا۔

''جوزف بہت بڑا بزنس مین ہے سوزین سے اس کی ملاقات کویت میں ہوئی تھی وہ تو نوکری چھوڑ کر یہاں آئی اس سے شادی کرنے کے لیے تھی'' خالہ کی بات سن کر مائر کا چہرہ اتر گیا۔

''آپ مجھے سوزین کا نمبر دے سکتی ہیں میں اس کا دوست ہوں''

''تم مجھے اپنا نام اور فون نمبر دے دو میں سوزین کو بتا دوں گی وہ اگر چاہے گی تو تم سے رابطہ کر لے گی'' خالہ نے کہا مائر نے ایک پرچہ پر اپنا نمبر لکھ کر انہیں دے دیا اگلے دن سوزین کا فون آ گیا۔ مائر نے اس سے کہا وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ سوزین نے ایک ہوٹل میں اس سے ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

مائر نے سوچا تھا کہ سوزین سے جب ملے گا تو اس کے پچھلے رویے کے متعلق شکایت کرے گا مگر سوزین سے مل کر وہ تمام گلے شکوے بھول گیا وہ ایک دفعہ پھر اس کے اعصاب پر چھا گئی تھی۔

''تم کیا چھٹیوں پر آئے ہو'' سوزین نے مائر سے پوچھا

''نہیں میرا پرانا معاہدہ ختم ہو گیا ہے تو فی الحال میں فارغ ہوں''

''تم میرے شوہر کی کمپنی میں ملازمت کر لو اس طرح ہم ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے۔ مائر میں تمہیں بتا نہیں سکتی تم مجھے کتنا یاد آتے رہے ہو جوزف کبھی میرا اچھا دوست نہیں بن سکا''

''تب ہی تم نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟ مائر نے طنزیہ لہجہ میں کہا'' میری جب شادی ہوگئی تو تم اتنی دور بیٹھ کر میرے پرابلم کیا خاک حل کرتے؟ جوزف کے شک کرنے کی عادت نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے''

''شادی کا فیصلہ تو تمہارا اپنا تھا تم نے مجھے بتانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اب تمہیں میری ضرورت محسوس ہوگئی''

''ہاں تم اچھے دوست ہو مجھے امید ہے تم میری بہت سی مشکلات کو حل کر سکتے ہو۔ سوزین نے پُر امید نظروں سے اُسے دیکھا۔

اسے جوزف کی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اور سوزین اکثر ملنے لگے۔ جوزف ساٹھ سال کی عمر کا تھا مگر اچھی صحت کے باعث پچاس سے اوپر کا نہیں لگتا تھا۔ سوزین اس کی چوتھی بیوی تھی ایک دن مائر سوزین کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ مقررہ وقت سے وہ کافی لیٹ پہنچی، اس وقت وہ ہوٹل سے نکلنے کا سوچ رہا تھا ''کہاں رہ گئی تھی تم؟'' مائر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا

''بڑی مشکل سے آئی ہوں'' جوزف سخت غصے میں تھا ہو سکتا ہے وہ تمہیں نوکری سے نکال دے''

''مگر کیوں'' مائر جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا

''وجہ تم جانتے ہو اسے میرا تم سے ملنا پسند نہیں ہے اس کے کسی دوست نے اسے میری اور تمہاری دوستی کے متعلق بتا دیا تھا''

''ہم لوگوں نے ایسی کوئی غلط حرکت تو نہیں کی جس کی وجہ سے وہ تم پر غصہ نکال رہا ہے۔''

''اس نے میرے کردار پر کیچڑ اچھالا ہے تمہیں پتہ ہے وہ اپنی وصیت بھی تبدیل کروا رہا ہے اس سے پہلے کہ وہ اس پر عمل کرے ہمیں کچھ کرنا ہوگا'' مثلاً

کیا کرنا ہوگا؟
''اسے ختم کر دینا ہوگا'' سوزین سفاک لہجہ میں بولی۔
''تمہیں لگتا ہے یہ کام اتنا آسان ہے کسی کو قتل کر دیا جائے اور قاتل بچ بھی جائے''
''بچا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم یہ کام کرایے کے قاتل سے کروائیں اور واردات کو چوری کا رنگ دے دیا جائے'' سوزین کی بات سن کر مائر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔
''ڈر گئے ہو؟ زندگی میں کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ میں اب جوزف سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں۔''
''تم اس سے طلاق بھی لے سکتے ہو'' وہ لاپرواہی سے بولا'' طلاق لینے کا مطلب جوزف کی دولت سے محروم ہونا ہے جو مجھے کسی صورت گوارہ نہیں ہے میں نے اس بڈھے سے شادی اس لیے کی تھی کہ باقی کی زندگی عیش سے گزاروں۔ تمہیں مجھے اس کام کو کرنے میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔''
''اگر میں تمہارا ساتھ نہ دوں''
''جیسے تمہاری مرضی مگر یاد رکھنا اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میرے اور تمہارے راستے جدا ہوں گے'' سوزین نے حتمی لہجہ میں کہا۔ مائر سوچ میں پڑ گیا وہ سوزین کے سحر میں تو مبتلا ہو چکا تھا، اس سے جدائی کسی صورت گوارہ نہیں تھی۔ تھوڑے پس و پیش کے بعد مائر نے سوزین سے وعدہ کر لیا کہ وہ جلد از جلد جوزف کو کرائے کے قاتل کی مدد سے ٹھکانے لگوا دے گا۔ یہ کام جلد سے جلد ہو جانا چاہیے'' سوزین نے جاتے ہوئے یاد دہانی کروائی۔

☆......☆......☆

''سوزین! تم نے میری محبت اور نرمی کا غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لڑکے مائر کو ملازمت میں نے تمہارے کہنے پر دی تھی۔ تم نے اس سے عشق کرنا شروع کر دیا، تم اس کمپنی کے مالک کی بیوی ہو تمہاری اس حرکت سے لوگوں کو میرے خلاف انگلیاں اٹھانے کا موقع مل گیا۔ جوزف سخت غصہ میں تھا۔
''تم بے جا مجھ پر شک کر رہے ہو میرے اور مائر کے بیچ ایسا کچھ نہیں ہے وہ میرا اچھا دوست ہے اور یہ دوستی شادی سے پہلے کی ہے''
''تم کچھ بھی کہو میں نے مائر کو کمپنی سے فارغ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیشیئر اسکا حساب کتاب کر دے گا۔''
''تم نے جلد بازی میں غلط فیصلہ کیا ہے'' سوزین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
''میں اتنا بیوقوف نہیں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے میں تمہاری اور مائر کی حرکتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جو محبت میرے حصے میں آنی چاہیے تھی وہ تم اس پر لٹا رہی ہو تم نے تو مجھ بوڑھے سے محض میری دولت کی خاطر شادی کی ہے اور اب میری موت کی منتظر ہو۔ کب میں مروں اور تم کب میری جائیداد کی مالک بن کر اس بے غیرت مائر سے شادی کرو'' جوزف نے یقینی لہجہ میں کہا۔
''تمہاری بدگمانی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے'' سوزین لاپرواہی سے بولی'' آج کے بعد تم میری نگرانی میں رہو گی خبردار جو تم نے اس سے ملنے کی کوشش کی تم کو اس سے دور رکھنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اب تم جاؤ۔ مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔ جوزف کے برے موڈ کو دیکھتے ہوئے سوزین نے وہاں سے جانا مناسب سمجھا۔
جوزف نے مائر کو کمپنی سے فارغ کر دیا تھا۔ رات میں وہ گھر پہنچا تو سوزین نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا وہ تو سمجھ رہا تھا صبح کے واقعے کے بعد سوزین کا موڈ آف ہوگا۔ سوزین نے کھانا لگوا دیا وہ کھانا کھانے لگا تمام ڈشز اس کی پسندیدہ تھیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے جہازی سائز کے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا'' کہیں سکون نہیں ہے ہر طرف قتل و غارت گری، دولت کے لیے دوسروں کا استحصال، اقتدار کی جنگ، بے چینی اور عدم تحفظ ہے۔ سب کچھ اخبار میں بھرا ہوتا ہے اس کے علاوہ اخبار میں اور کچھ ہوتا بھی نہیں ہے'' اس نے

اخبار ایک طرف رکھ دیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔
کچھ دنوں بعد جوزف بھی اخبار کی خبروں کا حصہ بن گیا۔ ڈاکوؤں نے اس کی کار روک کر اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی مزاحمت پر اسے اور اس کے ڈرائیور کو گولی ماردی۔ پولیس نے قاتلوں کا سراغ لگانے کی بڑی کوشش کی سوزین کو بھی تفتیش میں شامل کیا۔ ذاتی طور پر جوزف کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ کچھ عرصے پولیس نے اس کیس کو حل کرنے کی کوشش کی پھر خود ہی تھک ہار کر بیٹھ گئی۔

جوزف کی موت کے بعد سوزین پر انکشاف ہوا کہ جوزف جو اتنی بڑی کمپنی چلا رہا تھا وہ دیوالیہ ہو چکی تھی۔ بینک کا ڈھیروں قرض کمپنی کے کل اثاثہ جات سے بھی زیادہ ہے۔ جس کوٹھی میں وہ رہ رہی تھی وہ کوٹھی اور کمپنی کو بینک نے سیل کر کے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ جوزف کا ایک بنگلہ اور بھی تھا جس میں سوزین نے رہائش اختیار کر لی۔ لے دے کے اب اس کے پاس دو فلیٹ اور جوزف کی گاؤں والی زمین اور گھر رہ گیا تھا۔ بنگلے میں منتقل ہونے کے بعد اس نے مائر سے شادی کر لی۔

سوزین کی خالہ نے اعتراض بھی کیا کہ ایک مسلمان سے کیوں شادی کر رہی ہے؟ مگر اس کو ان کے اعتراض کی پرواہ کب کی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ایک رات وہ اپنے بستر پر پُراسرار طور سے مردہ ملی تھی۔

☆......☆......☆

فضا میں ایک دم پرفیوم کی خوشبو پھیل گئی۔ مائر کی سوچوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اس نے کمرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا پھر ایک دم خوشبو غائب ہوگئی۔ سوزین نے مرنے سے پہلے اپنے ساتھ آنے والے عجیب و غریب واقعات کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ مگر میں نے ان واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ سخت دہشت زدہ تھی۔ کسی غیر مرئی وجود سے وہ ڈرتی رہتی تھی۔ اب میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ بھی کسی ان دیکھے وجود کی وجہ سے ہے۔

جوزف کا بھوت میرے پیچھے پڑ گیا' مائر نے دل میں سوچا اگلے ہی لمحہ اس کے ذہن نے اس خیال کو مسترد کر دیا کہ یہ محض اس کا وہم ہے۔ مائر نے لائٹ آف کر دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد مائر جوزف کے آبائی گاؤں میں موجود تھا۔ وہاں موجود اس کے گھر کو دیکھ کر اسے حیرت سے شدید جھٹکا لگا۔ اس بنگلے کو وہ گزشتہ کئی دنوں سے خواب میں دیکھ رہا تھا یہ بنگلا باقی گھروں سے الگ تھلگ اور پرسکون تھا بنگلے کو دیکھ کر مائر کو یوں لگا جیسے اس کو کسی آسیبی قوت نے جکڑ لیا ہو وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ پراسرار خواب کا نظر آنا بے معنی نہیں ہے'' کیا میں واقعی کسی آسیبی چکر میں پھنس گیا ہوں؟ یا محض یہ ایک اتفاق ہے'' اس نے سوچا۔

اچانک اس کی نظر اس راستے پر پڑی جس کی طرف وہ آیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ خواب میں نظر آنے والا کچا سڑک نما راستہ جس پر وہ بھاگتا تھا یہ وہی راستہ تھا۔ گاؤں کے ایک کم عمر لڑکے مجید کو اس نے ساتھ لے لیا تھا۔ مجید غریب لڑکا تھا مائر نے اسے کہا تھا کہ جب تک وہ یہاں ہے بنگلے کی صاف صفائی اور گھر کے کام کرے اور جیسے ہی زمینوں کا سودا ہو گیا وہ یہاں سے چلا جائے گا مجید فی الحال بے روزگار تھا اس نے مائر کی پیش کش کو قبول کر لیا تھا۔

''صاحب یہیں کھڑے رہیں گے یا اندر بھی جائیں گے'' مجید نے تالا کھول دیا تھا مائر بلا ارادہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح گیٹ کے اندر داخل ہو گیا اندر کا منظر بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا مائر نے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ اس بنگلے کو خواب میں کافی دنوں سے دیکھ رہا تھا اس لیے اسے بنگلے کا ماحول جانا پہچانا لگ رہا تھا جگہ جگہ مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ مستقل بند رہنے سے بنگلے کی فضا میں نامانوس سی بو رچی ہوئی تھی۔

مائر کبھی بھی کسی آسیب بھوت پریت کا قائل نہیں تھا زندگی میں پہلی مرتبہ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جو

کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے کیا وہ واقعی کسی ایسے چکر میں پھنس چکا ہے؟ وہ گہری سوچ میں تھا۔

''صاحب کیا سوچنے لگے؟ کیا یہاں سے کہیں بھاگنے کا ارادہ ہے؟ مجید نے مسکراتے ہوئے کہا

''سوچ تو رہا ہوں کہیں اور چلا جاؤں مگر فی الحال تو یہیں رہوں گا تم گھر کی صفائی کرنا شروع کر دو۔''

مائر نے مجید کو ہدایت دی۔ خود تھوڑی دیر کے بعد اپنے کام کے سلسلے میں چلا گیا۔ وہ جلد از جلد جائیداد فروخت کر کے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مائر کا پورا دن مصروف گزرا۔

رات کھانے کے بعد مجید کوٹھی سے متصل کوارٹر میں چلا گیا جوزف کے استعمال میں رہنے والے کمرے کو مجید نے خوب اچھی طرح صاف ستھرا کر دیا تھا۔ مائر جوزف کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ لیٹے لیٹے اس کی آنکھ لگ گئی۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا اس کی آنکھ کھل گئی، آنکھ کھلتے ہی اس کی نگاہ کھڑکی پر پڑی نائٹ بلب کی روشنی میں اسے کھڑکی میں جوزف کا ہیولہ نظر آیا مائر مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ کھڑکی تک پہنچا اس کے وہاں پہنچتے ہی وہ سفید سا ہیولہ غائب ہو گیا وہ یک دم پیچھے ہٹا اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا ''یہ محض میرا وہم تھا'' وہ خود کو تسلی دے رہا تھا مگر اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دوبارہ لیٹ گیا بڑی مشکل سے اس کی آنکھ لگی جو کسی کی چیخوں کی آواز سے کھل گئی۔ چیخ کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ مائر اپنے کمرے سے صحن میں آ گیا اچانک چیخ کی آواز بلند ہوگئی مائر خوف زدہ ہو گیا، اسی وقت گیٹ کے باہر دستک ہوئی مائر گیٹ کی طرف لپکا اسے اپنے پیچھے کسی کے قہقہے کی آواز سنائی دی وہ مڑا پیچھے کوئی نہیں تھا مائر نے مجید کو آوازیں دینا شروع کر دیں تھوری دیر بعد وہ آنکھیں ملتا ہوا اپنے کوارٹر سے نکل آیا۔ مجید باہر دروازے پر کوئی ہے۔''

''اچھا اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ آپ نے دستک کی آواز سنی ہے؟''

''ہاں کیا تمہیں سنائی دی مجھے تو کسی کے زور سے چلانے کی آواز بھی آ رہی ہے اتنے بے خبر ہو کر

وہ شخص

اک جمگی میں لے کر پہنچا،
''مال'' دکھا کر مجھ سے اس کی قیمت لی اور چلا گیا
چند ہی لمحوں بعد فضا میں
گونجی اک آواز
بھاگو! پولیس آ گئی ہے
......ڈرتے ڈرتے باہر نکلا،
اور سڑک پر آ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا
دوسرے دن جب ''شو'' سے آتے وقت وہی
آواز سنی
تو ٹھٹک گیا!
......اس آواز کے پاس پہنچ کر دیکھا تو
یہ محض وہی تھا جو کل مجھ کو لایا تھا
ہم دونوں حیران کھڑے تھے
اور اک ''سایہ'' روڈ کی جانب بھاگ رہا تھا

محسن بھوپالی

سو رہے تھے'' غصے اور خوف سے مائر کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''صاحب مجھے تو ایسا کچھ سنائی نہیں دیا آپ کہتے ہیں تو میں باہر گیٹ کھول کر دیکھ لیتا ہوں'' مائر ایک دم خوف زدہ ہو گیا۔

''نہیں گیٹ مت کھولنا تم اپنا بستر اٹھا کر لاؤنج میں لے آؤ۔ پورا بنگلہ خالی ہے تو کوارٹر میں سونے کی کیا ضرورت ہے۔''

مجید اسی وقت اپنا بستر لے کر لاؤنج میں آ گیا مائر کو ذرا اطمینان ہوا تو وہ کمرے میں چلا گیا۔ دس بارہ روز سکون کے گزر گئے۔ مائر نے بنگلے کو فروخت کرنے کی بات کر لی تھی۔ ساتھ ہی وہ زمینوں کا سودا بھی کر رہا تھا۔ یہ تو وہ طے کر چکا تھا کہ اسے اب یہاں نہیں

رہنا۔ دبئی جاکر وہ وہاں کاروبار کرنے کے چکر میں تھا۔ وہاں اس نے اپنے دوست سے بات کر رکھی تھی۔ پہلے دن کے بعد اس کے ساتھ کوئی پراسرار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ پہلے دن جو اس کے ساتھ پیش آیا وہ اس کا وہم ہوگا یا اس نے خواب کو اپنے ذہن میں زیادہ طاری کرلیا تھا اس کی وجہ سے وہ آوازیں سنائی دی ہوں۔ آخر مجید بھی وہاں اس کے ساتھ تھا اُس نے تو ایسا کچھ بھی سنا نہیں تھا۔

مائر جس پارٹی کو زمین بیچ رہا تھا ان سے ملاقات کر کے وہ رات کو لوٹا۔ اتوار کا دن تھا مجید نے اس کے آتے ہی کھانا لگا دیا۔ ''صاحب آج آپ خاصے خوش لگ رہے ہیں'' ہاں بھئی سمجھو اپنے گاؤں والی زمینوں کا سودا ہوگیا ایک ہفتے میں یہ ڈیل ہوگی تو میں واپس کلکتہ چلا جاؤں گا۔ ''اچھا'' وہ ایکدم اداس ہوگیا۔

☆......☆......☆

''کیا ہوا تمہارا منہ کیوں لٹک گیا'' مائر نے ٹی وی آن کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے جانے کے بعد مجھے کوئی اور کام ڈھونڈنا پڑے گا یہی سوچ رہا ہوں۔ مجھے کبھی مستقل کام نہیں ملا اور غربت سے تنگ آ گیا ہوں یہاں آپ کے ساتھ رہ رہا ہوں تو مجھے ڈھنگ کا کھانا مل رہا ہے، تنخواہ اس کے علاوہ ہے''

''تم فکر کیوں کرتے ہو میرے جانے کے بعد خدا تمہاری روزی کا کوئی دوسرا دروازہ کھول دے گا'' مائر نے اسے تسلی دی۔

مائر کھانا کھا چکا تھا تو مجید نے برتن سمیٹے اور لاؤنج میں بستر بچھانے لگا۔ ''تم اندر کمرے میں جاکر سو جاؤ میں یہاں ٹی وی دیکھ رہا ہوں تم ٹھیک طرح سو نہیں پاؤ گے۔'' وہ ٹی وی دیکھنے میں محو ہوگیا۔ ٹی وی پر دلچسپ سی فلم آرہی تھی۔ فلم ختم ہوگئی تو مائر نے دوسرا چینل لگا لیا اسے ابھی نیند نہیں آرہی تھی۔ اندر کمرے میں مجید بے خبر سو رہا تھا۔ ٹی وی دیکھتے وقت مائر کو احساس ہوا کہ لاؤنج میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ اس نے ٹی وی آف کر دیا اچانک اس کی نظر سامنے گیٹ پر پڑی وہاں جوزف کھڑا مسکرا رہا تھا۔

مائر جہاں تھا وہیں منجمد ہوگیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ سانس لینا بھی بھول گیا۔ وہ دہشت زدہ نظروں سے جوزف کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھ جھپکنے کی دیر تھی جوزف غائب ہوگیا۔ میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں دروازے پر تو کوئی نہیں ہے'' مائر یہ سوچ رہا تھا کہ اگلے لمحہ جوزف کا زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ آواز سن کر اس نے اپنے حواس کو مجتمع کیا۔ لاؤنج سے باہر کی طرف لپکا وہاں بدستور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی نظر زینے کی طرف پڑی اور وہ زینے کی طرف بڑھا مگر اچانک اس نے اوپر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بیرونی دروازے کی جانب وہ جیسے ہی بڑھا دائیں جانب سے ایک مردانہ ہاتھ اس کے سامنے آگیا۔ مائر خوف زدہ ہوکر ایک دم پیچھے ہٹا اس نے دوبارہ دیوار کی جانب دیکھا وہاں کوئی ہاتھ نہیں تھا اس نے اپنی نظر کا دھوکا سمجھا۔

''میں خوامخواہ خوف زدہ ہو رہا ہوں جوزف مر چکا ہے مردہ بھلا زندہ ہوا ہے؟ جوزف کی موت کا میں بھی ذمے دار ہوں۔ اسی احساس کی وجہ سے مجھے یہ سب کچھ نظر آرہا ہے یہ محض میرے دماغ کا وہم ہے''

مائر نے خود کو سمجھایا۔ اس کا ٹی وی دیکھنے کا موڈ ختم ہوگیا۔ کمرے میں آکر اس نے دراز سے نیند کی گولیاں نکالیں اور کھا کر سو گیا اگلے دن وہ صبح سو کر اٹھا تو موسم یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ دسمبر کا آخری مہینہ تھا اس لیے پہلے کی نسبت سردی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

مائر صبح کا ناشتہ کرتے ہی وہ لانگ ڈرائیو پر نکل گیا۔ سارا دن گاؤں میں گھومتا رہا۔ شام کی چائے اس نے ایک ڈھابے سے پی، ساتھ ہی گرما گرم کچوریاں کھائیں۔ کاش سوزین میرے ساتھ ہوتی تو مجھے اتنی تنہائی محسوس نہ ہوتی اب گھر جاتے ہی میں اور میری تنہائی ہوگی۔ گھر جاتے ہی وہ اداس سا سوچ رہا تھا سوزین سے اسے بہت محبت ہوگئی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ اسے بھلا نہیں پا رہا تھا۔

سنسان سڑک پر وہ پوری رفتار سے کار چلا رہا تھا

اچانک اس کی کار کے سامنے ایک آدمی آ گیا اگر وہ بروقت بریک نہ لگاتا تو وہ کب کا کچل گیا ہوتا ماڑ نے کار سے باہر سر نکالا اور سخت لہجہ میں اس سے مخاطب ہوا "اندھے ہو گیا دیکھ کر نہیں چل سکتے اگر مرنا ہی ہے تو کسی اور گاڑی کے نیچے آ کر مرو مجھے خوامخواہ کیوں پھنسواتے ہو۔"

اندھیرا ہونے کی وجہ سے ماڑ کو آدمی کا وجود ٹھیک طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس آدمی نے اپنے جسم کو بھاری چادر میں لپٹا ہوا تھا منہ پر بھی چادر کی بکل ماری ہوئی تھی "مت روکتے کار میں تو کب کا مر چکا ہوں"

"وہ آدمی اداس لہجہ میں بولا پھر کچھ وقفے کے بعد وہ بڑبڑانے لگا۔

"میں تو اس دنیا سے تنگ آ گیا ہوں تمام لوگ خود غرض ہیں سب کو دولت سے مطلب ہے جذبات اور رشتوں کا کوئی احساس نہیں ہے"

"اندھیرا ہو رہا ہے تم سنسان سڑک پر کیا کر رہے تھے؟ تمہارا گھر کہاں پر ہے؟ ماڑ نے ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔ اسے اب آدمی سے ہمدردی ہونے لگی تھی "میرا کوئی گھر نہیں بیوی مجھے چھوڑ کر اپنے عاشق سے شادی کر چکی ہے۔"

تم اپنا پتہ بتاؤ تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں آخر کوئی تو ٹھکانہ ہو گا جہاں تم رہتے ہو گے۔"

اس آدمی نے ایک جنگل کی طرف اشارہ کیا ماڑ نے ادھر دیکھا وہاں جنگل تھا۔ ابھی وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ آدمی اچانک غائب ہو گیا اس کے غائب ہوتے ہی ماڑ ایسا بدحواس ہوا کہ پوری اسپیڈ سے سڑک پر کار دوڑانے لگا۔

مجید نے اس کی کار کے ہارن کی آواز سنتے ہی فوراً گیٹ کھول دیا ماڑ کی شکل عجیب سی ہو رہی تھی۔ رنگت خوف کے مارے زرد پڑ چکی تھی۔

"صاحب کیا ہوا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے "مجید اس کے لیے گلاس میں پانی لے آیا۔ پانی پینے سے اس کی طبیعت سنبھلی۔ اس نے مجید کو اپنے ساتھ پیش ہونے والے واقعے کے بارے میں بتایا مگر اس نے جان بوجھ کر بنگلے میں ہونے والے واقعات کو گول کر دیا کہ کہیں مجید خوف زدہ نہ ہو جائے۔

"صاحب اس قسم کے واقعات کبھی کبھار کسی کے ساتھ پیش آ جاتے ہیں یہ دنیا ہے یہاں اس قسم کے حیران کن واقعات کا پیش آنا کوئی انہونی بات نہیں یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ آپ خوف زدہ ہوتے ہیں۔ آپ مضبوط اعصاب کے مالک ہیں آپ کو بھلا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے"؟ مجید کی بات سن کر ماڑ کی ذہنی حالت قدرے بہتر ہوئی ذہن ہٹانے کے لیے وہ ٹی وی دیکھنے لگا۔ مجید نے اس سے کھانے کا پوچھا اس نے منع کر دیا۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے اسے نیند آنے لگی ماڑ صوفے پر ہی سو گیا۔

باہر سرد ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھیں جو جسم کو کاٹ کر روح میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پیپل کے درخت تیز ہوا سے دوہرے ہوئے جا رہے تھے چاند کی آخری تاریخیں ہونے کی وجہ سے باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ دور سے آتی گیدڑ کی آوازیں اندھیرے میں ہولناک تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ شام ہوتے ہی شدید سردی کے باعث لوگ اندھیرا پھیلتے ہی لحافوں میں دبک کر رہ گئے تھے۔

اچانک ماڑ کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کسی کی چیخ سنائی دی۔ اس نے کمبل کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا اسے صوفے پر لیٹے ہوئے شدید سردی لگ رہی تھی دوبارہ پھر اسے چیخ کی آواز سنائی دی مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ تیسری بار جب اسے چیخ سنائی دی تو وہ صوفے سے نکلا، کمبل اوڑھ کر وہ صحن کی طرف نکل آیا کیوں کہ چیخ کی آواز اسے صحن سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی صحن میں جب ماڑ نے نظریں دوڑائیں تو۔ اس کی نظر آم کے درخت پر پڑی یہ دیکھ کر اسے شدید خوف محسوس ہوا کہ جوزف وہاں موجود تھا اور اسی طرف دیکھ رہا تھا ماڑ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اس پر گہری اداسی اور سوگواری چھائی ہوئی تھی ماڑ کسی سحر زدہ انسان کی طرح درخت کی طرف بڑھا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ روشنی بھی غائب ہو چکی تھی۔ اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا وہ مڑا۔ مجید کی نیند میں ڈوبی آواز نکلی۔ صاحب

آپ ادھر کیا کر رہے ہیں اتنی سردی ہے اور آپ صحن میں نکلے ہوئے ہیں ٹھنڈ لگ گئی تو بیمار پڑ جائیں گے آئیں اندر چلیں۔"

مائر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دوبارہ آم کے درخت کی طرف دیکھنے میں مصروف تھا" ادھر آپ کیا دیکھ رہے ہیں آپ کو یہاں کچھ دکھائی دے رہا ہے؟ ہمیں تو کچھ نظر نہیں آ رہا" مائر مجید کو کیا بتاتا کہ اس نے یہاں کچھ دیر پہلے کیا دیکھا ہے۔ وہ مجید کے ساتھ اندر آ گیا۔

مائر کا ذہن یہاں کسی طور رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس نے زمین کے کاغذات پر اگلے دن دستخط کر دیے وہ زیادہ کے لالچ میں مزید یہاں نہیں رکنا چاہتا تھا بنگلے کا وہ ویسے ہی سودا کر چکا تھا شام میں گھر پہنچا تو خاصا خوش تھا۔

"آج تو آپ بہت خوش لگ رہے ہیں کیا واپس جا رہے ہیں؟" مجید نے پوچھا "ہاں میں جس کام سے آیا تھا۔ وہ کام پورا ہو گیا۔ تمہیں تو خوشی ہو گی؟ نہیں تم تو یہ چاہو گے کہ میں مزید کچھ دن اور رک جاؤں۔"

"صاحب آپ نے کیا بات کر دی میں تو آپ کی خوشی میں خوش ہوں یہ تو مجھے پتہ ہی تھا کہ آپ کو ایک نہ ایک دن جانا ہے خدا آپ کو سدا خوش رکھے میری تو آپ کے لیے بس یہی دعا ہے۔"

"جاؤ مجید اس خوشی میں اچھی سی چائے لے آؤ" مجید فوراً چائے لے کر آ گیا۔

وہ اندر جانے لگا تو مائر نے اسے پاس ہی بٹھا لیا "کل تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا تم اپنے بارے میں بتاؤ تمہارے گھر میں کون کون ہے؟

"صاحب! میری بپتا سن کر آپ کیا کریں گے؟"

"سننے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے" مائر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بولا مجید کچھ دیر سوچتا رہا جیسے بولنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا ہو پھر اپنے بارے میں بتانے لگا۔

"صاحب! ہم دو بہن بھائی ہیں بہن عمر میں مجھ سے دس سال بڑی ہے۔ میرے باپ کو بہت شوق تھا کہ مجھے پڑھا لکھا کر بہت بڑا آدمی بنائے مگر وہ یہ حسرت لے کر دنیا سے چلا گیا۔ میں چار جماعتیں پاس کر سکا باپ کے مرنے کے بعد میرے اسکول کا خرچہ اٹھانے کے لیے ماں کے پاس پیسے نہیں تھے۔ میری ماں گاؤں کے گھروں کا کام کاج کر کے بمشکل دو وقت کی روٹی کا بندوبست کر پاتی تھی۔ میں چودہ سال کا ہو گیا تھا۔ دن بھر گلی کے لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مصروف رہتا۔ میری ماں کو میری بہن ذرینہ کی شادی کی فکر رہتی تھی۔

وہ مجھے دن رات کوستی اور ڈوب مرنے کو کہتی۔ بقول اس کے کہ میں کسی کام کا نہیں۔ اس کی پھنکار سن کر میرا دل چاہتا ہے میں کسی بڑے شہر بھاگ جاؤں وہاں مجھے کوئی کام مل جائے گا۔ اس گاؤں میں میرے لیے کوئی کام نہیں۔ جون کا مہینہ تھا گاؤں کے باغات آموں سے لدے ہوئے تھے۔ میں نے اور میرے دوست لڑکوں نے طے کیا باغ میں جا کر آم چوری کریں گے۔ ہم لوگ دوپہر کو باغ پہنچ گئے۔ گرمی شدید تھی باغ کا رکھوالا اپنی کوٹھری میں آرام کر رہا تھا۔ مجھے اور میرے دوستوں کو پتہ تھا دارا سنگھ شام سے پہلے اپنی کوٹھری سے باہر نہیں نکلے گا۔ ہم دوستوں نے خاموشی سے ڈھیر سارے آم توڑے پھر نہر پر بیٹھ کر آموں کی دعوت اڑائی۔ اس دن دوپہر کو کھانا کھانے میں اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ جب میں گھر لوٹا تو میری ماں فرش پر پڑی ہوئی تھی پاس پڑوس کی عورتیں اس کے اردگرد جمع تھیں۔ وہ مہاجن کو کوس رہی تھیں وہاں موجود عورتوں سے مجھے پتا چلا میری ماں کی دماغ کی نس پھٹ گئی ہے کیوں کہ مہاجن کی دھمکی کی وجہ سے ماں بہت پریشان تھی۔ بہن ایک کونے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ میری ماں کو محلے والوں نے اسپتال پہنچایا جہاں ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ ماں کی موت کے بعد مجھے اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑا جس سے میرے بچپن کی بہت سی یادیں تھیں۔ ماں نے مہاجن سے کچھ رقم میرے باپ کے علاج کے لیے بطور قرض لی تھی جو بڑھتے بڑھتے مکان

کی قیمت کے برابر ہوگئی وہ بیچاری ہمارا پیٹ پالتی یا سود پر قرضہ لیا اتارتی۔ میں اور میری بہن خالہ کے گھر رہ رہے ہیں خالہ خود غریب ہے۔ مجھے ڈھنگ سے کوئی کام نہیں ملتا پہلے ماں کے کوسنے سنتا تھا اب بہن ڈوب مرنے کو کہتی ہے۔" مجید کی آواز بھرا گئی۔ چائے کی پیالی خالی ہوگئی تھی، مجید نے پیالیاں اٹھائیں۔

"صاحب رات کے کھانے میں کیا بناؤں؟"

جو تمہارا دل چاہے بنالو۔" مائر نے کہا اور میگزین اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اسے کل کے دن کا بے چینی سے انتظار تھا شام ڈھلی اور رات ہوگئی۔ کھانے سے فارغ ہوکر مائر نے مجید کو ایک لاکھ روپے دیے

"یہ لو مجید اس رقم سے تم اس گاؤں میں اپنی دکان کھول لینا۔"

"صاحب یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"آج تک میں نے کسی کی کوئی مالی مدد نہیں کی آج پہلی بار کسی کو کچھ دے رہا ہوں۔ رکھ لو اسے۔"

مجید کی آنکھیں حیرت سے نکل آئی تھیں۔ اس نے اتنی بڑی رقم اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔

"صاحب آپ کا احسان میں کبھی نہیں اتار سکتا" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ شکر بھری نظروں سے مائر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جاؤ مجید جا کر آرام کرو مجھے سونا ہے۔ کیوں کہ صبح جلدی اٹھنا ہے" مائر جیسے ہی بستر پر لیٹا اسے فوراً نیند آگئی۔

☆......☆......☆

رات کے تین بج رہے تھے مائر بستر پر اٹھ بیٹھا تھا۔ دروازے پر جوزف کھڑا تھا۔ مائر کی نظریں جیسے ہی جوزف سے ٹکرائیں وہ آسیبی قوت کے زیر اثر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور جوزف کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بیرونی دروازے سے ہوتا ہوا وہ گیٹ سے باہر نکل گیا۔ باہر رات بڑی سیاہ اور بھیانک تھی۔ درختوں کی ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں دل پر ایک دہشت ناک تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ تیز ہوا سے درخت اڑے جا رہے تھے سخت سردی ہڈیوں میں برف کی طرح اتر رہی تھی۔ مگر مائر کو اس وقت نہ سردی کی فکر

☆☆☆

جہاں پھولوں کو کھلنا تھا وہیں کھلتے تو اچھا تھا
تمہی کو ہم نے چاہا تھا تمہی ملتے تو اچھا تھا
تمہیں تو دکھ ہی ملنا تھے تمہی نے صبر کھینچا تھا
تمہارے لب کسی لمحے اگر ہلتے تو اچھا تھا
بڑی مشکل تھی دشمن بھی مری خاطر وہاں پہنچے
بلا سے زخم بڑھ جاتے نہ یوں سلتے تو اچھا تھا
کٹی ہے سعد کی تم بن مگر اتنی سی ہے دل میں
اگر آتے تو اچھا تھا اگر ملتے تو اچھا تھا

سعد اللہ شاہ

تھی۔ نہ اپنا ہوش۔ وہ آسیبی قوت کے زیر اثر جوزف کے پیچھے چل رہا تھا۔ درختوں کا سلسلہ ختم ہوا مائر اونچے اونچے راستوں پر چلتا کھائی کے نزدیک پہنچ گیا۔ "صاحب رک جاؤ آگے کھائی ہے" مجید کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔

مائر نے اس کی آواز کو سنا نہیں اور کھائی میں کود گیا۔ مجید اندھیرے میں اس دوسرے شخص کی شکل کو صحیح طرح دیکھ نہیں پا رہا تھا جس کے پیچھے مائر نے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ اسی وقت پولیس اسٹیشن روانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

صبح پولیس نے مائر کی لاش دریافت کرلی۔

"تم تو کہہ رہے تھے اس کے ساتھ ایک دوسرا بندہ بھی تھا۔ جس کے پیچھے مائر کھائی میں کودا تھا۔"

"ہاں صاحب میں نے خود دوسرے آدمی کو دیکھا تھا۔ اندھیرے میں اس کی شکل دیکھ نہیں سکا تھا مگر اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ اس نے سفید رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا" "تمہاری باتوں میں کوئی حقیقت نظر نہیں آرہی اگر یہاں کوئی دوسرا آدمی گرا ہوتا تو ممکن نہیں وہ بچ گیا ہوتا اتنی بلندی سے گرنے کے بعد کسی کا بچنا ممکن نہیں۔ یہ شخص اتنی رات گئے گھر سے باہر کیوں نکلا تھا؟" پولیس آفیسر نے گہری نظروں سے مجید

کو گھورا۔

''انسپکٹر صاحب! مجھے کیا پتا میں تو سو رہا تھا رات میں میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں لگا جیسے بیرونی دروازہ کھلا ہوا ہے کیوں کہ سرد ہوا میرے اندر اتر رہی تھی، میں جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا میرا اندازہ صحیح نکلا دروازہ اور دونوں گیٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے صاحب کے کمرے میں جھانکا وہ نہیں تھے یہ سوچ کر وہ اس وقت کہاں گئے ہوں گے۔ میں گیٹ سے سڑک والے راستے پر آ گیا۔ وہاں مجھے یوں لگا جیسے آگے راستے پر کوئی شخص جا رہا ہے۔ میں نے سوچا یہ صاحب نہ ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں صاحب تک پہنچتا وہ سڑک کے نچلے راستے پر چلے گئے اور ٹیڑھے میڑھے راستے سے اونچائی پر پہنچ گئے۔ وہاں میں نے دیکھا ایک شخص نے پہلے کھائی میں چھلانگ لگائی اس کے پیچھے صاحب نے چھلانگ لگائی۔'' مجید نے جیسے ہی اپنی بات ختم کی انسپکٹر ونود نے اسے گہری نظروں سے گھورا۔

''مجھے تو تمہاری بات پر یقین نہیں آ رہا ہو سکتا ہے کہ تم نے مائر کو دھکا دیا ہو؟ تم شام میں اسے گھمانے یہاں لائے ہو اور اس کا کام تمام کر دیا ہو؟ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس کی موت کا صحیح وقت پتا چلے گا۔ فی الحال تو بنگلے پر چلو تمہارے کمرے کی تلاشی ہوگی۔ مجید اس نئی افتاد سے گھبرا گیا اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اگر مائر کی دی ہوئی رقم انسپکٹر کو مل گئی تو وہ یہی سمجھے گا۔ میں نے مائر کو دھکا دیا ہے۔ انسپکٹر ونود اور اس کے ساتھیوں نے مائر کے کمرے کی تلاشی لی اس کی جیب سے وہ چیک ملے جو اس کو اپنی زمین کی فروخت کے سلسلے میں ملے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس چند ہزار کے نوٹ ملے۔

مائر کے کمرے کی تلاشی لینے کے بعد انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں نے مجید کے کمرے کو کھنگال ڈالا مگر وہاں انھیں کوئی رقم نہیں ملی۔ مجید حیرت زدہ تھا اس نے نوٹوں کی گڈی اپنے ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھی تھی۔ پولیس نے اس کے سامنے سارے ٹرنک کی تلاشی لی تمام کپڑے جوں کے توں موجود تھے مگر نوٹ غائب تھے۔ پولیس نے گھر کی تلاشی لینے کے بعد گھر کو سیل کر دیا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ مجید کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق موت کی تصدیق ہو گئی تھی تو پولیس نے مجید کو رہا کر دیا۔ مجید پورے دن حوالات میں رہا تھا۔ رات کو وہ اپنا ٹرنک لینے کے لیے گھر پہنچا تو اس کا برا حال تھا اس نے کپڑے بدلنے کے لیے ٹرنک کھولا تو اس میں مائر کے دیے ہوئے نوٹ موجود تھے۔ مجید نے ان نوٹوں کو اسی وقت چھپا دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ کلکتہ شہر چلا گیا وہاں جا کر اس نے اس رقم سے کاروبار شروع کیا۔ چند سالوں میں اس کی دکان جم گئی تو اس نے بہن کی شادی کر دی۔ مائر کی بدولت اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ اس کے لیے دعائے مغفرت ضرور کرتا تھا۔

مجید اپنی دکان بڑھانے کے لیے سود پر قرض لینے کا سوچ رہا تھا۔ اسی دن، رات میں اس کے خواب میں مائر دکھائی دیا۔ وہ اس سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا ''مجید! تم زیادہ کے لالچ میں آ کر غلط راستہ اختیار مت کرو۔ سود پر قرض لے کر تم دکان سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گے'' اسی وقت مجید کی آنکھ کھل گئی اسے ایک ہیولہ کمرے کی دیوار کے پاس سے غائب ہوتا نظر آیا۔

مجید نے مائر کے مشورے پر عمل کیا۔ آگے چل کر اس کا کاروبار اتنا جم گیا۔ ایک دکان کی کمائی سے اس نے مزید دکانیں کھول لیں۔ مائر کی موت اور اس کے بعد پیش آنے والا واقعہ آج بھی اس کے ذہن میں تازہ ہے۔ سالوں گزرنے کے بعد وہ اکثر تنہائی میں سوچتا ہے کہ کیا واقعی مائر کسی آسیبی قوت کے زیر اثر کھائی کے نزدیک پہنچا تھا۔ مائر کے ساتھ دوسرے شخص کی موجودگی کا معمہ اس کی عقل حل نہیں کر سکی اور مائر کی دی ہوئی رقم غائب ہونے کے بعد اس کے پاس دوبارہ کیسے آ گئی، اس ماورائے عقل واقعے کو آج تک اس کا ذہن سمجھنے سے قاصر ہے۔

☆☆......☆☆

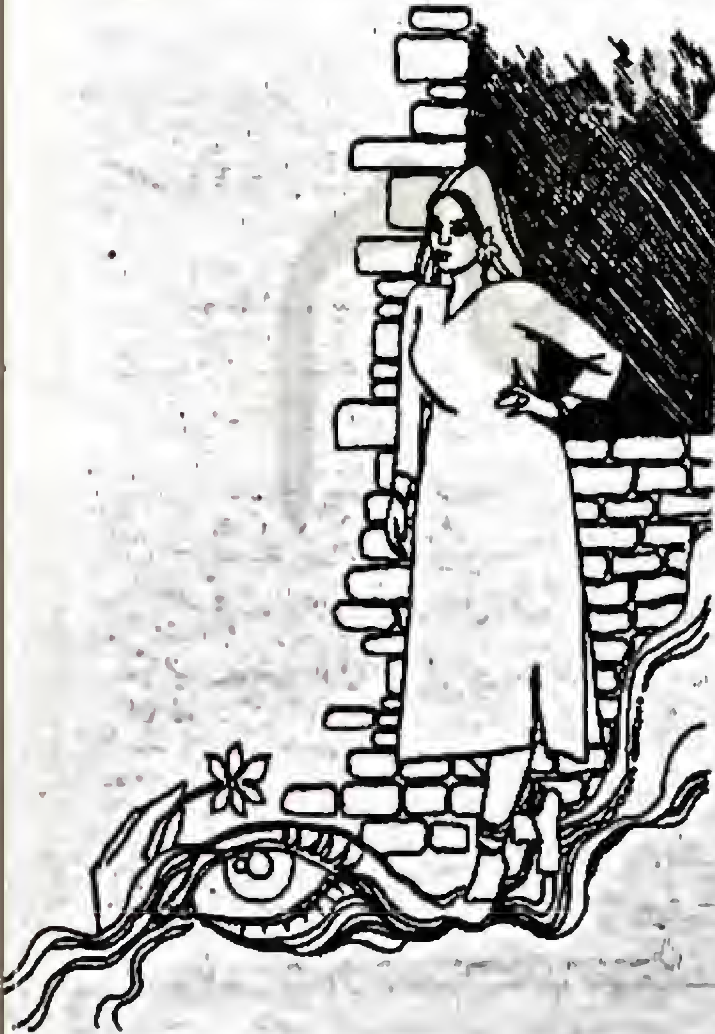




عصمت پروین عظیمی



میں کراچی میں پیدا ہوئی لیکن پنجاب کے خواجہ گھرانے سے میرے والد کا تعلق ہے یہ کہانی میرے بچپن کی یادوں سے بسی ہوئی ہے میں کبھی بھول نہیں سکتی جب میرے ابو جان آغاز اخبار میں ایک کالم پڑھتے تو ایک نام پر آنکھیں جمائے روتے رہتے تھے میں اپنی امی جان سے پوچھتی ابو جان کیوں رو رہے ہیں تو میری امی جان بتاتی کہ بیٹا جب تمہارے ابو جان چھوٹے تھے تو تمہارے تایا ابو گھر سے چلے گئے تھے وہ لڑکوں کے ساتھ گھومنے بغداد شریف گئے تھے پھر نہیں آئے اور وہاں ایک عربی لڑکی سے شادی کر لی تمہارے داد اور دادی کو روتے روتے آنکھیں دھندلا گئیں ابو جان کے کچھ رشتے داروں ماموں وغیرہ کو پتا چلا تو وہ لینے گئے لیکن ان کی بیوی نے نہیں آنے دیا انہیں ڈر تھا کہ وہ انہیں چھوڑ نہ دیں وہ چلے جائیں گے تو واپس نہیں آئیں گے ماموں کو تایا ابو نے کافی روپیا پیسا دینے کی کوشش کی لیکن ماموں نے کہا ماں باپ کو بیٹے کی ضرورت ہے تمہارے روپے کی نہیں وہ بیوی کی محبت سے مجبور تھے اور ان کی بیٹیاں بھی تھیں اب وہ ایک شوہر اور ایک باپ بھی تھے میرے تایا ابو کا نام خواجہ شمس الدین تھا میرے ابو جان چار بہن بھائی تھے پھر خواجہ محمد علی، خواجہ غنی، میرے ابو جان خواجہ محمد صدیق تھے میرے دادا کا نام محمد دین تھا۔ جو میری یادداشت میں شامل ہے میرے والد کے باقی بھائیوں بہنوں کی شادی پنجاب میں



ہوئی جبکہ میرے ابو کراچی آ گئے اور یہاں اپنے رشتہ داروں کے پاس رہنے لگے جن کی کھوڑی گارڈن میں صابن کی مشہور فیکٹری تھی جنہوں نے میرے ابو کی شادی ایک اچھی لڑکی سے کر دی جمیلہ میری امی جان کا تعلق سید گھرانے سے تھا

☆......☆......☆

امی سے سارا قصہ سننے کے بعد جب میں اپنے ابو جان کو روتا دیکھتی تو میرے دل میں یہ خواہش اور تمنا خواجہ شمس الدین کی تلاش کی ایک روز میرے سامنے روحانی اسکالر عظیمی کے نام صاحب کے نام آیا تب کسک جاگنے لگی میں بچپن سے اس کے نام کو ڈھونڈ رہی تھی میں عظیمی بابا سے ضرور ملوں گی میں سوچتی کہیں میرے بچھڑے تایا تو نہیں ہیں دل میں ایک تڑپ تھی، میں اس نام کی دیوانی ہو گئی۔ اس نام کی کشش میں بڑی ہوئی، بچپن کے دن گئے کم عمر میں میری شادی ہو گئی۔ زیادہ سے زیادہ نہیں پڑھ سکی، قرآن بھی شادی کے بعد مکمل کیا اور ایک میرے ابو بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے اور اپنے بچھڑے بھائی کی یادوں کے ساتھ رخصت ہو گئے میں شادی کے کچھ عرصے بعد کراچی سے حیدر آباد اور وہاں سے کراچی آتی جاتی رہی میرے شوہر امول پکچرز کے نام سے فلموں کا کاروبار کرتے تھے۔

☆......☆......☆

حمید صاحب ایک بہت اچھے اور نیک دل انسان تھے۔ وہ فلم کے لیے نور محل سینما گئے، وہاں ہمیں ایک چھت پر بڑا ہال نما کمرہ رہائش کے لیے ملا جس کے چاروں طرف کھڑکیاں تھیں میرے شوہر نیچے فلم آفس میں ہوتے تھے میں اکیلی سیڑھی سے دو چار قدم نیچے اتر کر فلم کی آواز سن کر خوش ہوتی رہتی لیکن مجھے ایسا لگتا میرے علاوہ کوئی اور بھی میرے ساتھ ہے میں اکیلی نہیں ہوں کسی کی موجودگی کا حساس ہوتا تو میں ڈر جاتی میں اپنے شوہر حمید صاحب سے کہتی تو وہ میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہتے ڈرو نہیں یہاں اچھے بزرگ کا سایہ ہے۔ یہ ان کی گزرگاہ ہے اکثر مجھے ایسا لگتا ہے وہاں سے کوئی گزر رہا ہے جیسے کوئی سایہ میرے

فرض سے غفلت موت ہے......اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے پاک وطن کو دشمنوں سے محفوظ رکھیں، آپس کے جھگڑوں کو بھول کر صرف اور صرف عرض پاک سے محبت کریں، اس کی عزت اور اسلامتی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں۔ دوستوں اور دشمنوں میں فرق کرنا نہیں سیکھا تو دشمن کو بچانا محال ہوگا۔ اپنے آپ کو بچانا ناممکن ہوگا۔ پاکسان کی سلامتی کے لیے، اپنی سلامتی کے لیے ایک ہو جائیے۔

پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!

منزہ سہام کی کتاب 'اُجلے حروف' سے اقتباس

شوہر تو شادی سے پہلے بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے اس لیے نہیں ڈرتے تھے پھر ہم کراچی آ گئے تقریباً کوئی دو ماہ بعد حیدر آباد جانا ہوا۔ وہاں میری دوستی ایک لڑکی سے ہو گئی جس کا نام شاہینہ تھا میرے شوہر رات بارہ بجے آتے تھے ہم دونوں پورا دن باتیں کرتے تھے۔ ایک روز میں گھر کے کام سے فارغ ہو کر لیٹی اور رسالہ پڑھنے لگی تو ایسا لگا جیسے کوئی سایہ صحن میں اتر رہا ہے میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر وہ سایہ دیوار پر لمبا ہوتا چلا گیا میں بری طرح گھبرا گئی اور میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ میں کانپتی ہوئی باہر آ گئی اور دوسرے پورشن میں بھاگ کر اپنی دوست شاہینہ سے لپٹ گئی میرا خوف کے مارے برا حال تھا۔ میں بُری طرح کانپ رہی تھی سب میرے خوف کی وجہ پوچھ رہے تھے لیکن خوف کے مارے میرے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ میرے شوہر آئے، مجھے لے کر واپس گھر کے پورشن میں گئے مجھے وہاں ڈر لگتا تھا کچھ دن بعد وہ مجھے لطیف کل کے نام سے مکان میں لے گئے۔ اس کے بعد وہ مجھے کراچی لے آئے۔

کراچی آنے کے بعد اس سائے نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ جب میں تنہا ہوتی تو وہ سایہ مجھے واضح نظر آتا، مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی میری گردن دبا رہا ہے۔ یہ میری کیفیت اکثر ہوتی۔ میں اپنے شوہر

سے ذکر کرتی تو وہ کہتے ڈرامت کرو۔ آیت الکرسی پڑھا کرو پر قدرتی طور پر میرے منہ سے درود شریف کا ورد جاری ہوتا۔

کراچی آتے ہی مجھے سلسلہ عظیمیہ کے بزرگ کا خیال آیا تو میں نے ایک ڈائجسٹ سے ان کا ایڈریس اور فون نمبر لیا اور گرتی پڑتی ہوئی سرجانی ٹاؤن پہنچ گئی۔ انجان راستے پہلی بار سرجانی ٹاؤن گئی تھی، لہذا ان راستوں سے ناواقف تھی۔ وہاں پہنچ کر میں ان سے ملی۔ میں اپنی بچی کو خود دکھانے گئی تھی جیسے ہی عظیمی صاحب کو میں نے بیماری کا بتایا ساتھ ہی میرے منہ سے بعیت کا بھی نکل گیا۔ مرشد نے کہا بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گئی پھر انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور دم کیا۔ مجھے ایسا لگا کہ سر سے لے کر پاؤں تک ٹھنڈک ہی بھر گئی۔ انہوں نے کہا گھر جاؤ اپنے نام اور ایڈریس بتاؤ، میں گھر گئی۔

☆......☆......☆

کچھ دن بعد میرے پاس پاس ایک خط آیا جس میں میرے نام کے آگے عظیمی لکھا تھا عظمت پروین عظیمی۔ میں بہت خوش ہوئی میری خوشی کی کوئی انتہاء نہیں تھی۔ میری روح کو سکون آ گیا، پھر میں نے ان کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھیں، مجھے میرے مرشد قدیم تو مل گئے یہ ایک رشتہ جڑا لیکن میرے تایا نہیں ملے۔ وہ جنہیں میں بچپن سے آج تک ڈھونڈتی آ رہی تھی وہ آج تک لاپتا ہیں، لیکن میں خوش نصیب ہوں کہ میں نے اپنے تایا کو ڈھونڈنے میں اپنے پیارے مرشد کو پایا۔

میں بہت کچھ لکھتی ہوں وظیفہ کرتی ہوں مراقبہ ہال جاتی ہوں، میری ڈیوٹی لگتی ہے اور میرے گھر میں بھی درود شریف درس وغیرہ ہوتا ہے۔

میرے شوہر حمید صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے، اب میری کل کائنات میرے بچے ہیں۔ میری پانچ بیٹیاں اور پانچ بیٹے ہیں۔ سب بہت نیک، خوب صورت اور خوب سیرت ہیں۔ اللہ کا شکر ہے، فرماں بردار ہیں۔ اللہ سب کا حامی ہو اور سب کو نیک اور ہر سفر میں کامیابی دے۔ (آمین)

☆......☆......☆

ایک غلطی

رضوان قیوم

دو مذاہب کے گرد گھومتی اسرار بھری داستان

اس دلچسپ کہانی کو مجھے ایک شخص طارق زمان نے یوں سنایا تھا کہ یہ 1987ء کی بات ہے کہ مجھے اپنی اماں کے ساتھ سمجھوتہ ایکسپریس گاڑی کے ذریعے کلکتہ بھارت جانے کا اتفاق ہوا۔ میں اور اماں جس دن بھارت جانے کیلئے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچے تو وہاں یہ دیکھ کر دل ہول گیا کہ وہاں بھارت جانے کیلئے مسافروں کا اتنا رش تھا کہ اُسے لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔

''ارے بیٹا یہ ہزاروں مسافروں کو چھوٹی سی ٹرین کس طرح ہضم کرلے گی۔ اماں واقعی لگتا ہے آج کی ٹرین سے ہم اپنی منزل پر نہ پہنچ پائیں گے''۔ ہم جس گاڑی کے ڈبے میں بیٹھنے کیلئے کوشش کرتے وہ پہلے ہی مسافروں سے بھرا ہوتا تھا۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو کسی نہ کسی طریقہ سے لپک کر اپنے لیے کوئی نہ کوئی سیٹ حاصل کرلیتا۔ لیکن میرے ساتھ کیونکہ بیمار، بوڑھی والدہ تھی اورانھیں چلنے میں دشواری پیش آیا کرتی تھی۔

اماں کو میں نے ایک جگہ بٹھا دیا تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس ٹرین میں کس طرح جگہ حاصل کی جائے کہ اتنے میں میرے کندھے پر کسی نا معلوم شخص کا ہاتھ پڑا میں نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو میری نگاہوں کے سامنے ایک جوان قلی کھڑا تھا۔ ''باؤجی لگتا ہے آپ کو اس بھری ٹرین میں دو سیٹیں چاہئیں''۔ ''ہاں، ہاں'' میں نے اسے ضرورت مندوانہ انداز میں کہا تھا۔ اس قلی نے مجھ سے دو سیٹوں کے عوض بھاری رقم مانگی تھی۔ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ ''اچھا تمہاری مرضی''۔ وہ یہ کہہ کر آگے چلا گیا تو اُسے وہاں کھڑے ایک بڈھے نے آواز دی۔ ''ذرا میری بات سنو''۔ وہ تیزی سے چلتا قلی رک گیا۔ ''ارے میاں ہمیں دو سیٹیں چاہئیں۔ ہاں مل جائیں گی۔ اچھا کتنے روپے لوگے'' اس نے ان بزرگوں سے روپے مانگے تھے۔ جتنے کے ہم سے مانگے تھے۔ ہمیں بٹھا دو۔ اُس بڈھے شخص نے اپنی بنڈی کی جیب سے اس کے منہ مانگے روپے دیئے۔ میری اماں میرے قریب آئی اور اُس نے مجھے کہا کہ ''بیٹا طارق۔ اس قلی کا منہ پھونک دے۔ جہاں ہم نے اس سفر میں اتنے روپے خرچ کئے ہیں۔ وہاں اسے بھی رشوت دے دے مجبوری ہے''۔ ماں کی باتوں میں وزن تھا۔ میں نے اس قلی کے پاس جاکر کہا کہ ''بھائی چلو مجھے بھی اتنی ہی رقم کے برابر دو سیٹیں دے دو جتنی کہ اُس بوڑھے شخص کو آپ کو دی ہے''۔ میری شکل کو بڑی غصیلی نگاہوں سے عجیب طریقہ سے دیکھا اور پھر بڑے دل جلے انداز میں بولا۔



"نہیں۔جی۔میں تمہیں اس ٹرین میں جگہ نہیں دلا سکتا۔ایک تو میں تمہیں پریشان دیکھ کر تمہاری مدد کرنا چاہ رہا تھا تو دوسری طرف تم نے میری نیکی کو ٹھکرا دیا۔" میاں غصہ تھوک دو۔انہیں بھی ہمارے ساتھ دو سیٹیں دے دو۔اُس بڈھے نے اُس قلی کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"بزرگوں آپ کہتے ہیں تو آپ کا کام کر دیتا ہوں۔وہ آجکل اجمیر شریف کا عرس چل رہا ہے اس لیے یہاں آجکل انڈیا جانے والے زائرین کا مسافروں کا رش ہے۔ویسے عام دنوں میں یہ ٹرین تقریباً خالی جاتی ہے۔" اُس بڈھے کے ساتھ تو ایک ادھیڑ عمر کی لڑکی بھی تھی اسکی عمر دیکھنے میں 30-35 کے درمیان ہوگی۔قلی ہمیں ٹرین کے اندر لے گیا۔وہاں موجود مسافر بڑی مشکل سے سکڑتے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے۔قلی نے پہلے مجھے چڑھایا اور پھر مجھے کہا کہ کونے میں کسی طرح جا کر وہاں موجود ایک بڑا چوبی بکس اٹھاؤ۔میں نے اس کے کہنے کے مطابق وہ چوبی بکس اُٹھا لایا۔وہ لکڑی کا چوبی بکس قلیوں نے جگہ گھیر کر اس لیے رکھا ہوا تھا۔تاکہ وہ مسافروں کو وہ جگہ دے دے کر فالتو روپے کمائیں۔وہ قلی ہمیں ایسے جیسے بٹھا کر چلا گیا۔سفر کے دوران اُس بڈھے نے اپنا نام مطلوب احمد بتلایا تھا۔جبکہ بیٹی کا نام سفینہ بتلایا تھا۔نیز اُس نے صرف یہ بتلایا کہ وہ ہندوؤں کے مقدس مذہبی شہر بنارس کے ایک مندر میں اپنے سائیں بیٹے سے ملنے جا رہا ہے۔میں نے اُس سے تجسس کے عالم میں پوچھا کہ "آپ مسلمان ہیں تو آپکا بیٹا سائیں حالت میں وہاں کیوں ہے۔" میرے اس سوال پر وہ بوڑھا اسطرح خاموش ہو گیا تھا۔جیسے کہ وہ میرے سوال کا جواب دینا نہیں چاہ رہا ہو۔میں اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔اُس شخص نے ٹالم ٹولی کرتے ہوئے اپنی باتوں کا رخ کسی اور بیکار موضوع کی جانب موڑ دیا۔امیگریشن کے بعد جب ٹرین واہگہ سے چلی تو بھارت نے اُس ٹرین کیساتھ اپنے چند اضافی ڈبے لگا دیے تھے۔یہاں مسافر کسی حد تک کھل کر آرام سے بیٹھ گئے تھے۔وہ بوڑھا مجھ سے ہٹ کر بیٹھ

گیا۔ اسکے ساتھ آئی ہوئی بیٹی اماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ جبکہ میرے ساتھ ایک بڑا باتونی قسم کا آدمی آ کر بیٹھ گیا یہاں یہ بات بتلانا ضروری ہے کہ سمجھوتہ ایکسپریس ساری رات بھارتی علاقہ میں چل کر پہلے دہلی جاتی ہے۔ اور پھر وہاں سے آگے پاکستان سے آئے مسافر اپنے اپنے مطلوبہ شہروں کو آگے ٹرین پکڑ کر جاتے ہیں۔ سفر میں مجھے ایک لمحے کے لئے نیند نہیں آئی ہے۔ ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے دہلی کی جانب گامزن تھی۔ ''آپ بھارت کس شہر جا رہے ہیں؟'' اُس شخص نے خود ہی سفرانہ انداز کی دوستی کا آغاز کرتے ہوئے کہا اپنی اماں کیساتھ اپنے ماموں کی بیٹی کی شادی کی غرض سے کلکتہ جا رہا ہوں۔ اسی طرح جواباً اُس شخص نے اپنا نام عبدالحیٔ بتلایا اور کہا کہ وہ ہاپڑ شہر میں جا رہا ہے۔ سمجھوتہ ایکسپریس ریل کی پٹڑی پر دوڑ رہی تھی۔ کہ میری اماں بڑی پریشان کن گھبرائی ہوئی حالت میں میرے پاس آئیں۔ انہوں نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلا کر کہا ادھر آؤ۔ میں جب ان کے قریب گیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ بیٹا یہ بڈھا مطلوب احمد جو تمہارے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ یہ کوئی اوپری مخلوق سے تعلق رکھنے والا ہے۔

میں نے پریشان کن انداز میں ان سے پوچھا کہ یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ انہوں نے کہا میرے ساتھ جو اس بڈھے کی بیٹی لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے پاؤں ذرا آ کر دیکھو وہ بالکل عجیب کھدرے سخت لکڑی کی طرح ہیں۔ اور اس کی ناک میں نیچے وہ خم ہے جو کہ غیر انسانی مخلوق میں ہوتا ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ اماں کے بوڑھے ذہن کا تصور ہے۔ لیکن پھر بھی میں اپنی تسلی کیلئے اس لڑکی کے پاس گیا۔ وہ وہاں تھکاوٹ سفر کی وجہ سے گہری نیند سو رہی تھی۔ اماں نے اس سفید رنگ پر مشتمل لڑکی کے پاؤں سے چادر سرکائی تو واقعی یہ منظر دیکھ کر میرا دل دہل گیا کہ واقعی اسکے پاؤں بڑے عجیب و غریب سخت لکڑی کی مانند کھدرے تھے۔ اور ان پر مچھلی کی طرح کے نشان تھے اور اس کی ناک کے نیچے جو خم تھا وہ بھی بڑا منفرد قسم کا تھا۔ میں بھی اپنے تئیں پریشان ہو گیا تھا۔ اماں نے مجھے کہا کہ تو اپنے سامنے بیٹھے بڈھے کو کہہ کہ وہ اسے اپنے پاس بلا لے۔ میں نے اماں کو کہا کہ ایک رات کی تو بات ہے۔ آپ صبر و شکر کر کے یہ سفر کاٹ لیں۔ بری بات ہے کہ میں اُس بڈھے کو کہوں کہ وہ اپنی بیٹی کو اپنے پاس بلا لے۔ وہ ویسے بھی مردانہ میں بیٹھا ہوا ہے اور وہاں ایک بھی عورت نہیں ہے۔

اماں نے مجھے کہا کہ بیٹھ اور اس سے زیادہ نہ گھل مل، میں سہمی اماں کی جانب سے جب ان کی بات سن کر اپنی جگہ آیا تو میرے ساتھ باتونی شخص عبدالحیٔ بیٹھا تھا اُس نے مجھے کہا'' بھئی طارق صاحب آپ کی والدہ بہت گھبرائی۔ پریشان تھیں خیریت تو تھی۔'' میں نے اُسے اماں کی جانب سے کی گئی سفینہ کے عجیب کھدرے پاؤں اور ناک میں خم کے بارے میں بتلایا۔ نیز انہیں میں نے یہ بھی بتلایا کہ ان بزرگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بنارس ایک مندر میں اپنے سائیں بیٹے سے ملنے جا رہے ہیں۔ اُس شخص نے پان چباتے ہوئے کہا۔''ہاں بھئی سچی بتلاؤں۔ میں نے بھی اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ غیر انسانی مخلوق کی ناک کے نیچے ایک خمدار زخم ہوتا ہے۔'' میں نے اپنے سامنے گم صم سر جھکائے بیٹھے اسکے باپ مطلوب احمد کی جانب دیکھا وہ بالکل ایک نارمل انسان لگ رہا تھا۔ جبکہ اس کی بیٹی جسکا اُس نے نام پہلے ہی سفینہ بتلایا تھا۔ وہ بھی عام انسانوں والی ادھیڑ عورت سی لگ رہی تھی۔ عبدالغنی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''یار تم پریشان نہ ہو یہی بات ہے۔ میں اس بڈھے کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔ تم کچھ نہ بولنا۔ میں رفتہ رفتہ اس کے پیٹ سے اُس کی حقیقت کو اگلواتا ہوں۔'' عبدالحیٔ نے اس گم صم سر جھکائے بڈھے کو آواز دیکر بلا کر کہا چچا ذرا ہمارے پاس آ کر کچھ باتیں کر کے ہمارا سفر کٹوا دو۔ وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بیڑی، سگریٹ چائے پیتے ہو۔ بزرگو کسی چیز کا دل کر رہا ہو تو بتلاؤ۔ جی نہیں مہربانی۔ میں سگریٹ ضرور پیتا ہوں۔ میرا برانڈ میرے پاس ہے۔ مطلوب احمد نے اپنی بنڈی سے سستے قسم کے برانڈ کے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر پہلے اپنے لبوں پر ایک سگریٹ لگایا۔ اور پھر اُس نے ہم دونوں کو اس کی آفر کی۔ بزرگو میں سگریٹ نہیں پیتا۔ حالانکہ میں سگریٹ پیتا تھا۔ لیکن میں ان کے ادب کی وجہ سے خاموش رہا۔ اور دوسرے میری اماں تقریباً میرے سامنے بیٹھی تھی۔ معاف کرنا۔

تمہارے پہلے تو نے دانت اس امر کی چغلی کھا رہے ہیں
کہ تم سگریٹ پیتے ہو۔ اگر طلب ہو رہی ہے۔ تو بیٹھ موڑ
کر اور اس لے کر دھواں نکال دو۔ بڈھے مطلوب احمد
نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کافی تجربہ کار
جہاں دیدہ لگتے ہیں۔ ہاں وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔
یہی وقت انسان کو تجربہ کار بھی بناتا ہے۔ اور جہاں دیدہ
بھی“ میں نے مطلوب احمد کی جانب سے دی گئی سگریٹ
لیکر اوٹ میں پینا شروع کر دی۔ کھٹا کھٹ۔ کھٹا کھٹ کی
مخصوص آوازوں کیساتھ ہچکولے کھاتی ہوئی سمجھوتہ
ایکسپریس دہلی کی جانب دوڑ رہی تھی۔ مطلوب احمد بھی
خلاف توقع عبدالحئی کی طرح باتونی ثابت ہوئے تھے۔ وہ
دوران سفر نت نئے موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔
میں ان کے درمیان ہونے والی باتوں میں ہوں۔ ہاں
کرتا رہا۔ باتوں کے دوران عبدالحئی مجھے آنکھ مار کر اسی
امر کی کا اشارہ دیتے رہے تھے کہ میں انہیں ان کی
حقیقت اگلوانے کی قریب سے قریب تر لا رہا ہوں۔
ایک اسٹیشن پر سمجھوتہ ایکسپریس ستانے کیلئے رکی۔ تو
عبدالحئی نے ہم دونوں کو چائے۔ لسکا، انڈین کولڈ ڈرنکس
سے تواضع کی۔ مطلوب احمد جب زیادہ ہی باتوں میں
رواں ہوئے تو عبدالحئی نے اس سے بڑے ملائم انداز
میں سوال کیا کہ۔

”آپ بھارت کے کس شہر میں جا رہے ہیں۔“
انہوں نے کہا کہ میں بنارس ایک مندر میں اپنے سائیں
بیٹے سے ملنے جا رہا ہوں۔ ”یہ ہمارے لیے بڑے اچنبے
کی بات ہے کہ آپ اور آپ کی بیٹی الحمد اللہ مسلمان نظر
آ رہی ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی بتلا رہے ہیں
کہ آپ کا بیٹا سائیں ہے۔ اور وہ بنارس کے ایک ہندو
مندر میں ہے۔ دراصل بزرگو آپ کی جانب سے کی گئی
باتوں نے ہمارے ذہنوں میں کئی سوالات پیدا کر دیئے
ہیں“ عبدالحئی نے اپنی باتوں کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ
کیا آپ یہ بتلانا مناسب سمجھیں گے آپ اور آپ کی بیٹی
مسلمان ہیں اور بیٹا غالباً ہندو یہ کیا ماجرہ ہے؟ مطلوب
احمد نے خفیف سا مسکرا کر ہماری جانب دیکھا اور ہمیں کہا
کہ آپ نے مجھے کہا تھا نہ کہ میں جہاں دیدہ، تجربہ کار
معلوم ہوتا ہوں۔ بیٹا طارق آپ کی والدہ نے آپ کو
یقیناً اپنے پاس میری بیٹی سفینہ کے پاؤں دکھلانے کیلئے بلا
یا تھا۔ میں نے اثبات میں اپنی گردن ہلا دی۔ مطلوب
احمد نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیکر گاڑھا مرغولہ نکالتے
ہوئے کہا۔ ”میں پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ تم لوگوں نے
مجھے اپنے دلوں، دماغوں میں اٹھنے والے سوالات
اندیشوں کے جوابات کے سننے کے لئے بلایا تھا۔“ اچھا
چچا آپ نے ہمارے دل کی طلب کو بھانپ ہی لیا ہے۔ تو
کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنی ذات سے لپٹے راز کو بتلا دیں
۔ ویسے کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنا قانوناً اخلاقاً بری
بات ہے۔ ایک توقف کے بعد اُس نے کہا کہ میں آپ
کے دلوں، دماغوں میں پیدا تجسس کے بوجھ کو اٹھانے کی
خاطر آپ کو اپنی زندگی سے نا قابل یقین کہانی سنا
دیتا ہوں۔ مطلوب احمد نے اپنی کہانی کا آغاز یوں کیا۔

”میں جب جوان ہوا تو میری شادی میرے ماموں کی
بیٹی شبنم سے ہوئی تھی۔ میری بیوی انتہائی خوبصورت
ہونے کیساتھ ساتھ بڑی فیشن ایبل، چنچل اور مزاحیہ
فطرت کی حامل تھی۔ اسکے چہرے پر ہر وقت قہقہے لطیفے
چہکتے رہتے تھے۔ شغل کھانے پینے کی محفلیں لگانا اسے
پسند تھا۔ وہ دراصل اپنے مالدار باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ
اگرچہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ لیکن مجھے اس کی یہ
بات دل کو ذرا نا گوار گزرتی تھی۔ کہ وہ ارد گرد کے چھوٹے
بڑوں کی نقلیں اتارا کرتی تھی۔ اور ہر وہ بات زبان سے
سب کے سامنے برملا طور پر سامنے نکال دیتی تھی۔ جو اس
کے دل میں آتی تھی۔ وہ زیادہ تر شغلیہ، مزاحیہ انداز کی
باتیں کیا کرتی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے بالخصوص تاریخی
مقامات دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اسکے اور میرے بنارس
شہر میں کچھ قریبی رشتہ دار تھے۔ میرا وہاں ننھیال تھا۔ میں
نے اس کی خواہش کے مطابق بنارس شہر جانے کا پرمٹ
لیا۔ اُس زمانہ میں دونوں ملکوں کی سرحدوں کے آر پار
جانے کے لیے آج کل کی طرح کوئی سختی نہیں ہوا کرتی
تھی۔ سپانسر وغیرہ وغیرہ کا کوئی جھنجٹ نہ ہوا کرتا تھا۔
میں شبنم کو بنارس اپنے ماموں کے گھر لے گیا تھا۔ میرے
ماموں کے خاندان نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا انھوں نے
ہماری دل و جان سے عزت کی۔ ہمارے ماموں کے
پاس اپنی موٹر گاڑی تھی۔ انھوں نے ہمیں موٹر گاڑی بمعہ

ڈرائیور دے دی تھی اور اسکے ساتھ ساتھ انہوں نے مجھے اُس دور کیمطابق اچھی خاصی رقم خرچ کے لیے بھی دے دی تھی۔ ہم سارا دن ماموں کی موٹر کی گاڑی لیے پھرتے رہے۔ ہم نے خوب انجوائے کیا تھا۔ ہم لوگ جب لانگ روڈ کے قریب سے گزرے تو ڈرائیور نے کہا کہ یہاں قریب ہی ایک صدیوں پرانہ جین مذہب کے پیروکاروں کا مندر موجود ہے۔ اور اس سے ملحقہ ایک جدید پارک بھی موجود ہے۔ اسے دیکھ کر آپ لازماً خوش ہوں گے۔ میں دل سے وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن شبنم بضد ہوگئی کہ میں نے وہاں جانا ہے۔ ہم جب اُس جین مندر کی حدود میں پہنچے تو وہاں تفریح کی غرض سے سینکڑوں لوگ آئے ہوئے تھے۔ مندر ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا تھا۔ جسکے آدھے رقبہ پر ایک جدید سہولیات سے لبریز تفریح پارک تھا اور دوسرے آدھے حصے میں مندر کی وسیع بلڈنگ موجود تھی۔ شبنم نے گاڑی سے اترتے ہی اُس مندر کو دیکھا تو اُس نے خوشی سے کہا کہ یہاں یقیناً مجھے مزا آئیگا۔ یہ میرے ٹیسٹ کی جگہ ہے۔ جین مندر کی بلڈنگ انتہائی پرانی لگ رہی تھی۔ وہ مندر 11 سو سال پرانا ہے۔ یہ بت بھی اُس وقت کے ہیں۔ میں اور شبنم اُس مندر کے اندر گھسے تو ہماری نگاہوں کے سامنے بڑے دیوہیکل کالے پتھروں کے کھڑے بت موجود تھے۔ انھیں دیکھ کر یہ حیرانگی ہو رہی تھی۔ کہ انھیں کس طرح بنایا گیا ہوگا۔ وہ چونکہ صدیوں پرانے بنے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی شکل وصورت میں کافی گھساؤ آچکا تھا۔ ایک بڑے بت کے پاؤں پیچھے کی جانب مڑے ہوئے تھے۔ شبنم نے اُسے دیکھتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق اس کا تمسخر اڑانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹا مار کر ہنسنے لگی مطلوب احمد اسکے پاؤں دیکھو کیسے مڑے ہوئے ہیں۔ شبنم کے ٹھٹوں کو مندر میں موجود چند پجاریوں نے سن لیا تھا۔ ان میں سے ایک پجاری نے اسے کہا کہ یہ تم ہمارے مقدس بتوں دیوتاؤں کا مذاق کیوں اڑا رہی ہو۔ ان سے معافی مانگو۔ نہیں یہ تو ہے ہی ایسے۔ مطلوب احمد اُس بت کی شکل اور خاص طور پر پیر کیسے ہیں۔ یاد رکھو تم نے اگر ان بتوں سے کی گئی گستاخانہ باتوں کی معافی نہ مانگی تو یقیناً نا صرف تمہیں بلکہ تمھاری نسلوں کو اس کا سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ شبنم نے اُس پجاری کی ان باتوں کو نظر انداز کر کے پھر سے ٹھٹا مار کر اس بت کے بھدے پاؤں کو دیکھ کر مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ ہم وہاں بمشکل گھنٹہ ہی ٹھہرے ہوں گے۔

ہم جب ماموں کے ہاں ہی تھے کہ ایک دن شبنم نے مجھے بتلایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ میں نے اُسے خاموشی سے کہا کہ چلو۔ اس لحاظ سے بھارت کا ہمارا یہ سفر خوش آئند رہا۔ میں نے محسوس کیا شبنم دن بہ دن خاموش طبع اور سست رہنے لگی تھی۔ وہ زیادہ ہنستی تھی اور نہ ہی اسکے اندر وہ ولولہ چہک تھی جو کہ پہلے بھی تھی۔ ہمارا بھارت کا قیام ختم ہونے کو آیا۔ ہم نے اُس رات پاکستان واپس آنا تھا۔ ہم اپنا ضروری سامان پیک کر کے اسلیے جلدی سو گئے تھے کہ ہم نے صبح جلدی پاکستان جانے کے لیے بارڈر جانا تھا۔ رات کے تیسرے پہر یہ ہوا کہ شبنم نے اچانک ایک ایسی زوردار چیخ ماری کہ ماموں کے گھر میں سوئے ہوئے سارے لوگ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ شبنم پاگلوں کی طرح الٹے سیدھے الفاظ نکالتی ہوئی چلا رہی تھی۔ اُس کے منہ سے نکلی ہوئی ایک بات بھی پلے نہ پڑ رہی تھی۔ اسکے گرد ماموں کا پورا خاندان جمع ہو چکا تھا۔ ماموں اور چند بزرگوں نے اُس پر قرآنی آیتیں پڑھ کر پھونکنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے یہ ہوا کہ اسکی حالت میں قدرے سنبھلاؤ آ گیا تھا۔ اُس سے میں نے بڑے پریم سے پوچھا "شبنم تجھے کیا ہوا ہے۔" اُس کا ماتھا پسینے سے لبریز ہو چکا تھا۔ اُس نے انتہائی آفسردگی سے کہا کہ میرے خواب میں عجیب وغریب شکلیں بن رہی ہیں۔ اور وہ مجھے غالباً اپنی جانب بلا رہی ہے۔ بیٹی سو جاؤ۔ صبح تم نے ویسے بھی پاکستان واپس جانا ہے۔ ہم لوگ واپس اپنے گھر گجرات آ گئے۔

پاکستان آ کر شبنم انتہائی خاموش پریشان کن رہنے لگی تھی۔ میں اُسے گائنی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا تھا۔ وہ مجھے کہتی تھی کہ شبنم کو سمجھاؤ کہ وہ بے مقصد خوف کے دائرے سے نکلے اسطرح اس کے بچے کی صحت پر فرق پڑے گا۔ شبنم نے کھانے پینے اپنی ضروری دوائیوں کو

لینے میں بڑی لاپرواہی اختیار کی ہوئی تھی ۔ میں اُسے خوش کرنے اور اسکا ذہن تبدیل کرنے کے لئے ایک تفریحی مقام پر بھی لے گیا تھا۔ لیکن اس کی حالت بدستور پریشان کن رہی۔ شبنم اکثر دیوانوں کی طرح کہتی تھی کہ مجھے خوابوں میں بت آکر کہتے ہیں کہ تیری سزا اُس وقت تک ختم نہ ہوگی ۔ جب تک ہم تجھے معاف نہیں کریں گے۔ شبنم نے میری ایک بچی کو جنم دیا۔ وہ شکل وصورت سے تو بہت خوبصورت تھی۔ لیکن اسکے پاؤں حیرت انگیز طور پر کھر درے تھے۔ اسکے پاؤں بالکل اُس بت کے پاؤں کی طرح تھے جیسے کہ ہم نے بنارس کے جین مندر دیکھے تھے۔

شبنم رو رو کر کہہ رہی تھی کہ مجھے بنارس کے بت اس امر کی سزا دے رہے ہیں۔ کہ میں نے ان کے پاؤں کا مذاق اڑایا تھا۔ میں اور دیگر لوگ اسے سمجھاتے رہے ہم اسے کہتے رہے کہ تو بچی کی اسطرح کج پاؤں والی پیدائش محض ایک اتفاق ہے۔ لہٰذا اس کی وہ فکر نہ کرے میں نے اپنی نوزائیدہ بچی کا جگہ جگہ مختلف ڈاکٹروں کے پاس جاکر بہت علاج کروایا تھا۔ لیکن اسے کوئی آرام نہ آیا تھا۔ شبنم اس کے پاؤں دیکھ کر خوب رویا کرتی ۔ دوسری جانب میرا بھی اُسے دیکھ کر بہت دل میلا ہوتا تھا۔ لیکن میں اسکے منہ پر کچھ نہیں کہا کرتا تھا۔

شبنم ہر وقت کھوئی رہتی یا وہ کوئی نہ کوئی دیوانوں جیسی باتیں کیا کرتی تھی۔ اُسے مجھ سے کوئی محبت نہ رہی تھی ۔ مجھے کسی نے کہا کہ اسے ماہر علمیات جادو ٹونہ کرنے والوں کے پاس لیکر جاؤ۔ میں شہر در شہر لیکر مختلف جادو ٹونہ کرنے والے ماہر علمیات وغیرہ کے پاس لیکر بھی گیا تھا۔ وہاں بھی اسے کوئی آرام نہ آیا تھا۔ وہ ہفتہ میں دو چار مرتبہ چلا کر واویلا کرتی تھی کہ مجھے خوابوں میں بنارس کے جین مندر میں موجود بت کہتا ہے کہ میرے پاس آکر مجھ سے معافی مانگ اور میری تپسیا کر تو میں تجھے معاف کردوں گا۔ اسی دوران اُس نے دوسرا بیٹا جنا۔ لیکن اس کا پاؤں بھی میری پہلی بیٹی پلوشی کی بچی کی طرح پیچھے کی جانب مڑا ہوا تھا۔ اور بری طرح کج کھایا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر تو میں بھی بچی بات ہے ۔ ڈر گیا تھا کہ واقعی یہ بنارس میں موجود بتوں کی ناراضگی کے سبب کا نتیجہ ہے۔

ابلیس کی تاریخ

اسی ہزار سال تک ملائک کا ساتھی رہا، چالیس ہزار سال تک جنت کا خزانچی، بیس ہزار سال تک ملائک کو وعظ سناتا رہا۔ تیس ہزار سال تک مقربین کا سردار تھا۔ چودہ ہزار سال تک عرش کا طواف کرتا رہا۔ پہلے آسمان پر اُس کا نام 'عابد' دوسرے آسمان پر 'زاہد' تیسرے پر 'بلال' چوتھے پر 'ولی' پانچویں پر 'تقی' چھٹے پر 'خزاین' ساتویں پر 'عزازیل' اور اب لوح محفوظ میں 'ابلیس' ہے۔

غرور اور تکبر نے اُسے کیا سے کیا بنا دیا۔

میں نے اپنے دوست اقارب سے اس مسئلہ پر مشورہ کیا۔ میرے ایک محلہ دار نے مجھے بتلایا کہ بھارت اور سندھ کے بارڈر کے پاس ایک ہندو جوتشی ہے جو کہ ہندوانہ عملیات کو سمجھتا اور اس کا توڑ کرتا ہے۔ ایک آدھ لوگوں نے اس کی تعریف کی تھی۔ اور شبنم نے مجھے تنگ کیا ہوا تھا کہ مجھے خوابوں میں بنارس کا دھیو ہیکل بت آکر بہت تنگ کرتا ہے۔ اور مجھے کہتا ہے کہ تو میری تپسیا کر۔ تب جا کر میں تجھے معاف کروں گا۔ اُس ہندو جوتشی کا نام متہال تھا۔ میں شبنم کو سندھ کے اُس گوٹھ لے کر گیا جو کہ آدھا بھارت اور آدھا پاکستان میں تھا۔ سندھ کے اُس گاؤں میں اُس ہندو جوتشی کے پاکستان اور غالباً اُس سے باہر کے آئے سینکڑوں ضرورت مند اپنے اوپر سے ہندوانہ جادو کو جھڑوانے آئے ہوئے تھے۔ متہال جوتشی کو جب میں نے اپنی بیوی کی دیوانگی اور بچوں کی نہ گفتہ حالت بتلائی تو اُس نے کہا کہ تمہارا کام ہو جائے گا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا ہو جائیگا۔ اُس نے کہا کہ سب سے پہلے مرحلہ میں تمہاری بیوی کو نارمل کرنے کا عمل بتلاؤں گا۔ اور دوسرے مرحلہ میں تمہاری بیٹی اور بیٹے کے پاؤں کا کج ٹھیک کرنے کے لئے گنڈا دوں گا۔ لیکن اُس نے یہ شرط لگائی تھی کہ شبنم کو اس کے پاس گاہے بگاہے لانا پڑے گا۔ میں نے متہال جوتشی کو کہا کہ ہم دور

پنجاب گجرات کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے لیے یہاں آنا بہت مشکل ہوگا۔ مہتال نے کہا کہ اسکے بغیر چارہ نہیں ہے۔ مہتال نے شبنم کی ذہنی کیفیت کو نارمل لانے کے لئے کچھ گنڈے دیئے۔ ان کے استعمال سے شبنم کی بکھری ذہنی کیفیت میں کافی آرام آگیا تھا۔ وہ مجھ سے اب محبت بھری باتیں بھی کرتی تھی۔ بلکہ بیٹی اور بیٹے پر بھی توجہ دیتی تھی۔ مجھے اپنی زندگی میں ٹھہراؤ سکون کا احساس محسوس ہونے لگا تھا۔ شبنم کو میں خود اتنی دور سندھ بارڈر ایریا میں مہتال کے پاس لیکر جاتا تھا۔ ایک آدھ دفعہ یہ ہوا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ وہاں جانے لگی تھی میری یہ بیٹی سفینہ کچھ سیانی بڑی ہوئی تو محلے کے بچے اسے بھوتنی نسل۔ لنگڑی کہہ کر چڑاتے چھیڑتے تھے۔ اسی طرح وہ میرے گھٹنے چلتے بچہ کو بھی نت نئی آواز میں کہا کرتے تھے۔ شبنم بچوں کی ان باتوں کو دل سے لگا کر خوب رویا کرتی تھی۔ سفینہ بیٹی کے پاؤں بالکل لکڑی کی طرح سخت تھے۔ اسے قدم اٹھانے میں شدید پریشانی ہوا کرتی تھی۔ شبنم اور میں نے بچہ جسکا نام ہم نے انور رکھا تھا۔ اسکے پاؤں میں کج نہ صرف کج تھا۔ بلکہ اس کا ذہنی توازن بھی ٹھیک نہ تھا۔ میں اپنے طور پر دونوں بچوں ہندو جوتشی مہتال کی جانب سے دیئے گئے۔ گنڈوں کے علاوہ ان کا ڈاکٹری علاج کروانا چاہتا تھا۔ لیکن شبنم کا عقیدہ اُس مہتال جوتشی پر اتنا ہوگیا تھا کہ وہ کہتی تھی۔ کہ میرے بچے اُس ہی کے ہندوانہ علاج سے ہی ٹھیک ہونگے۔

اہل محلہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ لوگ ہمیں کہتے تھے۔ کہ تم مسلمان ہوکر ہندو جوتشی کے پاس کیوں جاتے ہو۔ اس پر ہم لوگ ان کی تسلی کیلئے یہ جواب دے دیتے تھے۔ کہ جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے۔ یا وہ ڈوبنے لگتا ہے تو وہ تنکے کا سہارا بھی لیتا ہے۔ بعض دفعہ وہ ایسا کام کرتا ہے جسے وہ دل سے پسند نہیں کرتا۔ وقت یونہی اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ ہمارا کوئی تیسرا بچہ ہو۔ لیکن اسکے لیے شبنم ذہنی طور پر یہ سوچ کر ڈر رہی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ اس کا تیسرا پیدا ہونے والا بچہ بھی بچوں کی طرح ٹانگوں کے کج کھائے اور ذہنی مریض نہ ہو۔

میں نے اُسے کہا کہ تو اب جوتشی کے پاس نہ جایا کر لیکن نہ جانے مہتال نے اس کا کیسے نفسیاتی طور پر یا جادوئی طور پر ایسا ذہن بنا دیا تھا کہ وہ اسکے پاس جانے کے لیے بضد ہوگئی تھی۔ میں نے اُسے ڈانٹا کہ ہمیں اب اپنی بچوں کی اس کیفیت کو اپنا مقدر سمجھ لینا چاہئے۔ اُس سے میری ان بن ہوگئی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ ہندو جوتشی مہتال کے پاس چلی گئی۔ 4 روز بعد یہ ہوا کہ میرا سالا فیاض انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں گھر میں آیا اور اُس نے یہ پاؤں سے زمین نکالنے والی خبر سنائی کہ شبنم چھوٹے بیٹے کیساتھ بھارت کی سرحد پار کر کے بنارس کے مندر بچے سمیت چلی گئی ہے۔ یہ کیسے ہوگیا تجھے اسکے ساتھ کس لیے بھیجا تھا۔ تو نے اُسے کیوں نہیں روکا۔ اُس نے روتے ہوئے کہا کہ میں کیا کرتا مہتال نے شبنم باجی کے ذہن میں نہ جانے کیا پھونک دیا ہے کہ شبنم باجی نے مجھے کہا کہ فیاض تم واپس گجرات چلے جاؤ۔ اور اپنے بہنوئی کو یہ کہہ دینا کہ میں جین مندر میں بتوں سے معافی مانگ کر آؤنگی۔ اور اُن سے (مجھے کہا تھا) کہنا کہ میں ضرور آؤں گی وہ پریشان نہ ہوں۔

میں نے فوری طور پر اسی مسئلہ پر اپنے عزیزوں۔ دوستوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ ہمیں مہتال کے گوٹھ جانا چاہئے۔ میں میرا اسسر اور فیاض متہال جوتشی کے گوٹھ پہنچے اور ہم نے اُس سے پوچھا کہ شبنم کو تو نے غیر قانونی طور پر بھارت کی سرحد پار کرا کر کیوں بھیجا ہے۔ پہلے تو اُس نے الٹا ہم پر چڑھائی مارتے ہوئے ٹکا سا جواب دے دیا کہ میں کسی شبنم کو نہیں جانتا اور تم کون ہو۔ فیاض نے اُسے کہا کہ مجھے خود شبنم باجی نے کہا تھا کہ مجھے متہال نے کہا ہے کہ تم بنارس کے جین مندر میں جا کر بتوں سے معافی مانگو اُس نے فیاض اور ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا کہ تمھارا جو دل کرتا ہے۔ کرو۔ دہاں ہم نے سوچا کہ یہاں ہمارا ہرگز زور نہیں چلے گا۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ متہال کے پاس گریہ۔ منتیں کر کے پوچھتے ہیں کہ اُس نے وہاں کیوں کسطرح اُسے وہاں بھیجا ہے۔ ہم ایک روز وہاں ٹھہرے وہاں متہال اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے پہلے ہمارے سامنے انکار کیا کہ شبنم اور فیاض میرے پاس نہیں آئے ہے۔ بعد میں جب فیاض نے اُسے کہا کہ

میں خود باجی کو آپ کے پاس لایا تھا۔ اور آپ نے انھیں کہا تھا کہ وہ بنارس جین مندر جا کر وہاں بتوں سے معافی مانگے۔ اور آپ نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ آپ انھیں پاک بھارت کے سرحدی راستے سے غیر قانونی طور پر بھارت پار کروا دیں گے۔

متھال جوتشی نے ہم لوگوں کو دھمکی والے انداز میں کہا کہ اگر تم لوگوں نے مجھے زیادہ تنگ کیا تو یاد رکھو اس گوٹھ میں 95% ہندوؤں کی آبادی ہے۔ اگر آرام سے تم واپس اپنے گھروں میں نہ گئے تو تم یقیناً زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔ ہم لوگ وہاں پریشانی کے عالم میں دھکے کھا رہے تھے۔ وہاں کے مقامی لوگوں نے ہمیں مشورہ دیا گیا کہ تم لوگ متھال جوتشی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ اس گوٹھ کا تھانیدار کھیا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ کراچی اُس زمانہ میں کراچی پاکستان کا دارالخلافہ ہوتا تھا۔ میں یہاں بیٹھے بڑے بڑے بیورو کریٹس پر بھی یہ بڑا اثر رکھتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم لوگ متھال سے چاپلوسی یا کسی طریقہ سے پوچھو کہ اُس نے شبنم کو بچے سمیت واقعی بنارس کے جین مندر بھیجا ہے۔ یا خدانخواستہ اسے کسی جگہ ورغلا کر اغوا نہ کروایا ہو۔ اس بات سے ہمیں اور پریشانی ہوئی۔ ہم لوگ متھال جوتشی کے پاس بھیگی بلی بن کر عاجزانہ انداز میں دوبارہ پہنچے۔ اس کو ہم نے اُس زمانہ کے مطابق اچھی رقم بطور نذرانہ پیش کی۔ اُس نے رقم لے کر اپنا وطیرہ بدلتے ہوئے کہا کہ اُس نے شبنم اور اسکے بچے کو بنارس کے جین مندر میں ایک تپسیا کے لئے بھیجا ہے۔ جہاں اُسے اپنی جانب سے کی گئی بتوں سے معافی ملے گی۔ یہ تو نے کیا کہا۔ میرے سسر نے بڑے ادب سے اُس سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا۔ تمہارے پریوار اور بذاتِ خود شبنم کے فائدے کے لئے کیا۔ متھال نے سسر کو کہا کہ تو اپنے گھر واپس جا اور تو۔۔۔! ۔۔۔میرے پاس رہ۔ میں نے تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ تو تجھے بنارس جین مندر جانا پڑے گا۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں اُس کے پاس کیسے ملنے جاؤں گا۔ آجکل حکومت نے بھارت جانے کا پرمٹ مشکل کر دیا ہے۔ اُس نے کہا کہ تو اگر اپنی جیب مزید ڈھیلی کرے۔ تو میں تیرا یہ کام کر سکتا ہوں۔ میں نے اُسے گڑگڑا کر کہا کہ۔ میں نے ہر حال میں شبنم اور اپنے بیٹے سے ملنا ہے۔ متھال نے مجھے کہا کہ اگر تو واقعی اپنی پتنی اور بیٹے سے ملنا چاہتا ہے۔ تو اسکے لیے مجھے تولہ سونے کے برابر رقم دینی ہوگی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اس معاوضہ کا جہاں سے بھی بندوبست کروں۔ سب کروں گا۔ میں نے سسر کو دوبارہ گجرات بھیجا اور اُن کے ذریعہ میں نے 200 روپے منگوا کر اُسے دیے۔

متھال نے یہ کہا کہ میرا ہندوانہ حلیہ بدل کر مجھے ایجنٹوں کے ذریعے بھارت کی سرحد پار کروا دیا۔ اور اُس نے مجھے تاکید کی کہ میں شبنم کیساتھ ملکر تین روز بعد واپس اُسی ایجنٹ کے ذریعے ہندوستان سے واپس آجانا۔ اور وہاں اپنی غیر قانونی آمد کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں اپنے طور پر ہندوانہ حلیہ بدل کر جب بنارس کے اُس جین مندر پہنچا۔

تو وہاں ان دنوں جین مذاہب کے ماننے والے پجاری آئے ہوئے تھے۔ وہاں شبنم کو ڈھونڈنا کسی عذاب عظیم سے کم نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان زائرین نے اُس مندر کے تفریحی پارک مندر کی بلڈنگ کے اندر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ میں مسلسل اپنے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا تھا ایک مجھے ایسا لگا کہ یہ شبنم ہے۔ قد کے لحاظ سے وہ مجھے وہی لگی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اپنی گود میں بچہ پکڑا ہوا تھا۔ اور اس نے اپنے چہرے کو چادر سے ڈھانپا ہوا تھا۔ میں اسکے قریب گیا۔ وہ آگے آگے جا رہی تھی۔ میں ہجوم کو چیرتا ہوا شبنم شبنم چلاتا ہوا اسکے قریب گیا۔ وہ چونک کر رک گئی۔ اُس نے اپنے چہرے سے چادر ہٹائی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ وہ تو واقعی شبنم ہی تھی۔ اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پریشان کن لہجہ میں مطلوب احمد تم یہاں کیسے پہنچے۔ اُس نے ایک جھٹکے سے مجھے علیحدہ جگہ لے جا کر کہا کہ تمھیں فیاض نے میرا پیغام نہیں دیا تھا۔ یہ تمہارا کیا پاگل پن اور بکواس ہے۔ تم کیسے متھال جوتشی کے بھڑکانے کی خاطر مجھے بغیر بتلائے، مشورے کئے یہاں آگئی۔ شبنم نے کہا کہ مطلوب احمد تم مجھے غلط نہ سمجھنا۔ میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں۔ تمہارے اپنے اور اپنے دونوں پیدا شدہ بچوں کی بہتری کے لئے کر رہی ہوں۔ تم نے اچانک یوں غیر قانونی طور پر آنے کا فیصلہ کیسے

کرلیا تھا؟

دراصل متھال جوتشی نے مجھے کہا تھا کہ آجکل چین مندر میں موجود اس پاتال بت کی آجکل پوجا۔ سیوا کا ہفتہ چل رہا ہے۔ یہی موقع ہے کہ تو وہاں جاکر اُس سے پورے ہفتہ بھر اسکے پاؤں پر گر کر معافی مانگ مجھے یقین ہے کہ وہ تجھے معاف کر دے گا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم متھال کی باتوں میں آکر پاگل نہ بنو چلو۔ نہیں میں معافی کی مخصوص سات دن کی تپسیا کے بغیر نہیں جاؤنگی۔ شبنم نے مجھے کہا کہ میں 5 روز بعد اپنی تپسیا کے بقایا دن پورے کر کے پاکستان لوٹ آؤنگی اور دوسرے بچے کے پاؤں کا کچ ٹھیک ہو رہا ہے۔ وہ آگے مندر کی جانب آگے جانے لگی تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر اُسے روکنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن وہ مندر کی بلڈنگ کی جانب بھاگنے لگی تھی۔ میں رش کو چیرتا دیوانہ وار شبنم کہتا ہوا اسکے پیچھے ہولیا۔ وہ ایک لمحے کو رک کر مجھ سے کہنے لگی مطلوب احمد میں نے تمہیں کہہ جو دیا ہے کہ میں 5 روز بعد خود پاکستان آجاؤنگی۔ میں نے غصہ میں اُسے کہا کہ تو میرے ساتھ پاکستان چل وہ بضد ہوگئی۔

ہم دونوں کے درمیان اس معاملہ پر اچھی خاصی نوک جھونک شروع ہوگئی۔ وہاں لوگوں کا رش لگ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہماری جانب لمبے چوڑے قد پر مشتمل دو آدمی تیز تیز قدموں کے چاپ چلتے ہوئے آئے۔ میں فوراً بھانپ گیا تھا کہ یہ بھارتی انٹیلی جنس کے اہلکار ہیں۔ میں نے شبنم کو اشارہ کیا کہ وہ یہاں سے کھسکلے لیکن وہ میرا اشارہ نہ سمجھ سکی۔ میں اُس رش عظیم میں سے غائب ہوسکتا تھا۔ لیکن مجھے شبنم کی فکر تھی۔ وہ کیونکہ بذات خود غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے یہاں آئی تھی۔ وہ انٹیلی جنس کے اہلکار ہمارے قریب آچکے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک نے مجھے اور دوسرے نے شبنم کو بڑی بے دردی سے پکڑا یہ دونوں پاکستانی جاسوس ہیں۔

ہم جاسوس نہیں ہیں۔ شبنم نے روتے ہوئے اہلکاروں سے التجا کرتے ہوئے یہ بات کہی۔ دونوں اہلکاروں نے ملکر باری باری ہم دونوں کے چہرے پر تھپڑ رسید کیے۔ شبنم نے رو رو کر ساری حقیقت بتلادی کہ وہ یہاں کس لیے آئی ہے؟ میں نے بھی مجبوراً انھیں شبنم کی جانب سے دیے گئے بیان کی تائید کر دی تھی۔ ان بھارتی اہلکاروں نے ہم دونوں کو زدوکوب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ وہ ہم دونوں کو مارتے کوٹتے ہوئے قریبی تھانے لے گئے۔ وہاں ہم رنگے ہاتھوں اس جرم میں ثابت ہوگئے کہ ہم واقعی غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے یہاں آئے تھے۔ لیکن ہم نے ان سرکاری لوگوں کو بتلایا کہ ہمارا جاسوسی والا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ انھوں نے ہمارے کہے گئے موقف کو اہمیت نہ دی۔ وہ ہمیں جانوروں کی طرح زدوکوب کرتے رہے کہ تم لوگ جاسوس ہو۔ ہم مسلسل اس امر سے انکاری رہے۔ مطلوب احمد نے روتے ہوئے کہا کہ اسکے بعد انڈین پولیس نے ہم دونوں پر پاکستان کی جاسوسی کرنے غیر قانونی طور پر انڈین بارڈر کراس کرنے کے علاوہ متعدد مقدمات ڈال دیے۔ بلکہ مجھے شبنم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اب شبنم چلانے لگی کہ میں مطلوب احمد کے ساتھ رہونگی میں اسکے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن اب اسکے پچھتاوے واویلا کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

☆......☆......☆

مختصر یہ ہے کہ مجھے 6 ماہ بھارت کی مختلف جیلوں میں خوب زدوکوب کیا گیا۔ مجھے اس مدت میں کچھ نہ پتا تھا کہ شبنم کہاں گئی۔ وہ لوگ اسے کہاں لیکر گئے۔ شبنم کے بارے میں آپ کو بعد میں بتلاؤں گا۔ کہ اسکے ساتھ کیا بیتی تھی مجھے بھارت کے مختلف شہروں کی جیلوں میں رکھا گیا۔ بھارتی عدالتوں نے مجھے مجموعی طور پر 16 سال قید کی سزا دی تھی۔ میں دیار غیر میں بالکل بے بس تھا۔ میں نے جب جیل انتظامیہ سے شبنم کے بارے میں پوچھا کرتا تھا تو وہ مجھے کوئی بات نہیں بتلاتے تھے۔ 16 سال جیل میں گزارنا 16 صدیوں کے برابر تھے۔ وہاں ایک مصیبت یہ تھی کہ وہاں ہمارے پیچھے کوئی رشتہ دار، دوست مدد کے لیے نہ آسکتا تھا۔ لگتا تھا قدرت نے مصیبتوں کا تسلسل ہمارے مقدر میں لکھ دیا ہے۔

مجھے بھارتی جیل میں گزرتے ہوئے 7 سال ہوگئے تھے۔ میں 7 سال بھارت کے مختلف شہروں کی جیلوں میں سڑتا رہا۔ بالآخر ایک دن مجھے الہ آباد سینٹرل جیل کی انتظامیہ نے کہا کہ تمہیں ایک لیگل ری ویو کے

تحت پاکستانی جاسوسی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ لہٰذا بھارتی حکومت تمھاری بقیہ قید معاف کرتی ہے۔ یہ اگر چہ ایک طرح میرے لیے خوش آئند بات تھی۔ لیکن دوسری طرف شبنم اور بچے کا علم نہ تھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔

پاکستان آیا تو یہاں پتا چلا کہ شبنم اس دوران یہاں نہیں آئی۔ اس سے مجھے مزید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا میں نے اپنے طور پر شبنم اور بیٹے کی تلاش کے لیے مزید کوششیں شروع کردی تھیں۔ میں نے بھارت بنارس اپنے ماموں کے بیٹوں کو خطوط لکھے کہ وہ شبنم کو تلاش کریں۔ بہت عرصہ بعد مجھے یہ خبر ملی کہ شبنم کو انڈین لدھیانہ جیل میں اتنی ذہنی اذیتیں دی گئی کہ وہ وہی پاگل ہوگئی۔ اور اُس کی حالت انتہائی لاغر کمزور ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

راوی نے یہ بتلایا کہ میں بڑی مشکل سے دوبارہ ہندوستان کے شہر لدھیانہ گیا تھا وہاں واقعی شبنم ایک پاگل خانہ کے ہسپتال میں انتہائی لاغر حالت میں اپنی زندگی کے دن پورے کررہی تھی۔ وہ قریب المرگ تھی۔ اسکی پہچان اعصاب سب ختم ہو چکے تھے۔ راوی نے یہ بتلایا کہ مجھے پاگل ہسپتال میں پتا چلا کہ میرا بیٹا زندہ ہے اور وہ جین مندر کے ہندو پجاریوں کے پاس ہے۔ اس سے میرا دل اور پھٹا میرا ویزہ لدھیانہ کا تھا۔ میں وہاں سے بنارس نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے کچھ لوگوں نے کہا کہ تم وہاں چلے جاؤ۔ لیکن میں اس بار یہ رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے پہلے ہی غیر قانونی طور پر بھارت جانے پر زندگی کی اتنی بڑی عبرت ناک سزا مل چکی تھی۔ ایک طرف میرا دل شبنم کی حالت کی طرف تھا۔ اسکی جانب دیکھ کر میرا دل پھٹتا تھا۔ اور دوسری جانب میرا ذہن و دل میرے بیٹے کی طرف تھا۔ مجھے یہ سوچ ڈسا کرتی تھی۔ کہ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگا۔ بہر حال میں پاکستان آیا اور یہیں سے میں نے بنارس جانے کی کوشش کی۔ دو دفعہ میرا ویزہ بھارتی حکومت نے ریجیکٹ کیا۔ بالآخر تیسری بار اپیل کرنے پر مجھے بنارس جانے کا ویزہ ملا۔ میں جین مندر پہنچا تو وہاں ہندو پجاریوں کے پاس میرا بیٹا انور موجود تھا۔ اس کے پاؤں میں کج تھا لیکن اُس کی نوعیت معمولی تھی۔ اور دو ذہنی طور پہ اپاہج سا نہیں قسم کا تھا۔

تقدیر کے فیصلے

ہم انسانوں کا طرز فکر بڑا عجیب ہوتا ہے۔ ہم کسی بھی حال میں خوش نہیں رہتے۔ ہر کسی کو اپنی تقدیر سے گلہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حالات سے سمجھوتہ نہیں کرسکتے۔ تقدیر کے فیصلے کسی کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتے' ایسا ہوتا تو ہر قلم اپنے حق میں بہترین فیصلے لکھتا' دوسروں کے لیے ہمدردی ہوتی نہ تعلق۔ خاص کر ان لوگوں کے لیے بدترین چیزیں لکھی جاتیں جن سے کسی قلم کی رنجش ہوتی۔ انسان اتنا خودغرض ہوجاتا کہ اس کی مثال نہ ملتی۔

مرسلہ۔ مہرین فاطمہ۔ نوابشاہ

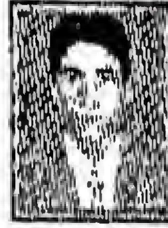
وہاں بھی ایک بڑی پریشانی مجھے اُس وقت ہوئی جب میں نے لپک کر اسے اپنی گود میں لیا تو وہاں موجود کٹر جین مذہب کے پجاریوں نے مجھے زدوکوب کرتے ہوئے اُسے مجھ سے چھینتے ہوئے کہا کہ یہ اس مندر کا بچہ ہے۔ اس کی ماں نے جین مذہب قبول کرلیا تھا۔ اس نے انھیں کہا کہ یہ جھوٹ ہے۔ یہ مسلمان اور میرا بیٹا ہے۔ وہاں ایکبار پھر مجھے پولیس کے حوالے کردیا گیا۔ میں وہاں یہ واویلا کرتا رہا کہ انور میرا مسلمان بچہ ہے۔ لیکن میری وہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی۔

اس بار بھارتی پولیس نے مجھ پر جاسوسی کا یا کوئی بڑا کیس نہ ڈالا بلکہ دیوانہ قرار دیکر پاکستان واپس بھیج دیا گیا۔ مطلوب احمد نے روتے ہوئے کہا کہ میں کئی برسوں تک اپنی بیوی شبنم اور بیٹے سے ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن ایک دن یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری کہ شبنم نے لدھیانہ کے پاگل خانہ میں دم توڑ دیا ہے اور اسے انڈین حکومت نے جین مذہب کے مطابق جلادیا تھا۔

میں 1972ء میں بنارس جانے میں کامیاب ہوا۔ وہاں میں نے اپنے بیٹے انور کو بمشکل دیکھا تھا۔ وہ کافی بڑا ہوگیا تھا۔ بنارس کے اُس جین مندر میں اُسے باؤلہ کا خطاب دیا گیا ہے۔ اب میں اور میری یہ بیٹی سفینہ اُسے ایکبار پھر بنارس کے جین مندر میں دیکھنے جارہے ہیں۔"

☆......☆......☆

ماں جایا



معاویہ عنبر وٹو



بہن بھائی کی محبت سے گندھی ایک داستان

مجھے اب بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہیں میں ہڑپہ میوزیم میں بلڈنگ کے سامنے پارک کے ارد گرد پھولوں کی دیکھ بھال کے لیے بطور مالی ڈیوٹی سرانجام دیتا تھا، ہماری رہائش گاہ کے سامنے گھنا سایہ دار پیپل کا درخت، جس کے ارد گرد گلاب کے پھولوں کے پودے خوشبوؤں سے مہکتے تھے ..... عنبرین ان دنوں چھ برس کی ننھی گڑیا تھی۔

پہلی مرتبہ جب ننھی گڑیا عنبرین نے اپنی زبان سے عمران کا نام لیا تھا، میں ایک دم کانپ کر رہ گیا تھا وہ گھر کے سامنے گھنے سایہ دار پیپل کے درخت کے نیچے اور ارد گرد گلاب کے پاس جا کر اکیلی کھیلا کرتی مجھے یاد ہے اس روز میں پھولوں کو قریب ہی پانی دے رہا تھا، جب وہ پیپل کے نیچے کھیل رہی تھی میں نے اس کی جانب نگاہ اٹھائی تو وہ گلاب کے پودوں کے پاس بیٹھی مسرت بھرے انہماک سے پھولوں کی پتیوں سے ہار پرو رہی تھی۔ دوپہر کی دھوپ میں اس کے سرخ سیاہ بال چمکتے دکھائی دے رہے تھے اور بڑی بڑی نیلی آنکھیں پھولوں کے ہار پر مرکوز تھیں۔ دفعتاً اس نے پیپل کے گھنے سایہ دار درخت کی جانب اوپر نظر اٹھائی جس کا گھنا سایہ گھاس پر پڑ رہا تھا اور دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''جی، جی مجھے میرے بابا جانی عنبرین بولتے ہیں''

وہ بولی اور اٹھ کر پیپل کی گھنی چھاؤں میں آ بیٹھی

''میں اپنے بابا جانی کے پاس رہتی ہوں'' ''پھر کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی لیکن وہ تو صرف میرے بابا جانی ہیں''۔

وہ پیپل، کے گھنے سائے میں بیٹھی کسی سے محو گفتگو تھی یکا یک مضطرب ہو کر میں نے اسے آواز دی عنبرین بیٹا تم وہاں کیا کرنے بیٹھی ہو؟

''کچھ یاد نہیں بابا جانی''

''اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی سنائی دیتی محسوس ہوئی۔

''بیٹا عنبرین گھر چلو بس بہت ہو گیا کھیل''

''بیٹا سنا نہیں تم نے؟''

یہ سنتے ہی اس نے اوپر پیپل کی شاخوں کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

''سنو! اب میں گھر جانے لگی ہوں..... اپنا خیال رکھنا..... خدا حافظ۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گھر آ گئی میں نے اپنا کام چھوڑ کر گھر میں قدم

رکھتے اس سے پوچھنا چاہا۔

''عنبرین بیٹا! تم کس سے وہاں باتیں کر رہی تھی!''

''عمران سے''

اس نے جواب دیا۔

''بیٹا یہ عمران کون ہے''

''عمران''

میرے بار بار پوچھنے کے باوجود اس سے سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہ کر سکا کہ وہ عمران سے باتیں کر رہی تھی ...... خیر میں نے اسے کچھ کھانے پینے کی چیزیں دیں پھر بستر پر لٹا دیا اور علی بابا اور چالیس چور والی کہانی سنائی۔ کہانی سننے کے دوران میں وہ پیپل کے درخت کی جانب بار بار دیکھتی اور مسکرا کر ہاتھ سے ادھر اشارہ بھی کرتی۔ آخر اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

جب میری بیوی علی پبلک اسکول میں بچوں کو پڑھا کر گھر آئی تو میں نے اس سے ''پراسرار'' عمران کا ذکر کیا۔

''بچے اکثر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں''

''کیا مطلب؟''

میں نے تعجب سے پوچھا ''یہ کوئی غیر معمولی بات تھوڑی ہے'' میری بیوی نے مجھے سمجھایا اور کہا ''پریشان نہ ہو، بعض ایسے بچے ہیں جن کے بہن بھائی نہیں ہوتے، اور نہ ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے انہیں دوسرے بچے میسر آتے ہیں تو وہ ایک ''خیالی دوست'' بنا لیتے ہیں۔ ہماری بیٹی نے بھی یہی کیا ہے اس نے اپنی تفریح کے لیے ایک خیالی دوست بنا لیا ہے۔''

☆......☆......☆

''مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسے



"عمران" کے نام سے ہی بلاتی ہے آخر اس نام میں اس نے کیا خصوصیت دیکھی؟" میں نے جرح کی۔

"تم خواہ مخواہ خود کو پریشان نہ کرو...... ہوگا کچھ "یہ بھی ہوسکتا ہے اس نے پہلے یہ نام کہیں سے سن رکھا ہو۔" اگلے روز عنبرین ناشتہ کرتے ہی بھاگتی ہوئی پیپل کے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئی۔ قریب گلاب کے پھول چمکتی ہوئی دھوپ میں کھلکھلا رہے تھے اور دوسری جانب ہڑپہ میوزیم کی سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے لوگ میوزیم کی بلڈنگ کے اندر اور باہر پارک میں کھنڈرات کی جانب بڑھتے ہوئے خوش گپیوں میں نظر آرہے تھے۔

وہ پیپل کے درخت سے ذرا ہٹ کر آلتی پالتی مارے گھاس پر آبیٹھی اس کے لبوں پر معصومانہ مسکراہٹ تھی۔

"آہا...... آپ آگئے ہیں؟

تمہاری عمر کتنی ہے؟ میں تو اب چھ برس کی ہوگئی ہوں کچھ روز بعد میں اسکول پڑھنے جایا کروں گی نئی وردی پہن کر میرے بابا جانی اور ممی جان کہتے ہیں۔ ہمیں تنخواہ ملنے والی ہے پھر ہم بازار جائیں گے میری اسکول کی وردی لینے،

تم بھی کیا اسکول جاتے ہو......؟

کچھ لمحے تو وہ خاموش کھڑی جیسے کچھ سن رہی ہو دو تین مرتبہ گردن بھی ہلائی۔ میری بیوی اسکول جانے کی تیاری میں گھر کے دروازے پر تھی اچانک اس کی طرف نگاہ اٹھائی یہ عجب تماشہ دیکھتی ہوئی برف کی مانند جیسے سرد پڑ گئی لیکن پھر اپنی باتیں یاد آتے ہی اپنے ذہن سے تمام شکوک دور کرتے اسکول کی طرف چل دی۔ میں نے اسے آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کیا۔

"بابا جانی کیا عمران بھی آسکتا ہے میرے ساتھ؟ اس نے آواز دے کر پکارا "نہیں بیٹا" میں نے دفعتاً غصے سے چیخ کر کہا "اچھا عمران خدا حافظ!" عنبرین نے اس پیپل کے درخت کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔" بابا جانی آپ عمران کو بھی تھوڑا سا دودھ کیوں نہیں دیتے؟"

"عنبرین بیٹا! یہ عمران کون ہے؟"

"عمران بھائی ہے میرا"

"بھائی ہے تمہارا" میں نے حیرت سے پوچھا "تمہارا تو کوئی بھائی نہیں ہے ہاں ارسلان تمہارا بھائی تھا لیکن وہ تمہاری پیدائش سے پہلے فوت ہوگیا تھا اب تو تم ہماری ایک ہی بیٹی ہو بیٹا عمران تمہارا ہرگز بھائی نہیں"

"مگر بابا جانی وہ تو یہی کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں" عنبرین نے دودھ سے بھرا گلاس منہ سے لگا لیا دودھ پی کر اس نے بسکٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جلدی جلدی بسکٹ کھانے لگی۔

"بیٹا میں ذرا کھنڈرات کی طرف بابا پیر سائیں کے دربار کی طرف جانا چاہتا ہوں وہاں کچھ پھولوں کے پودے لگائے ہیں انہیں دیکھنا ہے تم بھی میرے ساتھ چلو گی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں بابا جانی! میں عمران کے ساتھ کھیلوں گی"

"ہرگز نہیں......" میں نے ڈانٹ کر کہا "تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔" "بابا جانی عمران بھی پھر ہمارے ساتھ جائے گا؟" "نہیں بیٹا جب میں نے کام کے لیے کچھ چیزیں اٹھائیں تو میرا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

☆......☆......☆

کئی روز سے یہ عجیب تغیر محسوس کر رہا تھا کہ باہر تو شدت کی دھوپ پڑنے کے باوجود ہمارا گھر سرد اور تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ ننھی عنبرین کا چہرہ کچھ اداس ہوگیا تھا۔ تاہم وہ بے دلی سے میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ جب ہم دونوں مکان سے باہر آئے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے پیپل کے درخت کو سلام کیا۔

اس روز میں سارا دن بے حد مضطرب رہا، خدا جانے ہماری بچی کو کیا ہوگیا تھا۔ اس کے لبوں پر ہر وقت عمران عمران کی رٹ تھی۔ سہ پہر کو جب اسکول پڑھا کر میری بیوی گھر آئی، تو میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی میں جانتا تھا کہ وہ وہی بات کہے گی جو پہلے کہہ چکی ہے۔

مسلسل کئی روز تک عنبرین کی یہی کیفیت رہی وہ پیپل کے درخت اور گلاب کے پھولوں کے پودوں کے پاس جانے کی ضد کرتی اور کہتی عمران اسے بلا رہا ہے وہ عمران کے پاس جانا چاہتی ہے اور یوں عمران سے گھنٹوں باتیں کرتی تھی...... پیاری پیاری باتیں جنہیں سنتے میرا کلیجہ کانپتا تھا۔

اتوار کی صبح خوشگوار تھی جب میری بیوی گھر میں ہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے دکھایا کہ عنبرین پیپل کے درخت کے نیچے گھنے سائے میں بیٹھی ''عمران'' سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ غور سے اس کی آواز سنتی رہی پھر سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''ہماری عنبرین کو اس کے ''خیالی دوست'' سے ایک بڑا فائدہ ہوا ہے کہ وہ روانی سے بولنے لگی ہے گھر میں وہ اس طرح نہیں بولتی ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر بولی ''تم یوں کرو کل عنبرین کو ڈاکٹر محسن حسین کے پاس لے جانا دیکھو وہ کیا کہتے ہیں'' دوسرے دن میں نے یہی کیا عنبرین کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر محسن حسین کے مطب میں گیا، عنبرین کو انتظار گاہ میں بٹھا کر خود تنہائی میں ڈاکٹر کو میں نے عنبرین کی پوری داستان سنائی، ڈاکٹر بے حد دلچسپی سے سنتا رہا، آخر میں بولنے لگا۔

''باقر علی! یقین کیجیے میرے پاس بچوں سے متعلق عجیب عجیب کیسس آئے ہیں لیکن جو باتیں آپ نے بتائی ہیں میرا خیال ہے بچی کو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع نہیں ملا'' جی بالکل! ایسی بات ہے درحقیقت ہماری یہ ایک ہی بیٹی ہے، میرا اب یہی خیال ہے کہ اسے اسکول داخل کرا دوں''

''باقر علی! آپ بالکل اچھا سوچ رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ جب بچوں میں گھلے ملے گی تو ''عمران'' کا تصور اس کے ذہن سے محو ہو جائے گا۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہوتا ہے، ہر بچے کو فطرتاً اپنی ہی عمر کے بچوں کی تلاش رہتی ہے جس سے وہ باتیں کرے، کھیلے کودے اور دل بہلائے اور اگر بچے کو ایسا کوئی دوست نہ ملے تو وہ تخلیق کر لیتا ہے۔ اچھا اب بچی کو میرے پاس لے کر آئیں اور کچھ لمحے اسے میرے پاس تنہا چھوڑ دیجیے۔''

دعا

کبھی یوں بھی آ مری آنکھ میں کہ مری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اس کے بعد سحر نہ ہو
وہ بڑا رحیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دعا کروں تو مری دعا میں اثر نہ ہو

بشیر بدر

عنبرین کو لینے کے لیے جب میں انتظار گاہ میں گیا تو وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر دیکھتی جا رہی تھی۔

''بابا جانی عمران میرا انتظار کر رہا ہوگا'' کہاں بیٹا؟ ''پیپل کے درخت کے نیچے'' مجھے تو وہ نظر نہیں آتا وہاں...... اچھا آؤ میرے ساتھ اندر تمہیں ڈاکٹر صاحب ملنا چاہتے ہیں ''یاد ہے کچھ عرصے پہلے جب تمہیں بخار ہوا تھا تو تمہیں ڈاکٹر صاحب نے کتنی مزیدار ٹافیاں کھانے کو دی تھیں۔''

''جی بابا جانی! وہ تو بہت ہی اچھے ہیں......'' میں عنبرین کو ڈاکٹر صاحب کے پاس چھوڑ کر خود انتظار گاہ میں جا کر بیٹھ گیا اور نہایت بے چینی سے ڈاکٹر صاحب کی تشخیص کے نتائج کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے کچھ لمحے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ہنسنے کی آواز سنائی دی اور پھر عنبرین کا ایک معصوم سا قہقہہ بلند ہوا، میں نے کان لگائے سنا تو ڈاکٹر صاحب سے بڑی بے تکلفی سے عمران کی باتیں کی جا رہی تھیں کچھ لمحے بعد وہ دونوں باہر آئے ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

باقر علی! تشویش کی ضرورت بالکل نہیں میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ پر اعتماد کرنے لگے ہیں عمران سے متعلق جو کچھ وہ کہے اسے پوری توجہ سے سنیے وہ بھائی ہے اور خوب صورت مٹی کے کھلونے بناتا ہے۔ کیوں بیٹی؟'' جی ڈاکٹر صاحب! وہ بہت پیارے کھلونے اور درختوں پر بھی چڑھ جاتا ہے ''اپنے بابا جانی کو یہ بتاؤ اس کے سر پر ٹوپی بھی میرے جیسی اور بال بھی میرے جیسے ہیں سرخ''

''جی، جی اس کے بال تو میرے بالوں سے بھی

زیادہ سرخ ہیں، میرے بابا جانی کی طرح دبلا پتلا..... اس کی عمر پندرہ سال ہے۔"

"اچھا اب تم اپنے بابا جانی کے ساتھ جاؤ اور ہاں میرا بھی عمران کو سلام دینا۔"

"ڈاکٹر صاحب وہ دیکھیں عمران تو وہاں کھڑا ہے۔"

عنبرین نے سامنے باغیچے کی طرف اشارہ کیا "وہ بڑی دیر سے میرا منتظر ہے" ڈاکٹر صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

"ہاں بھائی بالکل کھڑا ہے، تمہیں بالکل بلا رہا ہے" جب میں عنبرین کا ہاتھ تھامے باہر نکلا تو اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے آگے بھاگنے کی کوشش کی اور پھر اوپر نظریں اٹھا کر دیکھا جیسے کوئی اس کے برابر کھڑا ہے آہ......

زندگی کا وہ مختصر ترین ثانیہ میرے لیے اب تک سوہان روح بنا ہوا ہے میں نے عنبرین کے برابر میں ایک لمبا سا...... انسانی شکل کا سایہ زمین پر پڑتے دیکھا اس کے آثار نو عمر لڑکے کے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ سایہ غائب تھا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ میں نے دوڑ کر عنبرین کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا اور گھر تک نہیں چھوڑا اور پھر گھر میں بھی ایک لمحے کے لیے میں نے اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ میرے بدلتے ہوئے رویئے کو دیکھ کر معصوم عنبرین سخت افسردہ ہو گئی۔

آہ...... یہ میری بچی عنبرین ہمارے گھر میں ایک عجیب پر اسرار معما بنتی جا رہی تھی اب بچی کو اتنے عرصے بعد پہلی مرتبہ اتنی سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچا وہ کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے ایسے سوالات نہ جانے کہاں سے، کیوں میرے ذہن میں اتر آئے تھے۔ ایک ہفتہ بیت گیا تھا۔

☆......☆......☆

عنبرین کے لبوں پر ہمہ وقت عمران کا ہی نام رہتا عمران یہ کہہ رہا تھا عمران نے یوں کہا، بابا جانی کیا تم نے بھی عمران کو دیکھا؟ ایسی سینکڑوں باتیں وہ کرتی رہتی تھی اور میرا دل لرزنے لگتا تھا۔ جس روز وہ اسکول جا رہی تھی اس سے ایک روز قبل کہنے لگی بابا جانی میرا سکول جانے کو دل نہیں چاہتا"

"ٹھیک ہے بیٹی لیکن ایسا نہیں کہتے اچھے بچے" میں نے اسے پیار سے سمجھایا دیکھو اب تم بڑی ہو گئی ہو وہاں اسکول میں اور بھی بچے ہوں گے تم ان سب کو اپنا دوست بنا لینا پھر اپنی سب سہیلیوں کو یہاں میوزیم کی اور کھنڈرات کی سیر پر بلانا"

"مگر بابا جانی! عمران کہتا ہے میں تمہارے ساتھ اسکول نہیں جا سکتا"

"نہیں بیٹی ......عمران کو اسکول جانے کی کیا ضرورت ہے وہ تو......" میں غصے میں کچھ اول فول بکنا چاہتا تھا، مگر ڈاکٹر صاحب کی نصیحت یاد آتے ہی ٹھہر گیا۔

"بیٹی! تم دیکھتی ہو وہ پندرہ سال کا ہے اسکول میں چھوٹے چھوٹے بچوں میں بیٹھا ہوا وہ کس قدر برا دکھائی دے گا اسے خود وہاں جاتے شرم محسوس ہوتی ہے۔"

"بابا جانی! بس میں عمران کے بغیر ہرگز اسکول نہیں جاؤں گی۔"

میری لاڈلی بیٹی! میں بھی تجھ سے بہت پیار کرتا ہوں...... کیا تم میری خوشی کے لیے اسکول نہیں جاؤ گی؟"

میں نے اسے گود میں اٹھایا اور چارپائی پر لٹا دیا اچھا اب تم سو جاؤ کل صبح تمہیں اسکول جانا ہے"

"وہ جلد ہی سو گئی۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا میں نے کمرے کی جانب نگاہ اٹھائی باہر پیپل کے درخت کے نیچے لمبے لمبے سنہری رنگ کے سایوں کو دیکھا۔ دیکھتے ہی میرا دل سینے میں بیٹھنے لگا...... پیپل کے درخت کے بالکل قریب ہی میں نے ایک لمبا انسانی سایہ دیکھا۔ میں نے واضح طور پر اس کی شکل دیکھی خدا تعالیٰ رحم کرے...... اس کی شکل عنبرین سے کتنی ملتی جلتی تھی پاگلوں کی طرح میں نے کھڑکی کھولی اور منہ باہر نکال کر قوت سے چیخ ماری۔ "عمران...... عمران......" اور پھر میں نے دیکھا کہ پیپل پہ سرخ رنگ کی چمک سی دکھائی دی۔ جیسے اس سائے نے اپنا

سرخ بالوں والا سر اٹھا کر میری جانب دیکھا ہو ۔ دوسرے ہی لمحے وہاں کچھ نہ تھا۔

شام کو میں نے تمام واقعہ اپنی بیوی کو سنایا اس کے چہرے پر حیرت اور اضطراب کے آثار نظر آرہے تھے ۔ گردن کو ایک جھٹکا دے کر اس سے کہا" خدا ہی بہتر جانتا ہے یہ معاملہ کیا ہے؟ بہر حال میرا بھی یہی خیال ہے کہ کل عنبرین کو میں اسکول ساتھ لے جاؤں گی ...... جب دوسرے بچوں سے ملے جلے گی تو عمران خود بخود اس کے ذہن سے نکل جائے گا"

میں نے بحث میں پڑنا مناسب نہ سمجھا جب ہم نے عنبرین کو یتیم خانے سے لیا تھا تو اس وقت یہ عہد کر لیا تھا کہ ہم اسے اپنی اولاد کی طرح پالیں گے اس کا ماضی ہرگز نہیں کھنگالیں گے۔

البتہ دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ میں نے عنبرین کے متعلق اب ضرور سراغ لگاؤں گا دوسرے روز جب عنبرین بیدار ہوئی تو وہ خلاف معمول خاموش اور ست دکھائی دی تھی میری بیوی نے طبیعت ناسازی کے باوجود بھی اسے خوش کرنے کے لیے دلچسپ حرکتیں کیں مگر اس کے لبوں پر مسکراہٹ نہ آئی چھ سال کی ہنس مکھ بچی میں ایک رات کے اندر غیر معمولی سنجیدگی آگئی تھی بستر سے اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور افسردہ لہجے میں صرف ایک جملہ کہا" عمران چلا گیا"

" اب تمہیں عمران کی کیا ضرورت ہے؟ اسکول میں تمہیں بہت سی سہیلیاں مل جائیں گی ......" میں نے کہا عنبرین نے گھور کر دیکھا اور پھر اس کے بعد جب وہ چپ چاپ کپڑے پہن کر اسکول جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ جب میں اسے لے کر گھر سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ اداس دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ خدا جانے میرا دل کیوں بیٹھا جاتا تھا مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اسکول نہیں جارہی ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو رہی ہے راستے میں ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔

☆......☆......☆

D.P.S اسکول کے دروازے پر میں نے اسے الوداعی پیار کیا اور کہا۔" دوپہر کا کھانا ساتھ ہے ۔ وہیں دوسرے بچوں کے ساتھ کھا لینا۔ اور جب...... چھٹی ہوگی تو میں تمہیں لینے آجاؤں گا...... تین بجے کے قریب"

" اچھا بابا جانی!" اس نے کہا اور پھر میرا ہاتھ سختی سے تھام لیا۔ بہت سے ننھے بچے اور بچیاں اپنے والدین کے ساتھ اسکول میں داخل ہونے کے لیے آرہے تھے دروازے پر ایک نوجوان استانی نے دل آویز تبسم کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اس نے سب بچوں کو ایک جگہ جمع کیا اور اپنے ساتھ اسکول میں لے گئی۔ جاتے جاتے اس نے مجھے یقین دلایا کہ بچی کی خاص طور پر نگرانی رکھی جائے گی۔

اسکول سے باہر نکل کر میں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے سینے پر رکھا ہوا منوں بوجھ یکا یک اتر گیا اور اب مجھے اس کے بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد میں نے کونسل موڑ سے ساہیوال جانے والی کوچ پکڑی اور اپنے مشن پر روانہ ہوگیا۔ مجھے اس یتیم خانے میں جانا تھا جہاں سے پانچ سال قبل میں اور میری بیوی نے عنبرین کو گود لیا تھا میں نے سیکرٹری کے کمرے میں پہنچ کر دستک دی فوراً دروازے پر ایک مہذب اور شریف صورت کی خاتون نمودار ہوئیں" کیا میں حیدر علی صاحب سے مل سکتا ہوں؟" اور کچھ دیر بعد واپس آکر بولی " تشریف لائیے" حیدر علی صاحب ایک دبلے پتلے سے طویل القامت نوجوان تھے" آئیے باقر علی...... اتنے عرصے کے بعد آپ سے مل کر واقعی مسرت ہوئی کہیے ننھی عنبرین کا کیا حال ہے؟"

" جی وہ ٹھیک ہے......" میں تفصیل بتانے کے بجائے فوراً ہی اصل مقصد بیان کرنے لگا۔" مجھے علم ہے کہ آپ یتیم خانے سے بچہ دیتے وقت کسی کے حسب نسب اور والدین کے بارے میں نہیں بتاتے میں سخت مشکل میں ہوں آپ پلیز میری مدد کریں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ عنبرین کون ہے؟" میں آپ کو تمام واقعات بتاتا ہوں" میں نے اسے پر

اسرار عنبرین کے بارے میں ساری داستان سنا دی حیدر علی صاحب کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا اس نے اٹھ کر ایک گلاس پانی پیا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور کئی منٹ تک آنکھیں بند کر کے گہری سوچ میں گم رہا آخر اس نے زبان کھولی۔

''باقر علی ...... آپ کے بیان کردہ واقعات نہایت حیرت انگیز ہیں۔ میرے پاس آپ کو جھٹلانے کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں۔''

عنبرین ہڑپہ آہر کے کھنڈرات کے ساتھ ہی محلہ ڈھلوان میں مذہبی طبقے کے ایک بے حد مفلس اور غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہے یہ خاندان صرف چار افراد پر مشتمل تھا باپ، ماں بیٹا ور لڑکی عنبرین .....''

''بیٹا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''جی ہاں عنبرین کا بھائی ...... اُن ہی دنوں وہ چودہ برس کا تھا..... جب یہ حادثہ پیش آیا'' ''حادثہ کیسا حادثہ؟'' ''میں نے مضطرب ہو کر سوال کیا اس خاندان کی غربت انتہا تک پہنچی ہوئی تھی اور اُن ہی دنوں عنبرین پیدا ہوئی تھی پورا خاندان ایک بوسیدہ سے مکان میں رہتا تھا۔ عنبرین کی والدہ موٹاپے اور کم خوابی کے امراض کا شکار تھی اور اسے بچی کی پیدائش پر خوشی کے بجائے صدمہ پہنچا تھا البتہ عنبرین کا بھائی اسے دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا اور اسے ہر وقت گود میں اٹھائے اٹھائے پھرا کرتا تھا یہاں تک کہ اس کا نام بھی اسکول سے خارج کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

عنبرین کا باپ کھنڈرات میں واقع پیر سائیں کے دربار پر مجاور تھا روکھی سوکھی کھا کر وہ گزر بسر کرتے رہے مگر انہی دنوں عنبرین کے باپ کی کھنڈرات میں موت واقع ہوئی۔ لوگوں کا کہنا تھا بھوتوں نے اس کی گردن توڑ کر کھائی میں پھینک دیا۔ میں نے یہ تفصیلات بعد میں پڑوس میں رہنے والوں سے حاصل کیں۔

ایک صبح کا ذکر ہے سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا ۔ اس مکان کے پڑوس میں رہنے والی ایک عورت نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کسی شے کے زور سے گرنے کی آواز سنی وہ باہر نکلی تو اس لڑکے کو زمین پر گرے ہوئے پایا عنبرین اس کے بازوؤں میں تھی لڑکے کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی اور وہ مر چکا تھا۔ عنبرین کا چہرہ نیلا پڑ چکا تھا اور بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی اس عورت نے یہ ماجرا دیکھتے شور بلند کیا پولیس والے اس مکان میں گئے جہاں پر خاندان رہتا تھا ۔ پولیس والوں نے اس حادثے کا پس منظر یہ بیان کیا کہ یہ جن بھوتوں کا کھیل ہے ڈاکٹروں کی رائے میں عنبرین کا محفوظ رہنا قدرت کا کرشمہ تھا۔ بہر حال لڑکی بچ گئی اس صدمے کی وجہ سے عنبرین کی والدہ کو دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی چل بسی تھی۔

عنبرین کو اس ادارے میں بھیج دیا گیا تھا اس کی خوش نصیبی دیکھیے اسے آپ جیسے شفیق والدین کا سہارا مل گیا۔''

''حیدر علی صاحب کیا میں اس لڑکے کا نام جان سکتا ہوں؟'' ''میں ابھی رجسٹر میں دیکھ کر بتاتا ہوں ......'' اس نے الماری میں سے ایک فائل نکال کر چند کاغذات الٹنے پلٹنے کے بعد کہا ''اس کا نام عمران حسین تھا......''

حیدر علی صاحب سے میں نے اس مکان کا ایڈریس پوچھا جہاں عنبرین کے والدین رہتے تھے اس نے پہلے پس و پیش کیا پھر بتا دیا میں اس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلا اور اس معمے کی آخری گمشدہ کڑی کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

شہر میں واقع یہ مکان نہایت ہی گنجان اور غلیظ آبادی میں تھا اس جگہ سوگواری اور اداسی چھائی ہوئی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عرصہ دراز سے ویران پڑا ہے۔

مکان سے ملحق ایک گھر کے سامنے پیپل کا درخت اور ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا جس میں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس کے ایک گوشے میں گلاب کے پھولوں کے پودے دیکھے جو غریب گھرانوں میں نہیں ہوتے ان کی خوشبو تیزی سے پھیل رہی تھی میں وہاں کھڑا ہو کر اس مکان کو دیکھنے لگا دفعتاً ایک آواز

میرے کانوں میں آئی ''کون ہیں یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' ساتھ پڑوس میں ایک عمر رسیدہ خاتون یہاں کھڑی تھی۔

میں نے چونک کر ادھر دیکھا ''جی کیا یہ والا مکان خالی ہے؟''

''آہ..... یہ مکان خالی ہے، لوگ کہتے ہیں یہ آسیب زدہ ہے وہ حادثہ..... خدا رحم کرے میں کبھی نہیں بھول سکتی.....'' اس نے الو کی مانند اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں اور بولی میں نے خود اسے یہاں مرا ہوا پایا تھا..... وہ دیکھو وہاں گرا تھا۔ اس کی روح اب بھی آتی ہے جس نے کئی بار اسے دیکھا ہے اور اس وقت تک وہ نہیں جائے گا جب تک اپنی بہن کو دوبارہ نہ پالے۔

☆......☆......☆

''ماں جی تم کس کے بارے میں کہہ رہی ہو'' میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا ''عمران حسین ..... بیچارہ کتنا اچھا تھا دبلا پتلا سرخ بالوں والا..... اپنی بہن عنبرین سے بے حد پیار کرتا تھا مجھے یاد ہے وہ گھنٹوں اپنی ننھی بہن کو گود میں لیے اس پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا رہتا تھا'' بوڑھی عورت کی آنکھوں میں آنسو آگئے دفعتاً وہ چیخ کر بولی ''چلے جاؤ..... یہاں سے دور..... یہ مکان رہنے کے قابل نہیں ..... یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو مر کر بھی زندہ ہیں۔'' لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا میں وہاں سے نکل کر سڑک پر آ گیا مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کہاں جانا چاہیے ..... میرے ہوش و حواس معطل ہو چکے تھے۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی پورے تین بج چکے تھے۔

اب مجھے یاد آیا عنبرین اسکول کے دروازے پر کھڑی میرا انتظار کر رہی ہوگی میں پاگلوں کی طرح بھاگا..... مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے اسکول کتنے فاصلے پر ہے۔ میں ہانپتا کانپتا گرد و غبار سے اٹا ہوا اسکول پہنچا میدان سنسان پڑا تھا بھاگتا ہوا کلاس روم میں گیا۔ بچوں کو استانی پڑھا رہی تھی ''م..... میں عنبرین کا والد ہوں مجھے افسوس ہے کہ مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔ میری بیٹی کہاں ہے؟'' ''باقر علی۔''

استانی کی پیشانی پر شکنیں سی ابھریں ''ارے ہاں ..... یاد آیا ..... وہی خوب صورت سے سرخ بال اور سر پر ٹوپی بھی تھی جس لڑکی کے ..... مگر آپ فکر مت کریں لڑکی کا بھائی آیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ دونوں بہن بھائی آپس میں حیرت انگیز مشابہت رکھتے ہیں۔'' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے پہاڑ کی چوٹی سے زمین پر دھکیل دیا گیا ہے۔

''اس نے ..... لڑکے نے آپ سے کچھ کہا .....؟'' ''جی نہیں..... وہ کچھ بولا نہیں وہ تو بس معصومانہ انداز میں مسکرایا تھا میرا خیال ہے وہ دونوں اب تک گھر پہنچ گئے ہوں گے! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' میں جواب دیے بغیر وہاں سے نکلا گھر پہنچ کر میں نے سارا گھر چھان مارا ادھر ادھر بہت بھاگا عمران اور عنبرین کو پاگلوں کی طرح پکارنے لگا۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے چاروں طرف بہت سے پیپل کے درخت ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ان پھولوں کے پودوں کا رنگ جیسے خون کی مانند سرخ ہو گیا پھر سیاہ..... کئی ہفتے تک میں مسلسل بے ہوش رہا جب ہوش آیا تو پتا چلا مجھے لوگ گئی تھی اس تمام عرصے میں پولیس عنبرین کو تلاش کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔

اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے کئی مہینوں تک ہم نے مسلسل اعلانات کرائے مگر عنبرین کا کوئی سراغ نہیں ملا..... کوئی کہتا ہے ننھی عنبرین کو کسی نے اغوا کر لیا کوئی کہتا ہے اسے کسی نے ہلاک کر دیا مگر اصل حقیقت اس دنیا میں صرف دو افراد کو معلوم ہے ..... ایک میں اور دوسری وہ بوڑھی عورت جو عمران کی موت کا مشاہدہ کر چکی تھی اس حادثے کو پیش آئے کئی برس گزر چکے ہیں لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں کوئی میرے قریب نہیں پھٹکتا کیوں کہ میں سرخ بالوں والے بچوں سے ڈرتا ہوں اور پیپل کا درخت دیکھ کر میری چیخیں نکل جاتی ہیں کیا میں واقعی پاگل ہوں.....؟؟؟؟

☆......☆......☆

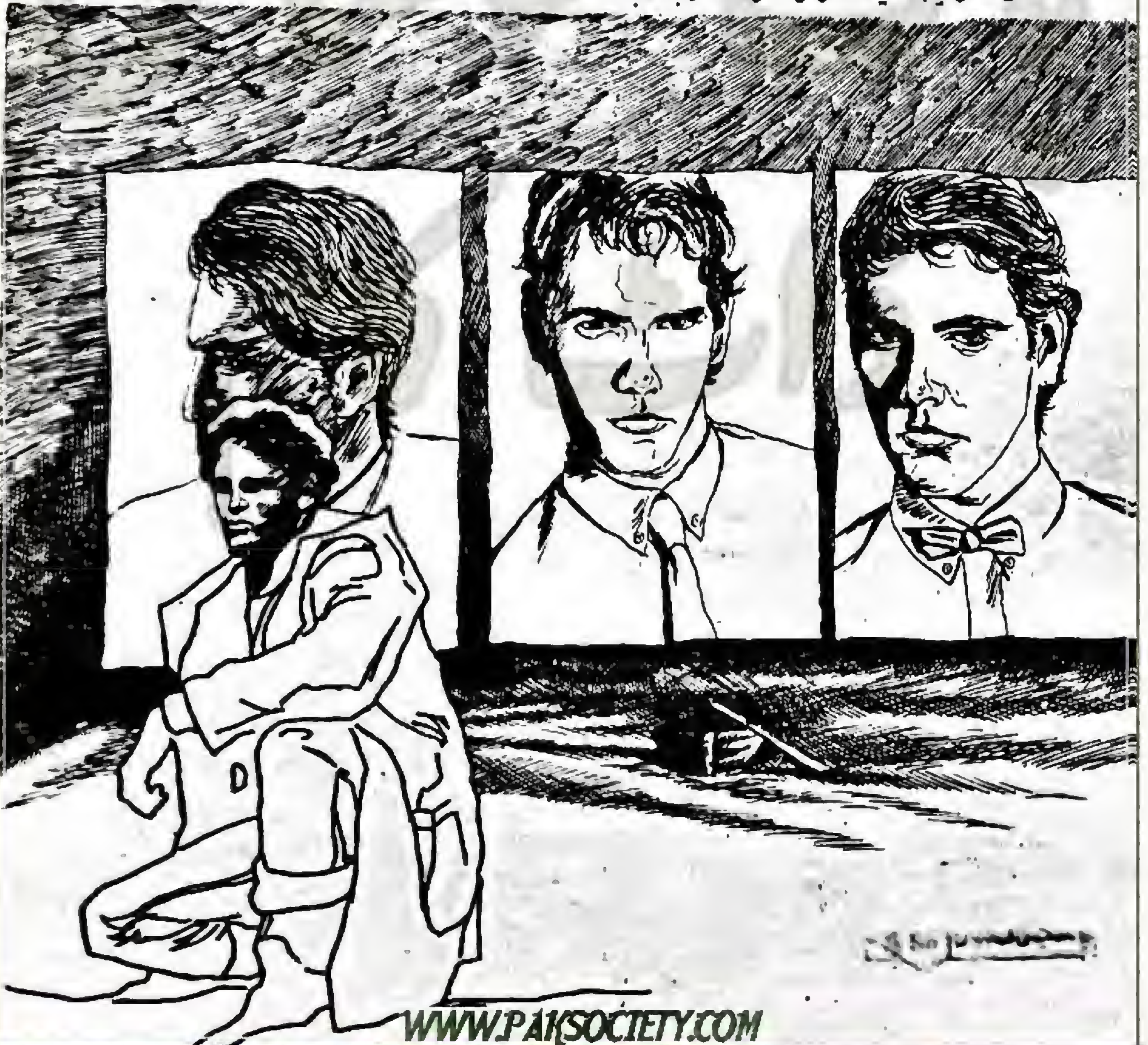
ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی تیسری کڑی

جھیل سے تھوڑے فاصلے پر وہ سرمئی لکیریں نظر آرہی تھیں جو تاحد نظر چلی گئیں تھیں یہ ریل کی پٹری تھی۔ نجانے کیوں انہیں یہ جگہ دیکھ کر خوشی سی ہوئی شاداب کہنے لگا۔



''ممکن ہے تھوڑے بہت فاصلے پر ریلوے اسٹیشن بھی ہو او ہو...... دیکھو وہ شاید ٹرین آ رہی ہے۔'' انہوں نے بہت دور ریل کا انجن دیکھا تھا جو اسی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی سیٹی سنائی دی ساتھ ہی لوہے کی پٹریاں کھٹ کھٹ بجنے لگیں یہ لوگ ادھر دیکھنے لگے جدھر سے ریل آ رہی تھی پھر انہوں نے ایک چوڑے درخت کے عقب میں پناہ لینا مناسب سمجھا ریل تیز رفتاری سے آ رہی تھی ذرا سی دیر میں ایک بار پھر ٹرین کی سیٹی بجی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی ریل گاڑی ان کے سامنے آ گئی دونوں چپ چاپ ادھر کھڑے اسے گزرتے دیکھتے رہے پہلے انجن دھاڑتا ہوا گزرا پھر ایک ڈبہ پھر دوسرا ڈبہ پھر تیسرا ڈبہ پھر فرسٹ کلاس کا ڈبہ سامنے آ گیا لیکن اس کے ساتھ ہیں ایک انوکھا واقعہ ہوا ایک کھڑکی کھلی دو ہاتھ ایک سوٹ کیس اٹھائے باہر نکلے پھر انہوں نے ایک سوٹ کیس باہر اچھال دیا اور سوٹ کیس پٹری کے نشیب میں دور تک لڑھکتا چلا گیا ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی تیزی سے آگے نکل گئی تھی یہ سب کچھ اتنی برق رفتاری سے ہوا کہ ایک لمحہ کے لیے تو وہ سمجھ ہی نہ پائے کہ کیا ہوا ہے دونوں حیران پریشان اپنی جگہ کھڑے اس منظر کو دیکھتے رہے سوٹ کیس زیادہ دور نہیں تھا وہ تھوڑی دیر تک اسے حیرت سے دیکھتے رہے پھر شاہ زیب نے دلاور کی طرف دیکھا اور دلاور نے آنکھ سے اشارہ کیا وہ آگے بڑھے اور سوٹ کیس کے قریب جا کر کھڑے ہوئے سیاہ چمڑے کا سوٹ کیس تھا دلاور آگے بڑھا اور اس نے سوٹ کیس کو اٹھانے کی کوشش کی تو ایک دم سے شاہ زیب نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔

''رک تو سہی یار''

''پتا نہیں اس میں کیا ہے۔'' دلاور بولا۔

''جب پتا نہیں اس میں کیا ہے تو ویسے ہی جھپٹ پڑا کوئی خطرناک بات بھی ہو سکتی ہے مجھے تو کوئی گڑبڑ ہی نظر آتی ہے کوئی دھماکہ خیز مواد نہ ہو اس میں۔''

''پپ پتا نہیں کیا ہے۔'' دلاور کے لہجہ میں بھی خوف کی ہلکی سی آمیزش تھی دونوں تھوڑی دیر تک سوٹ کیس کو تکتے رہے آخر کار شاہ زیب نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑا اور اسے اٹھا کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے سوٹ کیس زیادہ بھری نہیں تھا اس کے وزن سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر کپڑے وغیرہ ہی ہیں۔

اچانک شاہ زیب کے منہ سے نکلا۔

☆......☆......☆

''یار خدا کرے اس میں کپڑے ہوں اور ہمارا کام بن جائے گا یہ جیل کے کپڑے تو ہمارے لیے موت کا سامان ہے دن کی روشنی میں کہیں کسی کے سامنے بھی نہیں آ سکتے بھوک ہے کہ جان نکال رہی ہے۔''

''اب دیکھو تو سہی کھول کر ہو سکتا ہے ہمارے کام کی چیزیں نکل آئیں ویسے تم نے دیکھا کہ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے گرا ہے تو اس میں سامان بھی فرسٹ کلاس کا ہی ہوگا مگر اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کھڑکی سے پھینکا کیوں گیا ہے......؟

''اب جو سوال پیدا ہوا ہے اس کا جواب اس سوٹ کیس کو کھول کر ہی مل سکتا ہے۔''

''یہاں سے تو ہٹو کوئی خطرناک بات بھی ہو سکتی ہے۔'' دلاور نے سوٹ کیس اپنے ہاتھ میں لٹکا لیا اور دونوں آگے بڑھ گئے یہاں سے خاصی دور آ جانے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر ریل کی پٹری کی طرف نگاہیں دوڑائیں جو اب سنسان پڑی ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ ٹرین کے مخالف سمت چلنے لگے جو سامنے آ گئی تھی بڑی مشکل سے وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئے ہوں گے کہ اچانک درختوں کے نیچے پڑے ہوئے پتوں پر آہٹ ابھری اور انہوں نے صاف اس شخص کو دیکھ لیا جو ان کی طرف آگے بڑھ رہا تھا اس نے غالباً ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا اور دوسرے لمحے اس کی چیختی ہوئی آواز ابھری۔

''رک جاؤ اوئے رک جاؤ......رک جاؤ ادھر ہی۔''
دونوں کے قدم رک گئے دلاور نے بدستور سوٹ کیس اٹھایا ہوا تھا۔ آنے والا کچھ اور قریب آیا اور زور سے بولا۔
''دیکھتا کیا ہے جیسا میں کہوں ویسا ہی کر کیا سمجھا ورنہ......ورنہ......'' وہ آہستہ سے پلٹا ہوا اور قریب آ گیا اور پھر بولا۔
''ہوں......تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو۔ ٹھیک......ٹھیک......ٹھیک'' مگر تو کون ہے؟
''چھوڑ و یہ بعد میں بتاؤں گا۔ لا یہ سوٹ کیس مجھے دے دے۔''
''کیوں تجھے دے دوں۔'' دلاور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔
''او......بیٹا زیادہ جوانی مت دکھا۔ تجھے معلوم نہیں جس کا یہ سوٹ کیس ہے وہ کیا چیز ہے اس میں جو کچھ ہے وہ اس کا مال ہے اور یہ سوٹ کیس اسی بندے نے نیچے پھینکا ہے۔ کیا سمجھے۔''
''مم......مگر......''
''اوئے......اگر مگر مت کر......گولی کھائے گا کیا۔'' اس نے اپنے لباس سے پستول نکال لیا۔ دلاور نے شاہ زیب کی طرف دیکھا تو شاہ زیب بولا۔
''مت جھگڑا مول لو......سوٹ کیس اسے واپس کر دو'' دلاور نے مایوسی سے یہ سوٹ کیس اس کے سامنے اچھال دیا پھر بولا۔
''اتنا تو بتا دے کہ اس میں کیا ہے؟
''جو کچھ بھی ہے بہت اونچی چیز ہے کیا سمجھا باس اسی طرح کا کھیل کھیلتا ہے کسی تگڑے آدمی کا مال ہو گا لیکن اب یہ باس کا ہے۔''
''چھوڑ......چھوڑ......چھوڑ میں نے تیری جان ہی بخش دی یہ کافی ہے اس سے آگے بات کرے گا تو تجھے نقصان پہنچ جائے گا مگر ایک بات بتاؤ تم دونوں جیل سے بھاگے ہوئے ہو اب اس میں چھپانے کی کوئی بات نہیں کیا کر رہے ہو اور کہاں جاؤ گے۔''
دلاور نے کس قدر حیرانی سے اس شخص کو دیکھا عجیب سا آدمی تھا ہاتھ میں پستول بھی تھا لازمی بات ہے یہ سوٹ کیس اسی کے لیے پھینکا گیا تھا مگر اس کا رویہ بڑا نرم تھا شاہ زیب نے البتہ فوراً کہا۔
''ہاں ہم جیل سے بھاگے ہوئے ہیں لیکن اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟''
''سوٹ کیس کھول کر دیکھتے ہیں اس میں کیا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ بندے کو اپنے ہم پیشہ لوگوں سے تھوڑی بہت دلچسپی تو ہوتی ہے اب تم لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارا کام بھی ذرہ الگ سا ہے چنانچہ میں تمہارے ساتھ رعایت کرنے کو تیار ہوں اگر اس میں کپڑے وغیرہ ہوئے تو تم کپڑے بدل لینا کیا سمجھے ''یہ کہہ کر اس نے کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر بولا۔
''چلو سوٹ کیس کھولو۔''
سوٹ کیس کھولا گیا اس میں واقعی کافی کپڑے بھی تھے اور اس کے ساتھ کافی رقم بھی تھی اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اپنا یار غلط ہاتھ نہیں مارتا بات تو تمہاری سمجھ میں آ ہی گئی ہوگی اس نے آسامی تاڑی ہوگی اور فرسٹ کلاس ڈبے میں جا بیٹھا ہو گا ٹکٹ لے کر پھر طے شدہ جگہ یعنی جہاں ہم لوگ ہیں اس نے تاڑا ہو گا سوٹ کیس کھڑکی سے باہر اچھال دیا کسی کو پتہ نہیں ہو گا اسے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سوٹ کیس میں کتنا مال ہے چنانچہ اب یہ یاروں کا ذرہ دیکھو جلدی سے کپڑے نکالو اس میں سے۔''

یہ لوگ جلدی جلدی سوٹ کیس دیکھنے لگے اور اس میں سے انھوں نے اپنی مرضی کے مطابق کپڑے نکال لیے یہ تو ایک طرح سے کہنا چاہیے تھا۔ کہ قدرتی مدد تھی۔ کپڑے اپنے بدن پر لگا کر دیکھا تو اندازہ ہوا'' ٹھیک ہی ہیں'' اس شخص نے کہا۔

'' میرا نام کمالی ہے یہ میں نے تمہارے لیے کر دیا ہے ہوسکتا ہے زندگی میں کبھی دوبارہ مل جاؤ لو یہ تھوڑی سی رقم رکھ لو پتا نہیں کیسے حالات ہیں تمہارے۔''

دونوں نے جھٹ پٹ کپڑے بدل لیے یہ واقعی کمال کی بات تھی کہ کپڑے ان کے بدن پر آ گئے تھے چنانچہ دونوں تیار ہو گئے تب اس شخص نے کہا......

'' اسی لائن کے ساتھ ساتھ چلے جاؤ اور پھر اسے عبور کرنے کے بعد سیدھے ہاتھ پر چلے جانا یہاں تمہیں ایک چھوٹا دوسا پہاڑی سلسلہ نظر آئے گا اس سے گزر کر آگے بڑھ جانا اور دیکھ لینا کہ اترائی میں بستی نظر آ جائے گی وہاں تمہیں جینے کا سہارا مل جائے گا جاؤ...... دوستو گڈ لک۔'' یہ کہہ کر کمالی نے سوٹ کیس اٹھایا اور ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

پھر بولا۔

'' غداری مت کرنا پیچھے سے حملہ کرنے والے کتے ہوتے ہیں دونوں کو گولی مار کر ہلاک کر دوں گا۔''

''نہیں کمالی یار ا تم نے ہمارے ساتھ جو کیا ہے اس کے بعد اس کی گنجائش نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ غداری کی جائے۔''

☆......☆......☆

'' رب راکھا۔'' کمالی نے کہا اور سوٹ کیس اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا وہ لوگ اسے دیر تک تکتے رہے تھے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ ایسا عجیب وغریب واقعہ شاید ہی پہلے کسی کو کبھی پیش آیا ہو۔ کمالی تو ان کے لیے انسان نما فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔ وہ چلتے رہے اور نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد انھیں ایک پل نظر آ گیا پل سے گزر کر وہ اس برساتی نالے کے پاس پہنچ گئے خشک نالے کے دوسری طرف کھجور کے درخت تھے اور ان کے پیچھے جنگلی درخت اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا ایک علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ بڑی بڑی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے پھر کمالی کے کہنے کے مطابق اونچے اونچے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور پہنچے تو دور دور تک درخت بکھرے ہوئے تھے جھاڑیاں بھی تھیں ٹیلے کی بلندی سے انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر ڈھلانوں سے اترنے لگے یوں یہ سفر جاری رہا چڑھائیوں پر چڑھتے اور آگے ڈھلانوں پر اترتے اب وہ بہت تھک چکے تھے اور انہیں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ دونوں نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، کچھ فاصلے پر انھیں جھاڑیوں کا جھنڈ نظر آیا قریب ہی دو پتھریلے ٹیلوں کے درمیان ایک ایسا خلا نظر آیا جس کے اوپر ٹیلوں کی چوٹیاں ملنے سے محراب بن گئی تھیں یہاں وہ آرام کر سکتے تھے۔ دھوپ سے بچ کر دن بھی گزار سکتے تھے۔ ویسے بھی ہر طرف ویرانی ویرانی تھی اور انھیں اس وقت ویرانی کی ضرورت تھی۔

آخر کار دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھے اور اس محراب کے سامنے جا کر ٹھہر گئے محراب ان کے قد سے اونچی تھی اندر کی زمین ہموار تھی اور اس میں سخت مٹی کی تہہ اور پتھر تھے مگر جگہ صاف ستھری تھی محراب سے ذرہ ہٹ کر ایک درخت سر اٹھائے کھڑا تھا اور دوسری طرف کا حصہ بھی تھوڑا کھلا ہوا تھا اس کے عین نیچے گہرا کھڈ تھا...... کھڈ ریتیلی مٹی کے اونچے نیچے تودے نظر آ رہے تھے۔

دونوں کو اس طرح تھوڑا سا لیٹ کر سکون ملا تھا وہ اپنی اپنی یادوں میں ڈول رہے تھے یہاں تک کہ ان کی آنکھ لگ گئی دن کا ایک پہر گزر گیا دو پہر ہوئی اور دن ڈھلنے لگا وہ دونوں قرب وجوار کے ماحول سے بالکل بے خبر تھے

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آیئے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہو جایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے......

خود کو منوایئے، اپنے قلم سے......

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہونے اور لرزا دینے والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان واقعات و حادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔

نوک پلک سنوار کر اُسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز سچ کو کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔

ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

یہاں تک کہ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا جب شاہ زیب کی آنکھ کھلی دلاور ابھی تک بے خبر سو رہا تھا شاہ زیب تھوڑی دیر تک بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا اب کیا کرنا چاہیے؟ کپڑے تبدیل کرنے سے دل میں اطمنان پیدا ہو گیا تھا۔ یہ کپڑے ان کے بدن پر بالکل فٹ نہیں تھے لیکن پھر بھی کم از کم جیل کے کپڑوں سے نجات مل گئی تھی اور فوری طور پر کوئی ان کو ادھر دیکھ کر چونک نہیں سکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا سخت بھوک لگی ہوئی تھی پھر اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور ایک طرف چل پڑا آگے بڑھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے لگا ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلملا رہی تھیں نیچے کھائی میں نیلگوں دھند کا پھیلا ہوا تھا شاہ زیب آگے بڑھا سرس کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ ان میں پیلے پیلے پھولوں کے گچھے جھول رہے تھے ان کی مہک ہوا میں بسی ہوئی تھی وہ ٹیلوں اور ٹبوں کے دامن میں اونچے نیچے ناہموار راستوں پر چلتا ہوا دور تک چلا گیا کہ ایک تیز بو کا بھبکا آیا اس نے ایک ٹیلے کی بلندی سے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک مردار خچر پڑا ہے دو گدھ اس کا گوشت کھا رہے ہیں مردہ خچر کے جسم سے اٹھتی ہوئی تیز بو کے باوجود شاہ زیب وہیں کھڑا رہا...... دور درختوں کے پیچھے سے دھواں اٹھ رہا تھا جو شام کے دھندلکے میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا یہ اس بات کی علامت تھی کہ قریب ہی کوئی آبادی ہے وہ اسی طرف چل پڑا نزدیک جا کر دیکھا ٹیلوں کے دامن میں اونچا اور ابھرا ہوا میدان ہے جن میں خیمے لگے ہوئے ہیں خیمے پھٹے پرانے تھے وہ بے ترتیبی سے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے وہ میدان میں پہنچنے کے لیے مڑا جھٹ پٹے میں اس نے دیکھا دو خانہ بدوش لڑکیاں آپس میں گتھم گتھا تھیں ایک دوسرے کے بال نوچ رہی تھیں ان کے قریب ہی زمین پر سوکھی شاخوں کے گٹھے رکھے ہوئے تھے سامنے مٹی کے تودے پر ایک نوجوان بیٹھا نہایت سکون سے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے جھونٹے کھسوٹے دیکھ رہا تھا شاہ زیب کی چاپ سن کر نوجوان نے پلٹ کر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر ایک دم اٹھ کر خیموں کی سمت میں بھاگا لڑکیاں بھی دھینگا مشتی چھوڑ کر شاہ زیب کو تکنے لگیں ان کے لباس بوسیدہ اور گندے تھے بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں جھونٹے کھسوٹنے سے بکھر کر منہ پر آ گئی تھیں رخسار تازہ سیب کی طرح گلابی تھے ایک خانہ بدوش لڑکی بڑھ کر شاہ زیب کی طرف آ گئی اس کے بدن کی تیز بو شاہ زیب کی سانس میں گھل گئی وہ دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"اس نے مجھے مارا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ شاہ زیب کے اور قریب آ گئی شاہ زیب نے جھرجھری لی اور بے رخی سے اسے جھٹکا دیا وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی لڑکی کے بھورے بال بکھر گئے۔

اس نے شاہ زیب کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تم نے میری بات نہیں سنی۔" دوسری لڑکی نے اس بات پر زور سے قہقہہ لگایا اور خود بھی آگے بڑھ کر بولی۔

"کدھر جانا ہے۔"

"پتہ نہیں۔"

لڑکی نے شانے اچکائے اور پھر قریب پڑے ہوئے لکڑیوں کے گٹھے سروں پر رکھے اور ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتیں آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ شاہ زیب آہستہ آہستہ اس طرف چل پڑا جہاں خانہ بدوشوں کے خیمے نظر آ رہے تھے ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک بوڑھا خانہ بدوش دو نوجوانوں کے ساتھ خیمے کے پیچھے سے نکلا اور شاہ زیب کی طرف بڑھنے لگا ان کی نگاہوں میں شک و شبے کے آثار تھے پھر اس میں سے ایک نے کہا۔

"ہم لوگ یہاں زیادہ وقت نہیں گزاریں گے اور ہم کوئی جرم نہیں کرتے اگر تم ہمیں غلط سمجھ رہے ہو اور پولیس کے بندے ہو تو یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو ہم بالکل نقصان نہیں پہنچاتے کسی کو۔"

شاہ زیب کی سمجھ میں اب بات آئی کہ اصل مسئلہ کیا ہے ہو سکتا ہے پولیس والے انھیں پریشان کرتے ہوں ہم

حال اس نے چند لمحات کے بعد کہا۔
''میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں بلکہ ایک مسافر ہوں جو راستہ بھٹک کر ادھر آ گیا ہوں اور مجھے زور کی بھوک لگی ہوئی ہے'' شاہ زیب نے فوراً محسوس کیا کہ اس کے ان الفاظ سے ان کے چہروں پر سکون کی کیفیت نمودار ہو گئی ہے ان میں سے ایک نے کہا۔
''تو پھر آیئے بابو ہمارے پاس۔'' شاہ زیب ان کے ساتھ آگے چل پڑا انھوں نے اسے بیٹھنے کے لیے ایک اسٹول نما چیز دی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی آدمی گلاس بھر کے دودھ اور موٹی موٹی مکئی کی روٹیاں لے آیا جن پر شہد رکھا ہوا تھا ساتھ ہی وہ پانی بھی لے آیا تھا۔
یہ تمام چیزیں کھا پی کر جیسے شاہ زیب کو نئی زندگی کا احساس ہوا اور اس کے بعد اس نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا تو خانہ بدوشوں میں سے وہ شخص بولا۔
''صاحب جی ہم بہت جلدی یہاں سے چلے جائیں گے آپ بالکل فکر نہ کرنا ہم یہاں کوئی جرم کا کام نہیں کر رہے آپ کی مہربانی ہوگی آپ ہمیں پریشان نہ کرو۔''
''ٹھیک ہے...... میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں اور بلا وجہ میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔''
شاہ زیب وہاں سے واپس چل پڑا شام گہری ہو رہی تھی اور اندھیرا بڑھ رہا تھا راستہ ناہموار اور پیچیدہ تھا۔ اور چڑھائی بھی چڑھنا تھی وہ جلد سے جلد دلاور کے پاس جانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دلاور اس کے لیے بہت پریشان ہو رہا ہوگا اور پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دلاور کے قریب پہنچ گیا تھا۔
''کہاں چلے گئے تھے شاہو...... میں تو بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ شاید تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہو۔''
شاہ زیب جو اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر آیا تھا ہنسنے لگا اور اس نے تازہ تازہ روٹیاں لوازمات کے ساتھ دلاور کے سامنے رکھیں تو وہ بچوں کی طرح چہکتے ہوئے بولا۔
''ارے واہ! یار یہ مال کہاں سے ہاتھ آ گیا۔''
''بس تقدیر کی بات ہے میں نے کہا تھا نا تم سے دلاور کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کے ہیں وہی دیتا ہے۔''
دلاور آرام سے کھاتا رہا اور پھر بولا۔
''یار تو سچ مان اگر کچھ وقت اور کھانے کے لیے مجھے نہ ملتا تو میں تو لمبا ہی ہو جاتا بڑی مدد کی ہے اللہ نے۔''
وقت گزرتا رہا شاہ زیب نے اسے بتایا کے کھانے پینے کی چیزیں کہاں سے ملی ہیں تو دلاور گردن ہلانے لگا۔
رات گہری ہوتی چلی گئی، پھر چاند نکل آیا اور چاندنی پھیلتی چلی گئی کافی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے دلاور نے کہا۔
''اب بتاؤ اب کیا ارادہ ہے یہ ریلوے لائن ہمیں اسٹیشن تک لے جا سکتی ہے تو یہ چاہیے کہ اب ہم چل پڑیں اور کسی شہر میں جا کر بسیرا کریں...... ہمارے سامنے زندگی کا ایک مشن ہے میں آج تک نہیں جانتا کہ تمہارا اپنا آگے کا کیا ارادہ ہے۔ لیکن میری زندگی میں تو ایک ہی راستہ ہے وہ یہ کہ میں اپنی ماں اور بہن کو تلاش کروں اس کے علاوہ میری زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں ہے البتہ ایک بات میں تم سے کہوں اگر برا نہ مانو۔''
''ہاں ہاں بولو!''
''میک اپ کا وہ سامان میرا مطلب ہے وہ ماسک اب بھی میرے پاس محفوظ ہے ہم دونوں چونکہ اس قدر ہم شکل ہیں کہ جڑواں بھائی معلوم ہوتے ہیں لوگوں کے لیے ایک عجوبہ ہوتا ہے دو انسانوں کا ایک جیسا چہرہ، میں اگر تم اجازت دو تو اپنا چہرہ اسی طرح تبدیل کر لوں حالانکہ اب یہ بھی خطرناک ہے لیکن ٹھیک ہے کسی منزل تک پہنچنے

کے لیے تو یہ ضروری ہے بعد میں جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا ہم میں سے ایک شیو بنا لے گا اور دوسرا اصلی شکل میں رہے گا میرا مطلب ہے بدلی ہوئی شکل میں کوئی ایسی ترکیب کریں گے کہ ہم لوگ الگ الگ محسوس ہوں ورنہ ایک جیسے ہوں گے تو ساتھ ہی دیکھا جائے گا۔"

"اچھا آئیڈیا ہے۔" شاہ زیب نے گردن ہلا کر کہا۔

☆......☆......☆

خاصی رات تک وہ باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے صبح اٹھ کو دونوں نے کمئی کی روٹی کا یک ایک ٹکڑا کھایا اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرلیا کہ اب یہاں سے چلتے ہیں۔ چنانچہ تمام کاموں سے فراغت حاصل کر کے وہ ریلوے ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتے رہے پھر ایک سڑک آ گئی وہ سڑک کے ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ اب کوئی آبادی قریب آنے والی ہے اور یہ آبادی زیادہ دور نہ نکلی اس کے آثار نظر آئے، کچھ عمارتیں نظر آئیں، کارخانے وغیرہ تھے اور اس کے بعد ریلوے اسٹیشن وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے اور پھر ایک ریل میں بھی چڑھ گئے بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا تھا۔ آگے کے معاملات دیکھنے تھے کہ آگے کیا ہوتا ہے اس سلسلے میں دونوں کو کوئی پریشانی نہیں تھی وہ جانتے تھے کہ انھیں باقی کا سفر کیسے طے کرنا ہے۔ چنانچہ وہ ریلوے کے ڈبے بدلتے رہے الگ الگ ڈبوں میں بھی بیٹھے اور ریل سفر کرتی رہی پھر ایک چھوٹا سا اسٹیشن آیا اور وہاں انھوں نے کچھ کھایا کہیں دیکھی پولیس والے کسی کو تلاش کر رہے تھے یہ لمحہ ان کے لیے بڑا خطرناک تھا چنانچہ دونوں ہوشیار ہو گئے یہ طے کرلیا تھا کہ ڈبہ بدل لیا جائے اس لیے وہ اندر ہی اندر ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے شاہ زیب کن انکھیوں سے پولیس والوں کی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا ریل کو زیادہ دیر نہیں رکنا تھا چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ چل پڑی پولیس والے وہیں رہ گئے جب رینگنے کے بعد ریل کی رفتار تیز ہوگئی تو شاہ زیب نے سکون کا سانس لیا ایک عجیب سی کیفیت اس کے دل میں ہوگئی تھی اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کم از کم یہ غلط ہوا ہے وہ پولیس کی نگاہوں میں ہے اور پولیس اسے دلاور کے دھوکے میں پکڑ چکی ہے دلاور تو تیز اور چالاک آدمی ہے اور ان راستوں کا راہی ہے لیکن میرے لیے بڑی مشکل ہے اگر میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو یہ ثابت کرنے میں بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا میں دلاور نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے اگر بالکل سر پر آپڑی تو اپنے گھر والوں سے مدد لی جا سکتی ہے لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہوئی جس مشن پر نکلا تھا اور جس آمادگی کے ساتھ نکلا تھا وہ ادھورا رہ جائے گا اور شرمندگی اٹھانی پڑے گی یہ شرمندگی اسے ناپسند تھی......

ریل نے کافی سفر طے کرلیا۔ دلاور واپس نہیں آیا تھا حالانکہ اس سے پہلے بھی وہ ڈبے بدلتے رہے تھے لیکن جونہی تھوڑی دیر گزرتی دلاور اس کے پاس آجاتا...... خاصا وقت گزر گیا اور دلاور نظر نہ آیا تو اسے بڑی تشویش ہونے لگی۔ یہ کیا ہوا یہ تو اس نے دیکھ لیا تھا پولیس نے کسی کو پکڑا نہیں ہے یعنی دلاور روشنی میں نہیں آیا مگر پھر وہ گیا کہاں؟ وہ انتظار کرتا رہا اور پھر جب بہت ہی دیر گزر گئی تو اپنی جگہ سے اٹھا اور ریلوے کے اندرونی ڈبوں کو پھلانگتا ہوا ایک سے دوسرے ڈبے کی طرف چلا گیا وہ ایک ایک شخص کو دیکھتا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ ایک کے لیے چوڑے ڈبے کو عبور کرتا ہوا آخری ڈبے تک پہنچ گیا مگر دلاور کا کہیں پتا نہیں تھا دلاور اسی طرف گیا ہوگا اب تو شاہ زیب کو تشویش ہونے لگی مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی وہ وہاں سے واپس پلٹا اور پھر اتنا ہی لمبا فاصلہ طے کر کے اس نے پوری ریل کا جائزہ لیا لیکن اسے پورا یقین ہوگیا تھا دلاور اب ریل میں نہیں ہے۔ تو کیا وہ اسٹیشن پر اتر گیا مگر کیوں؟ ایسی کیا بات ہوئی تھی ایسا کیا واقعہ ہوا تھا کوئی بات جو سمجھ میں آرہی ہو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ کہیں پولیس سے بچنے کے لیے وہ کسی بیت الخلا وغیرہ میں نہ چلا گیا ہو۔ لیکن اگر وہاں بھی چلا گیا تھا تو واپس تو آنا چاہیے تھا یا کوئی اور واقعہ...... شاہ زیب عجیب سے انداز میں سوچنے لگا اور پھر اپنے ڈبے میں آکر بیٹھ گیا۔ اب اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آرہے تھے وہ پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ اگر دلاور

اس سے جدا ہوگیا تو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا حالانکہ کوئی ایسی بات نہیں تھی وہ اپنے طور پر بھی اپنی جگہ بنا سکتا تھا لیکن بس ایک بڑا اچھا ساتھ رہا تھا۔

طویل ترین سفر طے کرنے کے بعد آخر کار ریل اپنی منزل تک پہنچ گئی اور یہاں وہ خالی ہونے لگی شاہ زیب کا دل خون ہو رہا تھا دلاور گیا تو آخر کہاں گیا۔

ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ بھی گردن اٹھا کر اٹھا کر چاروں طرف دیکھنے لگا اس وقت اس کی دلی آرزو تھی کہ کاش دلاور اچانک نظر آ جائے۔ انسان کا انسان سے کوئی نہ کوئی رشتہ ہوتا ہے اور پھر دلاور تو اسے انوکھے حالات میں ملا تھا جو ہمیشہ یاد رہ جانے والے تھے لیکن دلاور کہیں نظر نہیں آیا پوری ٹرین خالی ہوگئی تھی اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بہت ہی شاندار فیملی نظر آ رہی تھی۔ سارے کے سارے لوگ کسی کے استقبال کے لیے تھے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں نوجوان بھی تھے اور ایک دو عمر رسیدہ نوجوان بھی تھے تقریباً دس گیارہ افراد کا یہ گروپ کسی کو خوش آمدید کہنے آیا تھا اور پھر ایک خوب صورت سی لڑکی جو ٹرین سے اتری تھی ان کی طرف بڑھی تھی اور سارے کے سارے دوڑ کر اس کی طرف لپک گئے ایک اور لڑکی بس وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

شاہ زیب چونکہ دلاور کی تلاش میں بھٹک رہا تھا اس لیے ایک نگاہ ان پر ڈالنے کے بعد پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن وہ لڑکی جو اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہ ادھر ہی کھڑی رہ گئی تھی، شاہ زیب کی طرف متوجہ ہوگئی اور دوسرے لمحہ شاہ زیب نے اس کی حالت خراب ہوتے دیکھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی پھر اس کے دونوں ہاتھ اٹھے وہ چند قدم آگے بڑھی اور اس کے بعد اوندھے منہ زمین پر آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

شاہ زیب کو بڑی حیرت ہوئی تھی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ لڑکی کی کیفیت، اسے ہی دیکھ کر ہوئی ہے جیسے ہی وہ گری اس کے ساتھیوں کی نگاہیں اس کی جانب اٹھیں اور پھر چیخم دھاڑ مچ گئی سب اس کی طرف دوڑے تھے لڑکی نیچے گر کر بے ہوش ہوگئی تھی وہ لوگ اسے اٹھانے لگے اور طرح طرح کی آوازیں ان کے منہ سے نکلنے لگیں...... لیکن پھر کسی نے شاہ زیب کو دیکھ لیا تھا اور ان میں سے ایک مرد چیخا۔

''ارے...... ارے...... ارے عالی بھائی عالی کو دیکھ کر بے ہوش ہوئی ہیں عالی...... عالی۔'' یہ کہہ کر وہ شاہ زیب کی طرف دوڑے تھے۔ شاہ زیب کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا یہ نیا نام اس نے سنا تھا اسے یہ تو اندازہ ہو چکا تھا کہ لڑکی اسی کی جانب متوجہ ہوئی تھی اور اسی جانب لپکی تھی اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی...... بے چاری کی ناک پر چوٹ آگئی تھی اور اس سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ بے ہوش تھی۔ معمر شخص کے چیخنے پر اس کی جانب متوجہ ہوا اور پھر دوسرا ہنگامہ ہوگیا اور اب یہ ہنگامہ تین اطراف بٹ گیا تھا کچھ لوگ اس لڑکی کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے جو ابھی ابھی ٹرین سے اتری تھی اچھی خاصی شکل و صورت کی لڑکی تھی لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ ساڑھی باندھے ہوئی تھی اس کے ماتھے پر بندی بھی لگی ہوئی تھی گویا وہ غیر مسلم تھی دوسرا گروپ اس لڑکی کی جانب متوجہ ہوگیا جو بے ہوش ہو کر گری تھی اور تیسرا شاہ زیب کے گرد جمع ہو رہا تھا۔

وہ لڑکا جو شاہ زیب کو دیکھ کر عالی...... عالی کا نام لے کر چیخا تھا شاہ زیب کے پاس آیا اور بولا ''بھیا...... بھیا...... بھیا میرے بھیا۔'' یہ کہہ کر وہ شاہ زیب سے لپٹ گیا پھر وہ معمر بزرگ بھی آ گئے انھوں نے کہا۔

''عالی کہاں چلے گئے تھے تم؟'' شاہ زیب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں وہ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے تھے۔ لیکن کیوں؟ کیسے آخر کیسے بزرگ نے آگے بڑھ کر کہا۔

''بیٹے اب تم کہیں نہیں جاؤ گے خدا کا شکر ہے کہ ہمیں تمھاری صورت تو نظر آ گئی یہاں تو نہ جانے کیا کیا ہو چکا تھا۔''

شاہ زیب نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ایک عورت جس کی عمر بتیس تینتیس سال ہوگی آگے بڑھ کر بولی۔
''بھیا ایسے چھوڑ دیتے ہیں گھر کو۔ اس طرح نظر انداز کرتے ہیں سب کو؟ دیکھو نشاط کی کیا حالت ہوگئی سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ کھڑے کھڑے گرتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے یہ درندگی تو نہیں کرنی چاہیے تھی تمہیں؟ ہر طرح کے اختلافات کسی نہ کسی طرح آخر دور ہو ہی جاتے ہیں یہ تو بری بات تھی۔''
شاہ زیب جو حواس باختہ ہو رہا تھا یہ لوگ نہ جانے کیا کیا کہتے رہے پھر بزرگ نے کہا......
دیکھو میں تم سے کوئی بات نہیں کہتا بہت اچھے انسان ہو تم بہت اچھے انسان ہو لیکن ناراضگیاں بھی چلتی ہیں ایسے تو کسی کو نظر انداز نہیں کرتے چلو آؤ گھر چلو۔''
''ل......لیکن جناب......میری بات تو سن لیجئے گا۔'' شاہ زیب نے ان معمر بزرگ سے کہا۔
''بیٹے گھر چلو ساری باتیں گھر چل کے ہی ہوں گی۔''
''مگر میری......میری بات تو سنیں۔''
''بھیا......بھیا پلیز......بھیا پلیز آپ کو میری قسم دیکھیں بھابھی کا کیا حال ہوگیا ہے۔'' اس نے دور سے اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا جسے سب لوگ ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔
''بھابھی......'' شاہ زیب کے ذہن میں پھر ایک چھنا کا سا ہوا اور وہ چکرانے لگا۔ ایک بہت ہی بڑی غلط فہمی کام کر رہی تھی لیکن کسی نے اسے ایک لمحے کے لیے نہ چھوڑا اس نے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن کوئی سننے کو تیار نہ تھا بزرگ نے کہا۔
''آؤ میرے ساتھ......اور سنو تم میری اولاد ہو اور میں نے زندگی بہت مشکلوں سے گزاری ہے بیٹا میرے لیے اور مشکل نہ پیدا کرو۔ تقدیر نے ایک بار پھر تمہیں ہم سے ملا دیا ہے تو ہمارے ساتھ یہ بدسلوکی نہ کرنا تمہیں خدا کا واسطہ۔''
شاہ زیب ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا ایک دم سے اس کے ذہن نے ایک فیصلہ کیا تھا یہ بہت اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں تھوڑا سا وقت انہیں دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے ویسے بھی یہاں کوئی منزل نہیں ہے بس لڑھکتا، ہوا ادھر آگیا تھا اور اب دیکھنا یہ تھا کہ تقدیر آگے کے لیے کیا فیصلہ کرتی ہے۔ چنانچہ وہ خاموش ہوگیا۔

☆......☆......☆

یہ لوگ اسٹیشن سے باہر آئے بے ہوش عورت کو آہستہ آہستہ ہوش آگیا تھا اسے ایک گاڑی میں بٹھایا گیا۔ لیکن یہ گاڑی وہ نہیں تھی جس میں شاہ زیب کو بٹھایا گیا تھا۔ یہاں چار گاڑیاں موجود تھیں ایک سے ایک شاندار اس کا مطلب ہے کہ بہت ہی دولت مند قسم کے لوگ ہیں وہ شاہ زیب کو بٹھا کر اپنے ساتھ لے چلے ایک نوجوان لڑکا جس نے سب سے پہلے شاہ زیب کو دیکھا تھا۔ شاہ زیب سے بہت زیادہ محبت کا اظہار کر رہا تھا بزرگ بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے شاہ زیب نے تھوڑی دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لی اس کے بعد وہ جس کوٹھی میں پہنچے تھے وہ بہت عمدہ تھی شاہ زیب کو اندر لے جایا گیا۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تب بزرگ نے کہا۔
''اس کے کپڑے تو سب محفوظ ہیں نا؟''
''بھیا کی ہر چیز محفوظ ہے، بھلا مجال ہے کسی کی کہ اسے کوئی ہاتھ لگا سکتا۔'' نوجوان نے کہا۔ پھر بزرگ بولے۔
''جاؤ غالی غسل کرو بیٹا۔ بیٹھ کر بات کریں گے۔ یقینی طور پر دنیا کی ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے تمہاری مشکل کا حل بھی نکل آئے گا بس جاؤ غسل کر کے کپڑے تبدیل کر لو بلکہ ایسے کرو نائلہ تم بھیا کے کپڑے نکال دو گھر میں پہننے والے یہ غسل کر لیں گے؟''
''ٹھیک ہے آئیے بھیا۔'' نائلہ نامی لڑکی نے کہا اور شاہ زیب اس کے ساتھ چل پڑا۔

ایک بہت ہی خوب صورت کمرے میں لے جا کر اس نے کہا۔
"دیکھ لیجئے بھیا یہ سارا کارنامہ میرا ہے خدا کی قسم میں نے آج تک آپ کے کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ روزانہ آتی ہوں، صفائی کرتی ہوں آپ کی ایک ایک چیز کو صفائی سے رکھتی ہوں۔ آپ دیکھ لیجئے کوئی چیز ضائع نہیں ہوئی۔ اچھا میں آپ کے کپڑے نکال دوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک الماری کی جانب گئی شاہ زیب پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارے منظر دیکھتا رہا تھا لڑکی نے الماری کھول کر گھر میں پہننے والے کپڑے نکالے اور انھیں لے کر واش روم کی جانب بڑھ گئی واش روم میں جا کر اس نے کپڑے لٹکائے پھر بولی۔
"میں باہر جا رہی ہوں آپ غسل کر کے لباس وغیرہ تبدیل کر لیجئے دیکھتی ہوں باہر کیا ہنگامے ہو رہے ہیں؟ بے چاری نشاط بھابی تو........تو........تو......معاف کیجئے گا میں نے بے چاری کہا ہے ناراض نہ ہوں۔ دیکھیں بھیا غصہ آتا ہے کسی کی بات پر لیکن یہ سلوک نہیں کیا جاتا آپ نے حلیہ دیکھ لیا ہوگا کیسی تروتازہ تھی گلاب کے پھول کی طرح اور اب کیا حشر ہو گیا ہے۔ کھڑے کھڑے گر جاتی ہیں بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ میں نے ساری ساری رات انھیں سسکیاں لیتے سنا ہے۔ نہیں بری بات ایسا نہیں کرتے۔"
شاہ زیب نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔ لڑکی باہر نکل گئی تو شاہ زیب نے گہری سانس لی اور اس وقت اس کی نگاہیں ایک خوب صورت کارنس کی جانب اٹھ گئی۔ کارنس پر ایک بہت ہی حسین تصویر فریم میں لگی ہوئی تھی۔ یہ دو افراد کی تصویر تھی ایک عورت اور ایک مرد لیکن دور سے ہی شاہ زیب کو احساس ہوا کہ مرد کے نقوش اس کے چہرے سے ملتے جلتے ہیں اس کے قدم کارنس کی جانب اٹھ گئے تب اس نے وہ حیرت انگیز منظر دیکھا سو فیصدی سو فیصدی اس کی اپنی ہی تصویر تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بہت حسین لڑکی کی تصویر جو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ شاہ زیب نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا یہ اسی لڑکی کی تصویر ہے جو اس وقت اسٹیشن پر بے ہوش ہو کر گری ہوئی تھی اس کے منہ سے آواز نکلی "نشاط" اور پھر اس نے وہ تصویر دیکھی جو اس کی اپنی تھی اور دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خانہ سا کھل گیا تیسرا ہم شکل۔ واہ کس رفتار سے یہ سارے ہم شکل مل رہے ہیں واہ دادی اماں واہ کیا چکر چلایا تم نے اس سے پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ بقول تمہارے دنیا میں ہر شخص کے سات ہم شکل ہوتے ہیں میں نے کبھی سوچا نہ تھا وہ حیرانی سے اس تصویر کو دیکھنے لگا ذرا بھی فرق نہیں تھا اسے دلا دریا د آ گیا دلا در بھی اس تصویر کو دیکھتا تو دنگ رہ جاتا اچانک ہی شاہ زیب کے منہ سے ہلکا سا قہقہہ نکل گیا۔

☆......☆......☆

"واہ اللہ تعالیٰ واقعی تم نے ہر انسان کے سات ہم شکل بنائے ہیں اب ہم ہو گئے تین باقی چار کہاں ہیں۔" پھر اسے ایک دم خیال آیا کہ اسے غسل کرنا چاہیے ویسے اس نے دل میں اور بھی باتیں سوچی تھیں۔
غسل خانہ غضب کا تھا۔ بہت وسیع اور بہت ہی شاندار انگلش فٹنگ تھی ساری کی ساری شاہ زیب خود بھی کسی گھٹیا فیملی کا بندہ نہیں تھا۔ اس کے گھر بھی اسی طرح کی تمام چیزیں موجود تھیں اور وہ ان کا استعمال کرنا جانتا تھا اس نے خوب عمدگی کے ساتھ غسل کیا دلچسپ بات یہ تھی کہ واش روم میں شیو کا سامان بھی موجود تھا انتہائی جدید قسم کا ویسے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ عالی نامی جو شخص ہے اس کا ہم شکل ہے اس کی گھر میں بڑی عزت ہے اور اس سے محبت بھی کی جاتی رہی ہے۔ شیو کا سامان خراب نہیں ہو سکتا تھا پتا نہیں عالی کو اس لوگوں سے جدا ہوئے کتنا وقت گزرا ہے اور وہ ہے کہاں۔
خیر اب جو کچھ بھی ہے میں ان لوگوں پر انکشاف کروں گا، آرام سے ذرا سا دم تو لے لوں اور اس نے یہی مناسب سمجھا اور آخری فیصلہ یہی کر لیا کہ فوری طور پر ان لوگوں کو یہ نہیں بتائے گا کہ وہ عالی نہیں ہے اب ذرا خاموشی اختیار کرنی پڑے گی لیکن تمام ادب و آداب کے ساتھ تاکہ کسی کے ضمیر پر کوئی داغ نہ آئے
غسل خانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا اور اس کا دل ڈول کر رہ

گیا۔ بہت عرصے کے بعد اسے اپنی شکل نظر آئی تھی۔ گھر میں سب سے زیادہ خوش شکل تھا دادی اماں تو روزانہ صبح اٹھ کر اس کی نظر اتارا کرتی تھیں اس وقت پھر وہی دلکشی اس کے چہرے پر آ گئی تھی بہت عرصے تک مشکلوں میں ڈوبا رہا کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں لیکن اب پھر ویسے کا ویسا ہی نظر آ رہا تھا۔ گھر کے لوگ یاد آتے تو دل میں تھوڑی سی اداسی سی طاری ہوئی لیکن اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا کمرے کے دروازے سے باہر نکلا تو کئی افراد کو کھڑے ہوئے پایا غالباً اسی کے لیے آ کے کھڑے ہوئے تھے یا شاید یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں نکلنے کے بعد غائب نہ ہو جائے قصہ کیا تھا؟ اسے ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا جہاں ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی اس ٹیبل پر بزرگ اور گھر کے دوسرے افراد موجود تھے غالباً کھانے پینے کا سامان لگایا گیا تھا۔ اسے بیٹھنے کی پیشکش کی گئی اور اس کے بعد کھانا پینا شروع ہو گیا۔ سارے کے سارے اس کی جانب متوجہ تھے لیکن وہ لڑکی نہیں تھی جو بے ہوش ہوئی تھی اور جسے نشاط کہا گیا تھا شاہ زیب اب اس قدر بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ کہ وہ لڑکی کے بارے میں سوالات کرتا، خاموشی سے کھانے پینے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اور ان کی غلط فہمی درست تھی کیوں کہ جو تصویر اس نے کارنس پر دیکھی تھی اسے دیکھنے کے بعد صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ بے چارے اس غلط فہمی کا شکار کیوں ہیں۔

کھانا ختم ہوا تو عمر رسیدہ عورت نے کہا۔

''آرام کرو بیٹے، کتنے تھک گئے ہو گے تم! میں تم سے بعد میں بات کروں گی'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ جس الجھن کا شکار تھا وہ اسے خاصی مشکل میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ اتنا تو اندازہ اسے ہو چکا تھا چونکہ وہ اس شخص کا ہم شکل ہے جس کا نام عالی ہے اس لیے ان سب کو غلط فہمی ہو رہی ہے لیکن تھی مزے کی بات۔

خیر وہ دوبارہ اس کمرے میں پہنچ گیا جو اس کی خوابگاہ کے طور پر تھا اور سوچنے لگا اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کو اس غلط فہمی سے کیسے نجات دلائی جائے کہ وہ عالی نہیں ہے۔ اپنے بارے میں انھیں کیا بتائے انھی تمام سوچوں میں ڈوبا رہا تصارات ہو گئی تھی اچھی حیثیت والے لوگ معلوم ہوتے ہیں ابھی اسے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کون ہیں؟ اور عالی کا کیا قصہ ہے۔

تقریباً نو ساڑھے نو بجے ہوں گے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر کسی نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اس روشنی میں اس نے دیکھا یہ وہی عورت تھی جو اسے دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کا نام نشاط بتایا گیا تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی شاہ زیب نے ایک لمحہ محسوس کیا۔ کہ وہ خاصی کمزور ہے اس کا رنگ زرد پڑا ہوا تھا آنکھوں کے گرد حلقے تھے لیکن اس کے باوجود وہ بے حد پرکشش تھی۔

☆......☆......☆

شاہ زیب جلدی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ نشاط نامی لڑکی آگے بڑھی اور اس نے بڑے دلدوز انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''خدا کے لیے مجھے کچھ لمحے دے دیں۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے بات کرنے دیں اس کے بعد میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گی کوئی رعایت نہیں مانگوں گی آپ سے۔ خدا کے لیے...... خدا کے لیے۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑے دو قدم آگے بڑھی تو لڑکھڑا کر گرنے لگی اب یہ مجبوری تھی کہ شاہ زیب اسے گرنے سے روکے وہ پھرتی سے لپکا اور اسے گرنے سے بچایا۔

''آپ...... آیئے برائے کرم بیٹھ جایئے...... برائے کرم بیٹھ جایئے۔''

لڑکی نے حیرانی سے اسے دیکھا جیسے شاہ زیب کے رویے پر اسے حیرت ہوئی ہو۔ پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایک بار...... بس ایک بار مجھ سے بات کر لیجیے اور خدا کے لیے صرف ایک بار غور کر لیجیے۔ میں سچ بول رہی

ہوں یا جھوٹ۔"

"آپ اطمینان سے بیٹھیے میں آپ کی بات سنوں گا۔" شاہ زیب نے کہا اور لڑکی مسہری پر بیٹھ کر اسے عجیب سی درد بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی شاہ زیب نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں نشاط صاحبہ لیکن اس سے پہلے آپ مجھے بتایئے کہ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

دیکھیں عالی! میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں ناصر میرے بچپن کا ساتھی تھا میری ایک ہی پھوپھی تھیں جن کا وہ بیٹا تھا بے شک ہم دونوں ایک دوسرے سے متاثر تھے لیکن میں آپ کو قسم کھا کر بتاتی ہوں میرے دل میں صرف اس کے لیے ایک بھائی کا پیار تھا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گی۔ پھوپھی نے رشتہ دیا تو آپ یقین کریں میرے بجائے میرے والدین نے ان سے کہا نشاط ناصر کو بھائی کی طرح سے چاہتی ہے اس کے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے بے شک یہ رشتہ جائز ہے لیکن ہم ایک المیہ پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ جو لڑکی ناصر کو اپنا بھائی سمجھتی ہے وہ اسے اپنا شوہر کیسے مان لے گی پھوپھی اور پھوپھا صاحب نے بہت کوشش کی مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے بھی وہی الفاظ کہے جو میرے گھر والوں نے کہے تھے۔ ناصر بہت شریف تھا مجھے چاہتا تھا اس نے ایک بار مجھ سے کہا نشاط ہماری چاہتیں اپنی جگہ ہمارے جذبات اپنی جگہ لیکن اگر میرے لیے کوئی گنجائش ہے تو مجھے بتا دو کیوں کہ بچپن کا یہ رشتہ مضبوط بنیادوں پر بھی استوار ہو سکتا ہے بس تمہاری منظوری کی ضرورت ہے یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کہ جو خون سگا نہیں ہے یعنی جس سے شادی ہو سکتی ہے اسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے کہ اس کے دل میں بھائی کا مقام ہے۔ ہم بہت اچھی زندگی گزاریں گے تو میں نے اس سے کہا ناصر تم یقین کرلو میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں میرے دل میں تمہارے لیے پیار ہے وہ پیار جو بچپن سے ہمارے ذہنوں میں پل رہا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ناصر تم سے شادی کے بارے میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا۔ میں نے تمہیں دیکھا اور محسوس کیا تو ایک بھائی ہی نظر آئے۔ وہ خاموش ہو گیا اس کے بعد وہ ملک سے باہر چلا گیا پھر اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھا آپ سے میرے بارے میں جو کچھ کہا گیا عالی اس میں اس حد تک تو سچائی ضرور تھی کہ ناصر اور میں ہمیشہ ساتھ رہے ہم نے تعلیم بھی ایک ساتھ حاصل کی لیکن کم از کم میرے دل میں ناصر کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ آپ کو جن لوگوں نے یہ بات بتائی ان لوگوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ ہمارے گھر سے پرانی رقابت رکھتے ہیں وہ ہمیشہ ان کوششوں میں مصروف رہے کہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیں نقصان پہنچ جائے ہمارے عزیز ہی ہیں وہ لیکن انہوں نے جو کچھ کہا ہے بس خدا انہیں اسکا اجر دے اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ عالی آپ میری وجہ سے یہ گھر چھوڑ کر چلے گئے آپ کو نہیں معلوم کہ گھر والوں پر کیا گزر رہی ہے۔ لیکن اتنے اچھے لوگ ہیں کسی نے مجھے مورد الزام نہیں ٹھہرایا عالی خدا کے لیے یہ سوچیے کہ میں آپ کی بیوی ہوں مجھے اسطرح دوسروں کے رحم و کرم پہ نہ چھوڑیے میں جس طرح بھی آپ کہیں گے زندگی گزار لوں گی اگر آپ مجھے ناپسند کرتے ہیں تو کچھیے بس میرا نام اپنی بیوی کی حیثیت سے رہنے دیجیے اگر آپ زندگی میں دوسری شادی کرنا چاہیں تو آپ یقین کریں کہ آپ کی سب سے بڑی ساتھی میں ہوں گی میں کبھی آپ کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنوں گی۔"

☆......☆......☆

میں خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا اور ششدر تھا کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں لیکن بہر حال کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ ساری صورتحال مجھے سمجھ آ گئی تھی یہ ایک ایسے شخص کی بیوی تھی جسے یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کسی لڑکے سے محبت کرتی تھی یا ہے اور اس کی شادی عالی کے ساتھ ہو گئی۔ تب عالی اس بات پر دل برداشتہ ہو گیا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں اسے اس سلسلے میں کیا بتاؤں شاہ زیب بڑی الجھن کا شکار ہو گیا تھا بہت دیر تک وہ سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

ایک بات بتایئے نشاط، کیا آپ کو میری آواز میں کوئی تبدیلی نہیں محسوس ہو رہی میرا مطلب ہے میری آواز بالکل پہلے جیسی ہے۔"

''آواز؟'' نشاط نے تعجب سے کہا۔
''ہاں!''
''میں بالکل نہیں سمجھی۔''
''اور میرا رنگ روپ، میرے نقوش، میری جسامت، میرے چلنے پھرنے کا انداز، میرے کھانے پینے کی چیزیں اور یہ دیکھیے میرے ہاتھ پاؤں کیا کوئی ایسی انوکھی بات نظر نہیں آ رہی آپ کو اس میں جو آپ کو حیران کرے۔'' نشاط کے چہرے پر عجیب تاثرات پھیل گئے وہ مجھے دیکھتی رہی پھر ایک گہرا سانس لے کر بولی۔
''پتا نہیں...... مجھے کچھ نہیں پتا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، کیا کہہ رہے ہیں آپ'' نشاط...... معاف کیجیے نشاط صاحبہ آپ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوگی کہ میں عالی نہیں ہوں، عالی کا ہمشکل ہوں لیکن عالی نہیں ہوں دیکھیے بہت باعزت لوگ ہیں آپ بہت اچھا گھرانہ ہے یہ۔ ابھی میں یہاں کے کرداروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جتنے لوگ مجھے نظر آئے ہیں سب قابل احترام اور اچھے معلوم ہوتے ہیں نشاط صاحبہ! اگر میری وجہ سے کسی کو ذہنی تکلیف پہنچی ہو تو یقین کیجیے میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں میں عالی نہیں ہوں بلکہ عالی کا ہمشکل ہوں۔''

☆......☆......☆

نشاط مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اور سسک پڑی وہ رونے لگی اور میں خاموشی سے بیٹھا سے دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔
''آپ...... آپ اس بارے میں میری کیا مدد کر سکتی ہیں؟''
''عالی...... آپ عالی ہی ہیں...... آپ عالین ہی ہیں، گھر سے باہر رہے ہیں پتا نہیں کن حالات میں گزارہ کیا ہے آپ کی آواز اور بولنے کے انداز میں تھوڑا سا فرق ہے لیکن...... عالی میں جانتی ہوں کہ آپ نے...... آپ نے یہ انداز خاص طور سے اختیار کیا ہے اور آپ جان بوجھ کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آپ عالی نہیں ہیں۔''
شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی اور بولا
''خدا آپ کو عقل دے اچھا اب یہ بتایئے یہ ہمارا مشترکہ بیڈ روم ہے''
نہیں معاف کریں گے آپ مجھے۔
''پلیز مجھے بتایئے یہ ہمارا مشترکہ بیڈ روم ہے؟''۔
''تو اور کیا......''
''تو میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بیڈ روم میں پلیز آگے آپ خود سمجھ دار ہیں میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے میں باہر سو جاؤں گی میں کہیں بھی چلی جاؤں گی لیکن بس آپ یہیں رہیں آپ کی عنایت ہوگی آپ کی شکر گزار ہوں گی آپ جیسا بھی حکم دیں گے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی ساری زندگی میں آپ سے دور رہوں گی مجھے اگر چاہیں تو اسی کمرے میں رہنے دیں اور...... اور...... اور'' وہ ایک دم چپ ہوگئی مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔
''میں کبھی آپ سے کچھ طلب نہیں کروں گی کوئی چیز نہیں مانگوں گی میں یہاں صوفے پر سو جاؤں گی لیکن بس میرا مان رہنے دیجیے۔ آپ کو پتا نہیں میرے گھر والے کتنے دکھی ہیں میری امی بھی بیمار رہتی ہیں میری بھی حالت دیکھ لیجیے۔ ابو خلاؤں میں گھورتے رہتے ہیں بیٹا والدین کبھی اپنی اولاد کی تقدیر نہیں بگاڑتے۔ ہم بہت سی ایسی مشکلوں کا شکار ہو جاتے ہیں جن میں ہماری اپنی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا جنھوں نے ہمارے درمیان یہ آگ لگائی ہے ان کے لیے بھی ہم یہی کہیں گے خدا انھیں عقل دے اور انھیں ان کے کیے کی سزا نہ دے یہ کہتے رہتے ہیں ابو۔ عالی مان جایئے پلیز مان جایئے۔''
''اچھا تو آپ کام کریں وہ لڑکی جو نائلہ ہے وہ میری بہن ہے نا میں نے سوال کیا تو نشاط مجھے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

''خیر میں آگے بات کرتا ہوں آپ ایسا کریئے جایئے اس کے پاس سو جایئے اور تھوڑا سا موقعہ دیجیئے کہ میں ان لوگوں کے ذہن صاف کرلوں۔ دیکھیں نشاط ایک رات بھی آپ میرے کمرے میں سوئیں چاہے چاہے صوفے پر سو جائیں چاہے کہیں زمین پر لیکن لوگ تسلیم نہیں کریں گے وہ یہی سمجھیں گے کہ میں نے آپ کو اپنی بیوی سمجھ لیا ہے اور جب آپ کو اس بات کا علم ہوگا کہ میں عالی نہیں ہوں تو مجھے بتایئے آپ عالی کو کیا جواب دیں گی بتایئے مجھے...... نشاط آپ بتایئے مجھے۔'' وہ مجھے دیکھنے لگی پھر آہستہ سے بولی۔

''ٹھیک ہے میں جارہی ہوں لیکن عالی گنجائش رکھیئے کہ آپ مجھے معاف کرسکیں میں ابھی بھی یہی کہوں گی ناصر میرے لیے سگے بھائیوں جیسا تھا ساری زندگی یہی کہتی رہوں گی آپ مانیں یا نہ مانیں۔''

''میں مان لوں گا...... مان لوں گا آپ جایئے۔''

نشاط دکھ بھرے انداز میں مسہری سے اٹھی اور دروازے کی طرف جانے لگی پھر اس نے دروازہ کھولا لیکن ایک دم ٹھٹک کر رہ گئی کیوں کہ تھوڑے فاصلے پر وہ بزرگ جو یقیناً اس گھر کے سربراہ تھے اور وہ بیگم صاحبہ جو لازمی طور پر عالی کی والدہ تھیں کھڑے ہوئے تھے نشاط کو دیکھ کر انھوں نے گردن ہلائی اور دونوں اندر آگئے عورت نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''عالی میں کون ہوں تمہاری۔''

''آپ میرے لیے انتہائی قابل احترام ہیں آپ کو ماں کا درجہ دیتا ہوں۔''

''اور میں ماں نہیں ہوں تمہاری۔''

''آپ تھوڑا سا مجھے وقت دیجیئے میں پہلے بھی یہ بات کہنا چاہتا تھا لیکن آپ نے یہ بات نہیں سنی۔ براہ کرم میری بات سن لیجیئے گا۔''

''بہت زیادہ اداکاری کررہے ہو بیٹا، والدین روز اول سے اولاد کو پالتے ہیں اس کی ایک ایک جنبش ایک ایک حرکت ایک ایک بات سے واقف ہوتے ہیں بعد میں وہ اولاد اگر یہ کہنا شروع کردے۔ کہ وہ ہماری اولاد نہیں ہے تو والدین خاموش تو ہوسکتے ہیں کسی مجبوری کی بناء پر یقین نہیں کرسکتے اولاد جو کچھ کہہ رہی ہے وہ ٹھیک ہے۔''

''آپ پلیز بیٹھ جایئے نشاط آپ بھی آجایئے...... پلیز آجایئے شاہ زیب نے کہا اور تینوں بیٹھ گئے۔''

''میں نے ابھی ابھی نشاط کو بتایا ہے کہ میں عالی نہیں ہوں بلکہ صرف ان کا ہمشکل ہوں میرا تعلق بھی ایک باعزت اور معزز گھرانے سے ہے اللہ کے فضل کرم سے گھر میں بھابیاں بھی ہیں بہنیں بھی ہیں میری دادی اماں بھی ہیں میری والدہ بھی ہیں اور والد بھی ہیں اور سب باعزت ہیں میں ایک عزت دار گھرانے کی حرمت کو داغ دار نہیں کرسکتا میرا ضمیر مجھے اتنے کچوکے دے گا کہ میں کوڑی ہو کر مرجاؤں گا وحدہ لاشریک کی قسم میں عالی نہیں ہوں میرا نام شاہ زیب ہے۔ بس اتنی سی خرابی ہے کہ میں عالی صاحب کا ہمشکل ہوں نشاط صاحبہ میرے کمرے میں آئیں تھیں سونے کے لیے وہ میرے لیے انتہائی محترم ہستی ہیں ایک دن اگر وہ میرے کمرے میں سو جائیں اور بعد میں پتا چلے کہ میں عالی نہیں ہوں تو بتایئے ان کی کیا حیثیت رہتی یہ بہت بڑا المیہ ہوتا میں نے ان سے یہی کہا کہ وہ جائیں اور نائلہ کے کمرے میں سو جائیں تا کہ وہ گواہ رہے کہ...... کہ......'' شاہ زیب خاموش ہوگیا بزرگ اور عورت اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پھر عورت نے کہا۔

''میں جانتی ہوں، تو بہت بڑا مسخرہ ہے۔ کالج میں بھی اداکاری کیا کرتا تھا اور طرح طرح کے ناٹک بھرتا تھا یاد ہے ایک دفعہ تو گھر آگیا تھا ایک گیٹ اپ کرکے اور نہ جانے کتنی دیر تک ہم لوگوں کو بے وقوف بناتا رہا تھا تو آواز بھی بدل لیتا ہے چہرے کے تاثرات بھی بدل لیتا ہے عالی یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا مگر اب تو بہت سنجیدہ ہوگیا ہے شادی شدہ ہے کل کو بال بچوں والا بن جائے گا بیٹا اب ایسا نہیں کرتے دیکھ ہمیں سب کچھ بتادے نشاط کو لے

کے تو کس غلط فہمی کا شکار ہے اس بچے کو بھی نشاط کی والدہ نے بلایا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ بہت جلد پاکستان آجائے گا اور تصدیق کرے گا کہ نشاط ہمیشہ اس کے لیے محترم رہی ہے وہ دونوں ایک دوسرے سے مانوس بے شک تھے لیکن ان کے درمیان کبھی کوئی گندگی جنم نہیں لے سکی۔ بیٹا ذرا سی غلط فہمی سے اس طرح کے کام نہیں ہونے چاہیں کیا حال ہو گیا ہے اس کا تم دیکھ رہے ہو۔ سارا چہرہ جو گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا کیسی کیفیت کا شکار ہو گیا ہے معاف کر دے اسے معاف کر دے وہ بے گناہ ہے بالکل بے گناہ ہے۔''

☆......☆......☆

''آہ کاش اکوئی ایسی بات ہوتی کہ میں آپ کو یقین دلا سکتا لیکن اتنا کام آپ ضرور کیجیے محترمہ کہ نشاط کو میرے کمرے میں نہ سلایئے آپ اسے اپنی سرپرستی میں لے لیجیے۔ خداوند عالم ہمیشہ بہتر کرتا ہے میرے جذبے نیک ہیں میں نشاط کے نام کو داغدار نہیں کرنا چاہتا اللہ تعالیٰ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گا لیکن آپ ایسا نہ کیجیے نشاط آپ بہت اچھی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیاں عطا فرمائے بس یوں سمجھ لیجیے کہ میں عالی نہیں ہوں'' شاہ زیب نے کہا اور وہ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہے پھر بزرگ خاتون بولیں۔

''دیکھو عالی ہم وقت کا انتظار کر لیں گے لیکن بیٹا میری ایک بات مان لو گے۔''

''جی جی آپ حکم دیں۔''

''جانا نہیں یہاں سے...... جانا نہیں تمہیں میرے دودھ کی قسم حالانکہ یہ جذباتی سا جملہ ہے لیکن پھر بھی میں کہے بغیر رہ نہیں سکتی تمہیں میرے دودھ کی قسم یہاں سے جانا نہیں جب تک ساری باتیں صاف نہ ہو جائیں۔''

شاہ زیب تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے کہا

''ٹھیک ہے میں جب یہاں سے جاؤں گا تو آپ لوگوں سے اجازت لے کر ہی جاؤں گا بس ایک اس بات کا خیال رکھیں کہ نشاط میرے لیے ایک متبرک حیثیت رکھتی ہیں میں اس غلط فہمی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔ اور خدا کے لیے نشاط آپ مجھ سے دور رہا کریں میرے قریب نہ آئیں میں بتائے دیتا ہوں۔''

نشاط ایک دم سے بلک بلک کر رو پڑی تھی بزرگ عورت اور بزرگ مرد اسے سہارا دے رہے تھے۔ شاہ زیب جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے وہ لوگ اب بھی یہی سمجھ رہے تھے شاہ زیب اداکاری کر رہا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے گئے اور شاہ زیب دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کیا عجیب اور دلچسپ سچویشن تھی ایسے واقعات فلمی کہانیوں میں تو مل جاتے ہیں حقیقی زندگی میں ذرا ایسا کم ہوتا ہے لیکن سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ فلمی کہانیاں بھی تو حقیقی زندگی سے متاثر ہو کر لکھی جاتی ہیں۔ اس میں کون سی اجنبی بات ہے لیکن بڑے دلچسپ معاملات، تیسرا ہمشکل...... تیسرا ہمشکل۔ شاہ زیب نے سوچا اور اس کے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔ واہ دادی اماں واہ! کیا کہانی سجا دی ہے آپ نے میری کھوپڑی میں۔ لیکن بات آپ کی بھی غلط نہیں ہے دو تو مل گئے ہیں باقی کہاں ہیں تلاش کیے بغیر واپس نہیں آؤں گا یہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے اور اس کی تلاش کے لیے میرے پاس کتنا وقت ہے وہ آپ بھی جانتی ہیں۔

دفعتاً وہ اچھل پڑا ایک اور احساس اس کے دل میں جاگا تھا۔ گھر میں تھا تو کبھی کبھی اسے چکر آتے تھے گر جاتا تھا حالت بگڑ جاتی تھی لیکن اب جب گھر سے باہر نکلا تھا جیسے یہ مصیبتیں اس کے لیے ٹانک کا کام کر رہی ہوں۔ بالکل صحیح کنڈیشن تھی پچھلے دنوں دلاور کے ساتھ کیسی کیسی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا بھوک، پیاس اور عجیب د غریب صورت حال لیکن بہتر تھا کوئی ایسا مسئلہ پیش نہیں آیا تھا اس بار تو اس کے دل کو خوشی کا احساس ہوا ڈاکٹر سلیمان نے جو پیش گوئی کی تھی وہ ایک طرح سے پوری ہو رہی تھی خدا کرے ایسا نہ ہو زندگی کو آخر موت سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے لیکن اگر ڈاکٹر سلیمان کی شکست ہوئی تو پھر مزہ ہی آجائے گا یہ سوچتا رہا پھر دلاور آیا اس کے منہ سے آواز نکلی۔

☆......☆......☆

کہاں چلے گئے یار بھائی دلاور...... کہاں چلے گئے یار ہو بہت اچھے آدمی تم پتا نہیں دوبارہ ملو گے یا نہیں؟ ظاہر ہے تمہاری منزل الگ ہے میری الگ تمہاری زندگی کا مشن اور ہے میرا اور ہے خدا کرے تم اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤ، تمہاری ماں اور بہنیں تمہیں مل جائیں اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لیے اور کوئی نہیں ہوگی۔'' پھر ان بزرگ خاتون کا خیال آیا وہ اسے اپنا بیٹا سمجھ رہی تھیں، اور دودھ کی قسم دے کر گئی تھیں اس نے دل میں سوچا کہ اماں جی کچھ عرصے تو واقعی میں یہاں سکون سے رہوں گا لیکن جانا تو مجھے ہوگا اور وہ جو وعدہ آپ سے کیا ہے وہ پورا بھی کروں گا کیوں کہ وہی میرے ظرف کی شناخت ہوگی۔ چلو ٹھیک ہے بیٹا ایک اچھا گھرانہ ملا ہے خوب بھر کے کھانے پینے کو ملے گا تھوڑا وقت آرام کر لے اس کے بعد نجانے تیری تقدیر میں کیا کیا دھکے لکھے ہوئے ہیں؟ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دلاور کی پولیس کو تلاش تھی اور میں دلاور کا ہمشکل تھا جبکہ میں دلاور کی طرح ذہین اور ہوشیار نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بچانا جانتا تھا اور مجھ میں اس طرح کی کوئی مشق نہیں تھی خیر زندگی جذبات کا نام ہے میرے ذہن میں وہ آخری پوائنٹ تھا کہ ہاتھوں کی لکیروں سے پتا چل سکتا ہے کہ بندہ وہ ہے یا نہیں جو اسے سمجھا جا رہا ہے۔ اب میں بھی اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا کہ اپنے آپ کو دلاور تسلیم کر لوں گا انھی سوچوں میں خاصا وقت گزر گیا وہ لوگ میری ہدایت کے مطابق نشاط کو مجھ سے دور رکھ رہے تھے لیکن مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا وہ مجھے عالی ہی سمجھ رہے ہیں اور یہ سوچ رہے ہیں میں نشاط سے برگشتہ ہوں مجھے تقریباً کہانی معلوم ہو گئی تھی بیچاری نشاط غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی کاش وہ گدھے کا بچہ مجھے مل جائے جس کا نام عالی ہے میں اسے بتاؤں کہ ایک اچھی خاصی شریف بیوی کو غلط فہمیوں کا شکار ہو کر کیوں تکلیف دے رہا ہے یہ ساری باتیں چل رہی تھیں۔

☆......☆......☆

دوسرا دن بھی گزر گیا تیسرے دن کچھ اور کہانیاں علم میں آئیں اس دوران نشاط میرے سامنے ہی نہیں آئی تھی مجھے اس خوب صورت اور نفیس شخصیت کے لیے دل میں دکھن کا احساس بھی ہوتا تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اسے ایک بار پھر بلا کر سمجھاؤں کہ نشاط دیکھو تم انتہائی خوب صورت ہو یہ الگ بات ہے کہ میں فطرتاً برا نہیں ہوں میری جگہ کوئی بھی شخص ہوتا تو اس موقع سے جو فائدہ اٹھاتا اس کے لیے تم تمام زندگی روتی رہتیں وہ تو خوش نصیبی ہے تمہاری کہ میں برا آدمی نہیں ہوں اور نا ہی میرا خون خراب ہے تیسرے دن جو دلچسپ بات ہوئی وہ یہ تھی میں نے ایک خوب صورت گاڑی میں سے کچھ مہمانوں کو اترتے دیکھا ایک بزرگ جوڑا تھا دو لڑکیاں تھیں ایک نوجوان تھا یہ پانچ افراد مہمان کے طور پر آئے تھے ان کا استقبال بہت اچھے انداز میں کیا گیا اور وہ اندر آ گئے مجھے کچھ خاص تشویش نہیں تھی لیکن نائلہ جو عالی کی بہن تھی اب میری بہن تھی منہ بنائے ہوئے میرے پاس آ گئی۔

''بھیا جی ایک درخواست کروں آپ سے۔''

''آپ نائلہ ہیں نا۔'' میں نے کہا۔

''دیکھو تمہیں معلوم ہے میں پورے خاندان میں انتہائی بدتمیز لڑکی مشہور ہوں لاکھ کوشش کروں لیکن میری زبان نہیں رکتی تم بہت اچھے اداکار تھے یہ بات مجھے معلوم ہے لیکن جن لوگوں کے ساتھ تم اداکاری کر رہے ہو وہ تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں میں کوئی بات بری نہیں کہوں گی عالی بھیا خدا کے لیے ایسا نہ کرو انسان انسان ہوتا ہے زندگی بہت مختصر چیز ہے نہ خود کسی کے ہاتھوں دکھ اٹھاؤ نہ خود کسی کو دکھ دو اس کا جواب خدا کو دینا ہوتا ہے۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا

''نائلہ کہوں یا آپ کو ملانی کہوں۔''

''جو دل میں آئے کہہ دیں میں اس وقت آپ کو بتانے آئی ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے انکل کمزور دل کے آدمی ہیں دل کے مریض رہ چکے ہیں اور اب بھی کبھی کبھی ان کی حالت خراب ہو جاتی ہے خدا کے لیے ان کے دل کو کوئی ایسا صدمہ نہ پہنچانا کہ ان کی زندگی اور مختصر ہو جائے۔''

''اچھا ایک بات سنو یہ انکل کون ہیں'' شاہ زیب نے کہا اور نائلہ خونی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔
''نہیں باز آنا......نا۔''
''نائلہ ایک کام کرو جو میں تمہیں بتاؤں وہ کرتی رہو بعد میں جو کہوگی وہ میں کروں گا۔''
''کیا مطلب؟''
''مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ کہ یہ کون ہیں؟''
''آپ کے ساس سسر ہیں دو عدد سالیاں ہیں ایک سدو سالہ ہے اور میرے لائق کوئی خدمت۔''
''نہیں۔مگر یہ کیوں آئے ہیں؟''
''آپ کو چاند پر لے جانے کے لیے غالباً انھوں نے چاند کے سفر کا انتظام کرلیا ہے۔'' نائلہ نے جلے بھنے لہجہ میں کہا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

شاہ زیب کو زور کی ہنسی آ گئی تھی آئیڈیا تو اچھا ہے چلو نائلہ بی بی چاند کا بھی ایک چکر لگا آئیں اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا بہت ہی عمدہ قسم کا سوٹ پہنا ہوا تھا اس نے آخر سسرال والے آئے تھے ان کے سامنے جانا تھا اور یہی ہوا دوپہر کے کھانے پر اس کا بلاوا آ گیا وہ تیار ہوکر چل پڑا اس وقت بے شک گھریلو لباس میں تھا لیکن انتہائی خوب صورت لگ رہا تھا ویسے بھی بہت ہی خوب صورت نوجوان تھا۔

جب وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ بہت سی نگاہیں اسے دیکھتی ہی رہ گئی ہیں خاص طور پر وہ دونوں لڑکیاں جس کے بارے میں اسے پتا چل چکا تھا نشاط کی بہنیں ہیں ان کے نقش و نگار بھی نشاط سے کافی حد تک ملتے جلتے تھے وہ سب اسے دیکھتی رہیں ان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے پسندیدگی اور پھر ناراضگی کے آثار ابھرے معمر شخص نے جو نشاط کے والد تھے اور جن کا نام بعد میں معلوم ہوا کہ کمال احمد تھا کھڑے ہوکر اس کا استقبال کیا آگے بڑھے اور اس سے ہاتھ ملایا۔

''کیسے ہو عالی؟''
اس نے گردن اٹھا کر انھیں دیکھا اور پھر گردن خم کرکے بولا۔
''ٹھیک ہوں آپ کی دعائیں ہیں۔''
''بیٹھو!'' شاہ زیب کرسی پر بیٹھ گیا تو جمال احمد شیخ صاحب نے سب سے کھانے کی درخواست کی اور خاموشی سے کھانا شروع ہوگیا نشاط بھی موجود تھی اور اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی دونوں لڑکیاں جو نشاط کی بہنیں تھیں کتنی ہی بار عجیب نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ چکی تھیں انھوں نے کانوں میں کچھ کھسر پھسر بھی کی تھی۔

بہرحال کھانا ختم ہوگیا تو جمال احمد شیخ نے کہا۔
''عالی کمال صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''
جی میں حاضر ہوں!'' شاہ زیب بولا۔
''تو پھر دوسرے کمرے میں چلے جاؤ ہم لوگ تمہارے درمیان مداخلت نہیں کریں گے۔''
''آپ پسند فرمائیں تو آ جائیے گا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' کمال احمد صاحب نے کہا۔
''نہیں بھائی تم لوگ کھل کر بات کرو۔'' غرض یہ کہ شاہ زیب کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا یہ کوٹھی بہت ہی شاندار تھی لیکن شاہ زیب کی کوٹھی بھی کسی سے کم نہیں تھی نشست کا یہ کمرہ بہت خوب صورت فرنیچر سے آراستہ تھا دونوں لڑکیاں اور نوجوان بھی ساتھ آئے تھے شاہ زیب نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ نیا کھیل جو شروع ہوا ہے اس سے لطف اندوز ہوا جائے...... حالانکہ صورت حال بری تھی لیکن اس کا اپنا ضمیر صاف تھا اس نے جو رویہ اور جو طریقہ اپنایا تھا وہ ایک شریف نوجوان کا رویہ ہونا چاہیے تھا۔

(اس سنسنی خیز سلسلے کی تیسری کڑی ماہ جنوری میں ملاحظہ کیجیے)

آئیڈیل



علی رضا عمرانی



آئیڈیل کی تلاش میں سرگرداں نوجوان کی کتھا

امتیاز علی جس قدر رحم دل اور خدا ترس انسان تھے اِن کی بیگم اسی قدر بد دماغ، بدخو اور مغرور تھیں اور مسعود پر بھی انہیں کا پرچھاواں پڑا تھا۔ مسعود امتیاز علی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ قدرت نے امتیاز علی کو دولت دینے میں جس قدر فیاضی کی تھی، اولاد کے معاملے میں اسی قدر بخل سے کام لیا تھا۔

مسعود اس وقت پیدا ہوا تھا جب امتیاز علی اولاد کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے، بہر حال بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں بہتوں کی جھولیاں بھر گئیں اور مسعود مسرتوں کی گود میں پروان چڑھنے لگا۔ وہ ماں باپ کی فطرت سے متاثر تھا اور یہی فطرت اس میں رچ بس گئی جوں جوں عمر بڑھتی گئی اس کے غرور و تمکنت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ دنیا کے ہر انسان کو اپنے سامنے ہیچ سمجھتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دنیا کی ہر خوشی اس کے لیے ہے، عزت کا مستحق صرف وہ ہے، ہر شخص اس کی اطاعت کے لیے پیدا ہوا ہے۔ کوئی اس کے حکم سے انحراف کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اگرچہ وہ بدفطرت تھا لیکن ذہین بھی تھا۔ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں ہمیشہ تیز رہا، عمر کے ساتھ یہ بدفطرتی کے رنگ بھی بدلتے گئے، جوان ہوا تو بہت سے دلوں کا ارمان بن گیا، کیوں کہ حسین بھی تھا، لیکن اس نے کسی لڑکی کو منہ نہ لگایا، کوئی اس کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھی یہی صورتحال غیر ممالک میں رہی، اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گیا۔ یورپ کی تتلیوں نے اس کے گرد حلقہ بنالیا۔ لیکن انہیں شدید مایوسی ہوئی، یہ شہزادہ کسی طرح رام نہیں ہوتا تھا۔ بڑے بڑے داؤ کھیلے گئے۔ ادائیں دکھائی گئیں، لیکن ناکامی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔

امتیاز علی کو بیٹے کی فطرت کا احساس تھا۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ وہ والدین کے حکم سے بھی انحراف کرے گا۔ وہ جانتے تھے کہ ماں کی عادتوں نے اسے مغرور کر دیا ہے، لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جن لوگوں نے اسے غرور بخشا وہ انہیں بھی خاطر میں نہیں لائے گا۔ بیٹا جوان ہو چکا تھا، غیر ملک میں اس کی تعلیم بھی ختم ہونے والی تھی اور وہ واپس آنے کا پروگرام بنا رہا تھا، چنانچہ اس کی واپسی پر وہ اسے ایک حسین تحفہ دینا چاہتے تھے، ایک خوب صورت اور نیک سیرت دلہن کا تحفہ۔

چنانچہ اس سلسلے میں زبردست پیمانے پر کوشش کی گئی۔ بیگم امتیاز بھی اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں اور بالآخر نگاہ احمد علی کے گھرانے پر جا ٹکی، اعلیٰ اور دولت مند خاندان تھا۔ لیکن امتیاز علی کی طرح احمد علی نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا تھا۔

شاہ خرچی نے حالات بہتر نہ رہنے دیے، اور ان کی حیثیت ختم ہو گئی تھی اور اب وہ صرف ایک کھاتے پیتے آدمی تھے۔ امتیاز علی سے ان کے گہرے مراسم تھے اور امتیاز علی ان کی خاندانی وجاہت سے متاثر تھے۔

پھر انہیں ان کے گھر میں ایک نیک اور خوب صورت لڑکی کا علم ہوا تو امتیاز علی ریجھ گئے۔ دولت ان کی غلام تھی۔ شرافت، احمد علی کے ہاں سے آ جاتی تو اور کیا چاہیے تھا۔ اپنی تمام تر بدخوئی اور بددماغی کے باوجود بیگم امتیاز یعنی رابعہ خاتون نے رخشندہ کو بے حد پسند کیا۔ وہ حسن میں یکتا نہیں تھی لیکن قبول صورت تھی۔ اس کا اصلی حسن اس کی فطرت سے جھلکتا تھا۔ شرافت اور پاکیزگی کا پیکر، سادہ فطرت کی مالک، محبت کرنے والی اور خوش اخلاق، پورے تین ماہ تک اس کے بارے میں چھان پھٹک ہوتی رہی اور رابعہ خاتون کی کٹنیا مکمل طور پر جاسوسی کرتی رہیں، لیکن رخشندہ کی فطرت کا کوئی کمزور پہلو تلاش نہ کر سکیں، بالآخر رابعہ خاتون نے امتیاز علی کو منظوری دے دی۔

''لیکن بیگم۔ مسعود میاں کو آ جانے دو ان کی رائے بھی ضروری ہے۔ ممکن ہے ان کا اپنا کوئی آئیڈیل ہو ان سے مشورے کے بعد ہی پیغام دیا جائے تو بہتر ہے......'' امتیاز علی نے دور اندیشی سے کام لیا۔

''مسعود میرا بیٹا ہے، کیا تم مجھے اس کی ماں تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہو؟'' رابعہ خاتون نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔

''یہ بات نہیں لیکن حالات بدل گئے ہیں اور پھر مسعود بچپن ہی سے تلون مزاج ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی الجھن پیدا ہو جائے۔''

''میں کہہ رہی ہوں اور پورے اعتماد سے کہہ رہی ہوں، مسعود وہی کرے گا جو میں کہوں گی، اسے اپنی ماں پر پورا اعتماد ہے، تم بسم اللہ کہہ کر رشتہ لے جانے کی تیاریاں کرو۔'' رابعہ خاتون نے کہا اور امتیاز علی تیار ہو گئے۔

☆......☆......☆

احمد علی نے بڑی محبت سے دونوں میاں بیوی کو خوش آمدید کہا اور ان کی خواہش سن کر سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کی بیگم کی آنکھوں میں مسرت ناچنے لگی، لیکن شوہر کی سنجیدگی کی وجہ سے خود بھی خاموش تھیں۔ آخر احمد علی نے کہا۔

''تم ایک خاندانی آدمی ہونے کے علاوہ میرے دوست بھی ہو امتیاز علی اور تمہارا بچہ میرے لیے اولاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری عظمت متاثر ہو۔ میری دعا ہے کہ تمہارے رتبے اور وقار میں چار چاند لگیں اور تمہارا بیٹا تمہارا نام بلند کرے، میرا خیال ہے امتیاز علی کہ موجودہ حالات کے تحت ہم تمہارے مقابلے میں پورے نہیں اترتے۔ میں صرف خاندانی روایات نبھا رہا ہوں۔ میرے پاس اب خاندان کی بخشی ہوئی شرافت کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ میں بیٹی کے



ساتھ تمہیں وہ کچھ نہیں دے سکتا جو دینا چاہیے۔ میری خواہش تھی کہ رخشندہ کی شادی کسی ایسے شخص سے کروں جو بذات خود شرافت کے علاوہ اور کچھ نہ رکھتا ہو، لیکن تمہاری حیثیت دوسری ہے، خدا نے تمہیں سب کچھ دیا ہے۔ اگر میری بیٹی کی وجہ سے لوگ تم پر ہنسے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے جان بوجھ کر تمہیں مذاق کا نشان بنوایا ہے۔

''یہ تمہارا خلوص اور شرافت ہے احمد علی! میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ خدا نے مجھے جو کچھ دیا ہے وہ کافی ہے۔ میں طمع پرست نہیں ہوں اور تم غلط کہہ رہے ہو کہ تم کم مایا ہو۔ تمہارے پاس شرافت کا خزانہ ہے اور میں اپنے بیٹے کی خوشگوار زندگی کے لیے تمہارے اس خزانے کا ایک حصہ مانگنے آیا ہوں۔ یہ خزانہ دنیاوی خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے اگر تم نے مجھے اس میں سے میرا حصہ دینے سے انکار کر دیا تو میں تمہیں بخیل سمجھوں گا۔'' امتیاز علی نے کہا۔

''پھر سوچ لو امتیاز علی کیا، مسعود میاں صرف شرافت پر قناعت کریں گے؟''

''وہ میرا بیٹا ہے بھائی جان اور اس کے بارے میں کوئی غلط بات سوچنا میری توہین ہے۔'' رابعہ خاتون نے کہا۔

''ہم آپ کی توہین نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنی بچی کچھی پونجی کا تحفظ کر رہے ہیں، کیوں کہ اس کے علاوہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں۔''

''اس حفاظت کا بوجھ میرے کندھے پر رکھ دو احمد علی'' امتیاز علی نے کہا اور احمد علی نے اُٹھ کر امتیاز علی کو گلے سے لگا لیا۔

''میں نے اپنی عزت تمہاری گود میں ڈال دی ہے امتیاز علی اس کی حفاظت کرنا۔'' انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا اور دونوں عورتیں ایک دوسرے کے گلے مل گئیں۔

''میں چاہتی ہوں بہن کہ رخشندہ بیٹی کو انگوٹھی پہنا دوں۔ اور خاندان میں اس نسبت کا اعلان کر دوں اللہ رکھے جب مسعود واپس آ جائے تو تم یہ رسم پوری کر لینا۔'' رابعہ خاتون نے کہا۔

''آپ کی مرضی بھابھی ورنہ مسعود کو آ جانے دیتیں تو ساتھ ہی ساتھ یہ رسم ادا ہو جاتی۔''

''بہن اب مجھ سے صبر نہیں ہوگا۔ تم اجازت تو دے ہی دو۔''

''اجازت کیسی آپ کی بات سر آنکھوں پر۔''

''اور پھر پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی کہ دو اعلیٰ خاندان ایک ہو گئے۔ دونوں خاندانوں کو مبارک باد کے پیغام موصول ہونے لگے، رابعہ بیگم نے البتہ ابھی مسعود سے یہ خبر چھپانا مناسب سمجھی تا کہ جب وہ آ جائے تو اچانک اسے یہ خبر سنائی جائے اور پھر بے چینی سے مسعود کا انتظار کیا جانے لگا۔ آخر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔

☆......☆......☆

ایک صبح مسعود وطن واپس پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ پر استقبال کرنے والوں میں احمد علی اور ان کی بیگم بھی شامل تھیں تندرست توانا اور حسین چہرے والا مسعود ایک عجیب تمکنت سے نیچے اترا اور رابعہ خاتون دوڑ کر اس سے لپٹ گئیں۔

''اوہ امی، اس نے ماں کو خود سے الگ کر کے ان کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا اور پھر اپنے اعلیٰ تراش کے سوٹ پر پڑ جانے والی شکنوں کو درست کرنے لگا۔ دوسرے لوگوں سے اس نے جلدی جلدی مصافحہ کیا تا کہ کوئی اس سے گلے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ احمد علی کی زیرک نگاہیں بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ امتیاز علی کے تعارف کرانے پر اس نے ان سے بھی مصافحہ کیا اور بیگم احمد علی کے دل میں حسرت ہی رہ گئی کہ وہ اپنے ہونے والے داماد کے سر پر ہاتھ ہی پھیر دیتیں۔ پھر مسعود باہر آ کر اپنی چمچماتی کار میں آ بیٹھا۔

دوسری گاڑیاں پیچھے آ رہی تھیں احمد علی اپنی کار میں اپنی بیگم کے ساتھ تھے۔ ان کے چہرے پر غور و فکر کے آثار نظر آ رہے تھے۔ امتیاز علی کی کوٹھی میں داخل ہوتے وقت انہوں نے چہرے کو پھر خوش گوار بنا لیا۔

''آیئے امی کیسے تشریف لائیں۔۔؟'' مسعود نے رسالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اے لو اب ماں بھی بیٹے کے کمرے میں کسی مقصد سے آ سکتی ہے۔ کیا کر رہے ہو؟'' رابعہ بیگم نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں امی، بس بور ہو رہا ہوں، یہاں اعلیٰ سوسائٹی کا فقدان ہے۔ اعلیٰ کلبوں میں بھی ایسے لوگ گھس آئے ہیں جن کے پاس دولت تو ہے مقصد نہیں ہے۔ سوچتا ہوں، اس ماحول میں خود کو کیسے ضم کر سکوں گا؟''

''ضرور بیٹے، تمہارے پاس کیا کمی ہے۔ لیکن باہر جا کر بھی تو تنہائی محسوس کرے گا اور بیٹے کی مشکلات ماں ہی حل کر سکتی ہے۔ میں تجھے ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں۔''

''سب کچھ تو ہے میرے پاس۔ آپ کیا دیں گی مجھے۔'' مسعود نے کہا۔

''ایسی چیز دوں گی جو تیرے پاس نہیں ہے۔''

''تو پھر دیجیے۔ بڑا دلچسپ مضمون پڑھ رہا تھا۔'' مسعود نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا اور ماں نے لباس میں لپٹا ہوا ایک لفافہ نکالا پھر اس میں سے ایک تصویر نکالی اور مسعود کے ہاتھ میں دے دی۔

''یہ ہے میرا تحفہ؟''

''خوب۔'' مسعود نے متحیرانہ انداز میں تصویر لے کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ کیا ہے امی؟''

''پہلے یہ بتا کیسی ہے؟'' رابعہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے۔ کیا اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے میرا خیال ہے ایک عام لڑکی ہے لیکن۔''

''یہ عام لڑکی نہیں بیٹے، تیری ہونے والی دلہن ہے۔'' رابعہ بیگم نے انکشاف کیا اور مسعود کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''میں نہیں سمجھ سکتا امی کہ آپ کا مذاق اس قدر گھٹیا کیسے ہو گیا؟ یہ کوئی لڑکی ہے۔'' اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور رابعہ بیگم بوکھلا گئیں۔

''پھر کیا ہے۔ تیرا دماغ تو درست ہے۔ یہ عام لڑکی نہیں تیری ہونے والی دلہن ہے جس سے تیری منگنی بھی کر دی گئی ہے، کیا تجھے میرے انتخاب پر اعتماد نہیں۔'' انہوں نے سنبھل کر کہا اور مسعود عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔

''آپ ضعیف ہو گئی ہیں امی، آپ کا ذہن کمزور ہو گیا ہے، آپ اپنے بیٹے کے معیار کو اس قدر گرا ہوا کیوں تصور کرتی ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم امی کہ باہر کیسی کیسی لڑکیاں میرا التفات حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی میرا معیار نہ بن سکی میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیل ہے زندگی گزارنے کے لیے، مجھے اپنے آئیڈیل کی ضرورت ہے۔ اس لڑکی کی نہیں جو شکل ہی سے گنوار معلوم ہوتی ہے۔ میں نے ولایت کی کسی لڑکی کو نہ لا کر آپ پر احسان کیا ہے اور آپ مجھے اس احسان کا یہ صلہ دینا چاہتی ہیں۔''

بیٹے کے تیور دیکھ کر رابعہ خاتون کے ہاتھوں کے طوطے اُڑے جا رہے تھے۔ تمام اعتماد دھرا رہ گیا تھا اور وہ ہول رہی تھیں۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولیں۔

''ہم نے بڑی مشکلوں سے یہ رشتہ حاصل کیا ہے بیٹے! احمد علی تو تیار ہی نہ تھے۔ شرافت تو ان کے گھر کی لونڈی ہے، ایسے شریف اور صاف ستھرے خاندان کہاں ملتے ہیں آج کل اور پھر وہ کوئی گرے پڑے انسان بھی نہیں ہیں، بہت اعلیٰ خاندان کے ہیں۔''

''مجھے شرافت نہیں، بیوی چاہیے جو زندگی بھر میرے سر پر مسلط رہے گی۔ اس سلسلے میں مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا جائے امی۔ میں کوئی بات بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

بیٹے کا جواب سن کر رابعہ خاتون سکتے میں رہ گئیں۔ اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ وہ جلد بازی میں کیا کر بیٹھی تھیں۔ مسئلہ اس خطرناک انداز میں اُلجھا تھا کہ سلجھانے کی کوئی شکل ذہن میں نہیں آ رہی تھیں مزید جلد بازی سے کام لیے بغیر وہ بیٹے کے کمرے سے نکل آئیں۔ فون کر کے شوہر کو گھر پہنچنے کے لیے کہا اور دوپہر کے کھانے پر امتیاز علی گھر واپس آ گئے۔

☆......☆......☆

کھانے کی میز پر رابعہ خاتون نہیں تھیں۔ انہوں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر بیٹے پر ناراضگی بھی ظاہر کی تھی۔ امتیاز علی جلدی جلدی کھانا کھا کر بیوی کے کمرے میں پہنچ گئے اور رابعہ خاتون کے کہنے پر دروازہ بند کر دیا گیا۔

''کیسی طبیعت ہے بیگم؟'' انہوں نے محبت سے پوچھا۔

''بس دل بیٹھا جا رہا ہے کیا بتاؤں کیا ہو گیا؟'' رابعہ خاتون نے کہا۔

''کیا بات ہے، بتاؤ تو سہی؟'' امتیاز علی گھبرا کر بولے اور رابعہ خاتون نے تمام ماجرہ کہہ سنایا۔ امتیاز علی کی حالت بیوی سے مختلف نہیں ہوئی تھی، سکتے کے عالم میں



بیٹھے رہے، لیکن پھر آنکھیں لال ہو گئیں۔
''میں نے پہلے ہی کہا تھا بیگم! لیکن آپ نہ مانیں اپنے گھر میں کچھ بھی ہو جائے لیکن دوسروں کی عزت سے کھیلنا آسان نہیں ہے۔ احمد علی کے پاس کچھ نہ سہی لیکن عزت ضرور ہے اور ہم اس کی عزت پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، میں پورا گھر تباہ کر دوں گا ایک ایک کو گولی کا نشانہ بنا کر خود خودکشی کر لوں گا بس یاد رکھیں۔''
''خدا کے لیے غصے سے کام نہ لیں کوئی حل سوچیں۔'' رابعہ خاتون نے کہا۔
''میں کوئی حل نہیں سوچوں گا میں جا رہا ہوں اور آپ کو شام تک کی مہلت دیتا ہوں۔ اس دوران اسے تیار ہو جانا چاہیے ورنہ پھر اس گھر کی تباہی شروع ہو جائے گی۔''
امتیاز علی نے کہا اور اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے وہ ایک منٹ بھی گھر میں نہیں رکے تھے اور رابعہ خاتون کے لیے دہری مصیبت کھڑی ہو گئی، شوہر کے تیور بھی خطرناک تھے اور بیٹے کے بھی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کریں کافی دیر تک ایسے ہی پڑی رہیں اور پھر دروازے پر آہٹ سن کر چونکیں۔
مسعود تھا۔ وہ اندر آ گیا۔
''دوپہر کے کھانے پر بھی آپ نہیں آئی تھیں امی۔ کیا بات ہے؟'' اس نے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا اور رابعہ بیگم پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ اس وقت ان کا تمام غرور خاک میں مل گیا تھا۔ بات جس حد تک بگڑ گئی تھی اس کے بعد کچھ باقی نہ رہ جاتا۔ اٹھیں اور بیٹے کے قدموں پر گر پڑیں۔
''مجھ سے غلطی ہو گئی مسعود! تیری ماں سے ایک بہت بڑا قصور ہو گیا۔ مجھے معاف کر دے بیٹے، مجھے تھوڑی سی زندگی اور دے دے مجھے تجھ پر بہت مان تھا۔ اسی مان کے تحت ایک بڑا قدم اُٹھا بیٹھی ہوں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے، ماں کے نام پر، انسانیت کے نام پر مجھے معاف کر دے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔
''مجھے کیوں گناہ گار کر رہی ہیں امی؟'' مسعود نے جلدی سے ماں کو اُٹھایا اور ان کے آنسو پونچھتے ہوئے۔ بولا ''مجھے بتائیے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''
''تیری شادی سے انکار پر اس گھر میں ایک بہت بڑا طوفان آ گیا ہے۔ اس طوفان کو روک دے مسعود تیرے باپ نے کہا ہے کہ اگر احمد علی کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی گئی تو وہ پورے گھر کو گولی مار کر خودکشی کر لیں گے، ہمارا بھرا گھر اجڑ جائے گا میرے لال اس گھر کو نہ اجاڑ، ماں کی لاج رکھ لے۔''
''بڑا مشکل امتحان ہے امی میرے لیے بہتر یہ ہے کہ میں خودکشی کر لوں تاکہ جھگڑا خود بخود ختم ہو جائے اس سے آسان اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔''
''تو صرف اسی سے شادی کر لے اگر شادی کے بعد وہ تجھے قبول نہ ہو تو دوسری شادی اپنی مرضی سے کر لینا میں تجھے روکوں گی نہیں۔ احمد علی واقعی بے حد نیک انسان ہیں۔ اور اس کی بیٹی ہیرا ہے تو اسے ضرور پسند کرے گا بیٹے پھر بھی میری طرف سے اجازت ہے کہ اگر......''
''کیوں میرا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہیں، میں اپنی ندگی کے ساتھ مذاق......''
''تو پھر سن، میں نے تجھے اپنا دودھ پلایا ہے میں بہر حال تیری ماں ہی کہلاؤں گی۔ میں اس گھر کی بربادی دیکھنے سے پہلے ہی ختم ہو جاؤں گی۔ تو جا سکتا ہے، نکل جا میرے کمرے سے۔'' رابعہ خاتون نے اس کا بازو پکڑ کر اسے دروازے کی طرف دھکیل دیا اور مسعود کے چہرے پر کشمکش کے آثار پھیل گئے۔
''بیٹے تو ماں کا غرور ہوتے ہیں وہ جوان ہو کر ماں کا سہارا بنتے ہیں، میں سمجھوں گی میری موت بیٹے کے ہاتھوں لکھی ہے۔ اپنی زندگی کو خوش و خرم رکھنے کے لیے ماں کا خون کرنے کی مثال قائم کر دے مسعود! یقیناً یہ تیرا کارنامہ ہو گا۔'' رابعہ خاتون نے کہا۔
''عجب ڈرامائی پوزیشن ہے۔ امی ایسی باتیں قصے کہانیوں میں تو ہوتی ہیں، لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ خود مجھے کسی کہانی کا کردار بننا پڑے گا، بہر حال میں ایک شرط پیش کرنا چاہتا ہوں۔'' مسعود نے نرم لہجے میں کہا۔
اور رابعہ بیگم اسے دیکھنے لگیں، ان کی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے۔
''مجھے اس لڑکی سے ملنے کا موقع دیا جائے میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں اگر وہ کسی حد تک بھی میرے معیار پر پوری اتری تو میں اس سے شادی کر لوں گا۔ ورنہ

پھر اس کے بعد اگر تباہی ہی لکھی ہے تو میں اسے قبول کرلوں گا، مگر زندگی بھر کا روگ نہیں پالوں گا۔"

رابعہ خاتون کو بہت بڑا سہارا مل گیا وہ خود رخشندہ کو دیکھ چکی تھیں۔ وہ سادہ اور معصوم سی لڑکی دلوں میں گھر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس بڑے طوفان کو ٹالنے کے لیے وہ احمد علی کی خوشامد کرسکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے وعدہ کرلیا کہ وہ یہ کام کردیں گی اور پھر اسی وقت وہ احمد علی کے ہاں جانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔

☆......☆......☆

احمد علی نے رابعہ خاتون کی گفتگو سنی اور ان کا چہرہ زرد ہوگیا وہ کئی منٹ تک کچھ بول نہ سکے اور پھر ان کی درد بھری آواز گونجی۔

"کیا ہمارے ساتھ یہ سلوک مناسب ہے۔ رابعہ بہن! ہمیں ہمارے کون سے قصور کی سزا دی جارہی ہے؟ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس وقت اس مسئلے کو ٹال دیا جائے لیکن آپ نے بات نہ مانی اور......"

"میں فرشتہ نہیں ہوں بھائی جان انسان ہوں، غلطی کربیٹھی جس کا مجھے شدت سے احساس ہے، بیٹے پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرلیا تھا، جس کی سزا بھگت رہی ہوں، بھائی سمجھ کر پریشانی میں آپ کو شریک کرنے آگئی ہوں۔ آپ نے بھی مایوس کردیا تو کس کا سہارا لوں گی؟"

رابعہ خاتون سسکنے لگیں۔

"خدا گواہ ہے رابعہ بہن، رخشندہ ہمارے اوپر بوجھ نہیں ہے ہاں۔ ہم اچھے رشتے کے خواہشمند ضرور تھے۔ آپ لوگ ہم سے برتر ہیں۔ ہم نے آپ کی محبت اور شرافت کو مدنظر رکھتے ہوئے رشتہ قبول کرلیا۔ ورنہ ہم مسعود میاں پر بار نہیں بنتے اور اب جب یہ بات پورے خاندان کو معلوم ہوگئی ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو ہماری بچی پر انگلیاں اٹھیں گی۔ ہمیں بتایئے ہماری پوزیشن کس قدر نازک ہے۔"

مجھے احساس ہے بھیا۔ مجھے پورا پورا احساس ہے میری عقل پر پتھر پڑگئے تھے۔ مجھے اپنی اولاد سے یہ امید نہیں تھی۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" رابعہ خاتون نے روتے ہوئے کہا۔

"ہمیں بتایئے ہم کیا کریں۔" احمد علی نے لرزتی آواز میں کہا۔

"اس ذلیل کی خواہش پوری کردی جائے میں انتہائی شرمندگی کے عالم میں کہہ رہی ہوں۔ اس طرح دونوں گھرانے بچ جائیں گے۔"

"ہمارے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ خدانخواستہ ہماری بچی میں کوئی عیب نہیں ہے۔ وہ بس خوددار ہے ہم اسے اپنی پسند کی شادی کے لیے تیار تو کرسکتے ہیں۔ (لیکن اسے بکاؤ مال کی طرح دکھانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے وہ کیا سوچے گی، وہ کیا خیال کرے گی کہ اس کے ماں باپ اس سے اکتا گئے تھے۔" احمد علی کے آنسو نکل آئے۔

"تم اس سے بات کرو بھیا! یہ ایک بہن کی درخواست ہے۔ تمہاری اور رخشندہ کی عزت میرے دل میں ہے۔ تم اسے ہمارے خاندان کا واسطہ دو وہ ضرور تیار ہوجائے گی وہ نیک بچی ہے۔"

"جایئے بھائی! ہم اسے تیار کرلیں گے، ہم یہ زہر بھی پی لیں گے، کاش ہم اپنی بیٹی کو اس بے عزتی سے بچالیتے۔" بالآخر احمد علی نے کہا اور رابعہ خاتون بامراد واپس چلی گئیں۔ لیکن ابھی تک بہت بڑا کانٹا ذہن میں چبھ رہا تھا۔ کیا مسعود اسے پسند کرے گا؟

☆......☆......☆

رخشندہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہوگئی، اس کا چہرہ پتھر کی طرح بے جان تھا۔ وہ ہورہا تھا جو کبھی نہیں ہوا تھا لیکن اس نے اطاعت سیکھی تھی۔ اس کا دل خون کے آنسو رورہا تھا لیکن والدین کی خواہش کی خاطر وہ بازار میں آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر مسعود کھڑا ہوگیا وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ، آپ رخشندہ ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔" رخشندہ کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے ابھری۔

"مس رخشندہ پلیز میری مدد کیجیے۔ میں نے غیر ممالک میں ایک سے ایک حسین لڑکی کو چھوڑ دیا، بلاشبہ آپ لوگ بہت شریف ہیں لیکن یہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے میں کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا جو اعلیٰ سوسائٹی سے دور ہو۔ میں آپ سے شادی نہیں کرسکتا۔ مس رخشندہ! کیوں کہ میں آپ کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا؟ اس طرح دو زندگیاں برباد ہوں گی۔ آپ کی بھی

اور میری بھی۔ بس میری امی سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں آپ کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اس صاف گوئی کے لیے مجھے معاف کردیں، میں مرجانا پسند کروں گا لیکن آپ کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔"

رخشندہ مسعود کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔ نفرت حقارت نجانے ان آنکھوں میں کیا کیا تھا؟

"بس میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ براہ کرم آپ میری امی کو سمجھادیں اور۔ اور......" لیکن رخشندہ مشینی انداز میں پلٹ گئی۔ وہ خاموشی سے ایک دروازے میں داخل ہوگئی اور اسی وقت دوسرے دروازے سے رابعہ خاتون داخل ہوگئیں۔ ان کے پیچھے احمد علی اور ان کی بیگم بھی تھی۔

رابعہ بیگم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ شاید ان لوگوں نے بھی مسعود کی گفتگو سن لی تھی۔

"تو نے جو کچھ کہا ہے موذی! اس کے لیے تو میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔" انہوں نے شدید غصے کے عالم میں کہا۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں امی آپ" آپ مسعود نے کچھ کہنا چاہا اس وقت اندرونی کمرے سے ایک فائر کی آواز سنائی دی، اور سب اُچھل پڑے۔

"رخشندہ، رخشندہ!" احمد علی پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے دوڑے ان کے پیچھے ہی دوسرے لوگ بھی دوڑے اور پھر دروازے سے داخل ہوتے ہی رخشندہ کی ماں چیخ مار کر بے ہوش ہوگئیں احمد علی دوڑ کر آتش دان کے پاس پڑی ہوئی رخشندہ کے قریب پہنچ گئے جس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔

"اب۔ اب میری لاش کو اس کے سامنے برہنہ کردیجیے گا ابا جان تاکہ۔ تاکہ۔" اس کے منہ سے آخری الفاظ نہ نکل سکے، اور اس نے دم توڑ دیا۔ احمد علی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ مسعود کے چہرے پر بھی تاسف تھا اور رابعہ خاتون کسی بت کی طرح ساکت تھیں۔

☆......☆......☆

بعد کے واقعات بے حد دردناک تھے، احمد علی کی بیگم پاگل ہوگئی تھیں۔ اور وہ ایک ہفتے کے اندر اندر وہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ امتیاز علی بیٹے کی صورت سے بے زار تھے۔ وہ کئی دن تک سخت بیمار رہے، مسعود کی صورت دیکھتے ہی ان پر دورہ پڑ جاتا اور جب تک وہ کمرے سے چلا نہ جاتا انہیں سکون نہ آتا۔

رابعہ بیگم نے بھی کافی عرصے تک مسعود سے گفتگو نہ کی لیکن مسعود اپنی جگہ مطمئن تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ غلطی اس کی نہیں تھی اس کے والدین کی تھی۔ وہ اپنی زندگی کو اس طرح داؤ پر تو نہیں لگا سکتا تھا۔

پھر حالات بدلتے چلے گئے۔ بدرنگ نقش مٹتے چلے گئے تھوڑے عرصے بعد ان کے اندر تاسف کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ رابعہ بیگم کی محبت پھر عود کر آئی اور وہ حسب سابق بیٹے کے چونچلے کرنے لگیں۔ ابھی اس کی شادی کا سوال نہیں اُٹھایا گیا تھا۔ امتیاز علی تو اس کے روادار ہی نہیں تھے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ جہاں چاہے شادی کرے، انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مسعود نے بھی خود کو اس ماحول میں ضم کرنا شروع کردیا بہرحال اسے یہاں زندگی گزارنی تھی اب وہ اعلیٰ سوسائٹی کی جان تھا۔ ہر محفل اس کے بغیر سونی ہوتی تھی بے شمار دوست بن گئے تھے۔ جو اس کی جیبوں پر جان چھڑکتے تھے۔ یوں تو وہ کئی کلبوں کا ممبر تھا۔ ہر جگہ اس کا چندہ جاتا تھا۔ لیکن دل کشا کلب ذاتی طور پر اسے پسند تھا۔ اس کی شامیں اسی کلب میں گزرتی تھیں۔

دل کشا کروڑ پتی لوگوں کا کلب تھا۔ یہاں کسی کم حیثیت کے انسان کا گزر ہی نہ تھا۔ بہت سی کروڑ پتی لڑکیاں مسعود پر جان چھڑکتی تھیں، لیکن اس کے غرور نے ابھی تک کسی کے سامنے شکست نہیں کھائی تھی۔ وہ ابھی تک کسی کی زلف کا اسیر نہیں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

لیکن ایک دن اس کا مان ٹوٹ گیا۔ ہفتے کی شام تھی اس روز کلب کے خاص پروگرام ہوتے تھے اس دن عام لوگ بھی مہنگا ٹکٹ لے کر کلب آسکتے تھے اور وہ اس کلب کے لیے نووارد تھی۔ کلب کے تمام نوجوان ممبر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ ایک شان بے نیازی سے سامنے رکھے ہوئے بلوریں گلاس سے کھیل رہی تھی۔

گھنے سیاہ بال جو اس کے دودھ جیسے چہرے کے گرد احاطہ کیے ہوئے تھے، بڑی بڑی روشن آنکھیں جن میں

ایک دنیا سمٹ آئی تھی، ستواں ناک اور اس کے نیچے یاقوتی ہونٹ، سڈول اور مناسب جسم، جس پر انتہائی قیمتی اور جدید لباس تھا۔ مسعود کا دل دھڑک اُٹھا۔ یہی تو تھی جس کا اسے انتظار تھا، اس کے قدم بے اختیار اس کی طرف اُٹھ گئے تھے۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس نے لرزتی آواز میں پوچھا اور جھیل جیسی گہری آنکھیں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔

"تشریف رکھیے، چاندنی کا سا ترنم ابھرا۔ اور وہ بیٹھ گیا۔

"میں نے پہلی بار آپ کو یہاں دیکھا ہے۔"

"میں پہلی بار آئی ہوں۔ اس ملک میں اجنبی ہوں۔"

"لیکن آپ یہاں کی زبان روانی سے بول رہی ہیں۔"

"اس لیے کہ میرا خمیر یہیں سے اُٹھا تھا۔ ایک سال کی تھی جب یورپ چلی گئی تھی۔ والد صاحب کی افریقہ میں زمرد کی کانیں تھیں۔ میں نے پوری زندگی یورپ میں گزاری ہے لیکن وطن کی زندگی اور اس کے طرز معاشرت سے دلچسپی رہی۔ والدین کے انتقال کے بعد میں تنہا رہ گئی، تب مجھے اپنا وطن یاد آیا اور میں ایک ماہ قبل یہاں آ گئی۔"

"اوہ۔ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ میں یہاں کے ایک بہت بڑے صنعت کار کا بیٹا ہوں، میرا نام مسعود ہے۔ آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

"رباب!" اس نے مختصراً کہا۔

"بڑا موزوں نام ہے، آپ ہی کی طرح حسین۔ کیا آپ اس کلب کی ممبر بن گئی ہیں؟"

"ابھی نہیں۔ لیکن یہاں کے کلبوں میں یہ کلب مجھے پسند آیا ہے۔ ممبر بن جاؤں گی؟"

"سمجھ لیجیے آپ ممبر بن گئیں، آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسعود نے کہا اور اس نے بڑی ادا سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کلب کے تمام لوگ حسرت و رشک سے اس جوڑے کو دیکھ رہے تھے، لڑکی نے بھی مسعود کی رفاقت پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور مسعود نے ایک حسین شام گزاری۔

☆......☆......☆

پھر وہ دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے اور مسعود تمام رات اس کے خواب دیکھتا رہا۔

دوسرے دن اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسے کلب کا ممبر بنا دیا۔ تمام کام اس نے اس کی غیر موجودگی ہی میں کر ڈالا تھا اور پھر اس شام وہ وقت سے پہلے ہی کلب پہنچ گیا۔ اسے رباب کا انتظار تھا۔ شدید انتظار اور یہ انتظار اس نے نجانے کتنا کٹھن گزارا، سات بجے وہ آ گئی اور مسعود کا چہرہ کھل اُٹھا۔ اس نے پہلے اسے کلب کے کاغذات پیش کیے اور رباب نے شکریہ کے ساتھ انہیں قبول کر لیا۔

آج وہ بہترین لباس میں تھی اور مسعود اس کی ایک ایک ادا پر نثار ہو رہا تھا۔ وہ اس کا آئیڈیل تھی۔ پھر ہر شام اس کی آرزوؤں کی شام بن گئی اور دن بے قراری کے دن، لیکن رباب بڑی محتاط تھی۔ اس نے دوستی کی حدود کو پار نہیں کیا تھا۔ مسعود اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیتا اور اس کے ہونٹوں پر صرف مسکراہٹ رقصاں رہتی، مسعود نے کئی بار اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن وہ ٹال گئی، اس نے آج تک مسعود کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟

اس طرح بہت دن گزر گئے۔ مسعود کا عشق جنون کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اب اسے رباب کے بغیر ایک پل چین نہیں تھا۔ وہ رباب کو اپنا لینا چاہتا تھا لیکن رباب ابھی تک اس پر نہیں کھلی تھی۔ آج اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ رباب سے کھل کر بات کرے گا۔ اسے اپنی بے قراری کی داستان سنائے گا اور اس سے فیصلہ طلب کرے گا۔ آج وہ پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔

پھر رباب آئی تو وہ اس کے حسن میں "کھو گیا" اس کا دل ڈوبنے لگا اگر رباب نے اسے قبول نہ کیا تو وہ کیا کرے گا "خودکشی۔؟"

اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں رہ جاتی تھی۔

کافی دیر تک ان کے دوست انہیں گھیرے رہے پھر بڑی مشکل سے انہیں تنہائی ملی۔ وہ زریں فوارے کے قریب رنگین کرسیوں پر بیٹھ گئے اور مسعود نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"رباب۔"

"ہوں۔" رباب نے بڑے پیارے انداز میں کہا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہیے۔"

"رباب۔ میں کوئی اوباش انسان نہیں ہوں نہ ہی لڑکیاں میری منزل رہی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت محتاط رہا ہوں۔ میں نے ہر قدم بڑے غور وفکر کے بعد اٹھایا ہے ایک طویل عرصے سے تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لینا چاہتا ہوں رباب، یہ میری آرزو ہے۔ اس میں کوئی گندگی نہیں ہے میں نے ایک شریفانہ درخواست کی ہے اگر اس زندگی میں تم میری رفاقت قبول کرلو تو مجھے جنت مل جائے گی، ورنہ تمہیں اختیار ہے۔ اگر تمہارے والدین حیات ہوتے تو میں یہ درخواست اپنے والدین کے ذریعے کراتا۔"

رباب نے سنجیدگی سے اس کی گفتگو سنی چند لمحات سوچتی رہی پھر بولی۔

"لیکن میرے خیال میں تم نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے مسعود۔"

"نہیں رباب تمہارا یہ خیال غلط ہے۔"

"کیوں؟ تمہیں میرے بارے میں کیا معلوم ہے وہی نا جو میں نے تمہیں بتایا ہے تم نے میری اصلیت معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اور مجھے اپنانے کا فیصلہ کر بیٹھے ممکن ہے میں وہ نہ ہوں جو تم سمجھتے ہو اور اس کے بعد تمہیں پچھتانا پڑے۔"

"میں پچھتانا چاہتا ہوں رباب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تم کچھ بھی ہو مجھے قبول ہو میں تمہارے بغیر......"

"تمہارے والدین مجھے قبول کرلیں گے؟"

"بصد خوشی۔ میرے اوپر اعتبار کرو۔"

"تب میں تیار ہوں۔" رباب نے کہا اور مسرت سے مسعود کی زبان گنگ ہوگئی اسے اتنی آسانی سے گوہر مقصود مل جانے کی امید نہیں تھی۔ وہ خوشی سے دیوانہ ہوگیا اور جب حواس واپس آئے تو اس نے پوچھا۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا رباب؟"

"خاموشی سے شادی، میں تمہارے گھر آجاؤں گی وہیں پر تم مجھ سے شادی کرلینا اس کے لیے اپنے والدین کو تیار کرلو۔"

"تم آج میرے ساتھ چلو۔ پلیز رباب۔ اب انکار مت کرو۔"

☆......☆......☆

مسعود نے کہا اور رباب تیار ہوگئی۔

مسعود اسے اپنے گھر لے آیا رابعہ بیگم تو رباب کو دیکھتے ہی فریفتہ ہوگئیں لیکن امتیاز علی کی آنکھوں میں رخشندہ کا چہرہ ابھر آیا اور وہ آب دیدہ ہوگئے تاہم انہوں نے رباب سے اچھا سلوک کیا اور اس سے گفتگو کرتے رہے پھر جب وہ واپس چلی گئی تو مسعود نے رابعہ بیگم سے اپنا مدعا ظاہر کیا۔

"لڑکی مجھے بھی پسند ہے لیکن اس کے بارے میں تو ہمیں کچھ نہیں معلوم۔" رابعہ خاتون نے کہا۔

"وہ یہیں آجائے گی یہیں سے اس کی شادی ہوگی امی وہ کون ہے کیا ہے ہمیں معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ کام ایک ہفتے کے اندر اندر ہونا ہے یہ میری آرزو ہے امی مجھے رباب کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"میں تمہارے ابا جان سے بات کروں گی۔" رابعہ خاتون نے کہا۔

رابعہ بیگم سے تفصیل سننے کے بعد امتیاز علی نے کہا۔

"جو دل چاہے کرو بیگم لیکن میں مظلوم احمد علی اور اس کی بیٹی کو مرتے دم تک نہ بھلا سکوں گا۔ میں بذات خود اس کام میں حصہ نہیں لوں گا ورنہ میرا ضمیر داغدار ہو جائے گا میں ایک مظلوم باپ کی لاش پر اپنے بیٹے کی خوشیوں کی عمارت تعمیر کرنے میں حصہ نہ لے سکوں گا، بلکہ اس رات میں رخشندہ کا ماتم کروں گا، میں اس بے گناہ کے لیے آنسو بہاؤں گا، جس کا کوئی قصور نہ تھا خدا مسعود کا قصور معاف کرے، میرا تو دل ڈرتا ہے کہ کہیں مسعود کو اس ظلم کی کوئی بڑی سزا نہ ملے۔"

"خدا نہ کرے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ رخشندہ کا دکھ مجھے بھی ہے لیکن گزری باتوں کو بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔" رابعہ خاتون نے لرز کر کہا۔

"ہاں بیگم ہم بھول سکتے ہیں لیکن نجانے احمد علی پر کیا گزری ہوگی خدا جانے وہ اس صدمے سے جانبر بھی ہوسکا ہوگا یا نہیں۔" امتیاز علی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تو پھر آپ کی اجازت ہے۔ میں مسعود کو خوشخبری

سناؤں۔"

"کہہ چکا ہوں جو دل چاہے کرو۔" امتیاز علی نے بے زاری سے کہا اور اُٹھ کر باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

امتیاز علی تو واقعی کسی کام میں شریک نہ ہوئے لیکن رابعہ بیگم نے دل کے ارمان پوری طرح نکالے اور رباب مسعود کی شریک حیات بن گئی مسعود کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہ تھا اور اس نے بڑے فخر وانبساط سے کہا تھا۔

"طلب ہونی چاہیے انسان کو اس کا مطلوب مل ہی جاتا ہے۔"

ہزاروں آرزوئیں لیے وہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوا سامنے ہی رباب سرخ جوڑے میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی لڑکی چاہے کتنی ہی ماڈرن ہو لیکن اس موقع پر وہ صرف لڑکی ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی روپ میں اچھی لگتی ہے۔ دروازے میں کھڑے ہو کر مسعود نے اسے دیکھا اور رباب نے ہاتھ سے گھونگٹ کھینچ لیا۔ مسعود مسرتوں سے جھومتا ہوا بیڈ کی طرف بڑھا اور پھر اس نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"رباب"

اور رباب شرما گئی شاید وہ مسکرا رہی تھی۔

"میں کتنا خوش نصیب ہوں رباب، میں نے زندگی میں ایک ہی چیز کی آرزو کی تھی وہ مجھے مل گئی۔"

"اور میں بھی۔" رباب نے جواب دیا لیکن اس کی آواز بدلی ہوئی تھی، ایک عجیب سی منمناہٹ عجیب سا کھوکھلا پن اس کی آواز میں شامل تھا۔ مسعود کو اس کی بدلی ہوئی آواز پر حیرت ہوئی۔ وہ بیڈ پر رباب کے قریب بیٹھ گیا اور اس نے رباب کا چہرہ اپنی طرف موڑ لیا اور پھر اگر وہ انتہائی طور پر قابو نہ پالیتا تو شاید اس کی چیخ سے درو دیوار ہل جاتے۔

وہ رباب کا حسین چہرہ نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک انتہائی خوفناک ڈھانچے کا چہرہ نظر کے سامنے تھا جس کے لمبے لمبے خوفناک دانت مسکراہٹ کے انداز میں کھلے ہوئے تھے۔

"یہ کیا مذاق ہے تم۔ تم کون ہو؟" اس نے اچھلتے ہوئے دل پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں رباب ہوں تمہاری محبوبہ تمہارا آئیڈیل۔" رباب نے بڑے پیار سے کہا لیکن اس کی آواز میں چڑیلوں کی سی منمناہٹ تھی۔

"خدا کے لیے مذاق مت کرو رباب یہ چہرہ اتار دو اف اس قدر خوفناک مذاق۔ تم بڑی ستم ظریف ہو!" مسعود نے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"یہ میری اصلی شکل ہے ڈارلنگ! یہ بالکل اصلی چہرہ ہے میں نے تم سے کہا تھا کہ جلد بازی سے کام نہ لو تمہیں میری حقیقت معلوم نہیں ہے تب تم نے کہا تھا کہ میں جیسی بھی ہوں تمہیں قبول ہوں۔ میں جیسی ہوں تمہارے سامنے ہوں اور اب میں تمہاری بیوی ہوں۔"

"رباب یہ مذاق ختم کرو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔" مسعود نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں ہوگا میں دعویٰ کرتی ہوں نہیں ہوگا تم میرے شوہر ہو میری مرضی کے بغیر تم مر بھی نہیں سکتے۔" وہ بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہو گئی اور مسعود نے دہشت زدہ انداز میں دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ لیکن چھلانگ لگانے کے بعد وہ جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے ایک قدم بھی نہ ہل سکا اس کے پیر جیسے زنجیروں سے جکڑ کر رہ گئے۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور رباب مسکراتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی اس نے مسعود کو اپنے خوفناک بازوؤں میں لے لیا اور اسی منمناتی آواز میں بولی۔

میں تمہاری بیوی ہوں ڈارلنگ تمہاری زندگی جسے پا کر تم بہت خوش تھے، تم نے اپنی مرضی سے مجھ سے شادی کی ہے اب بھاگ کیوں رہے ہو، یہ تو ہماری سہاگ رات ہے ہزار ہا ارمانوں کی رات اس رات یہ فرار کیسا؟"

"رباب خدا کے واسطے اگر یہ مذاق ہے تو خدارا اسے ختم کرو میں اسے برداشت نہیں کر پارہا۔" مسعود نے آخری اپیل کی۔

"تم میری اصلیت کو بار بار مذاق کہہ کر میری توہین کر رہے ہو میں کہہ چکی ہوں یہ میری حقیقت ہے، وہ نقلی چہرہ تھا جس کو چڑھا کر میں تمہارے سامنے آئی تھی میں دوسروں کے سامنے اس نقلی چہرے میں آؤں گی لیکن تم میرے مجازی خدا ہو میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گی۔

تمہارے سامنے میں اپنے اصل رنگ میں ہی آؤں گی۔"

مسعود نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا اس کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا یہ کیا ہو گیا اب وہ کیا کرے کس سے کہے اپنی مظلومیت کی داستان وہ تو کہیں کا نہ رہا۔"

"ہاتھ ہٹاؤ ڈارلنگ آؤ۔" رباب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور نجانے رباب کے لہجے میں کون سی قوت تھی وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اس قوت کو محسوس کر رہا تھا اسے اپنی بے بسی پر حیرت تھی لیکن وہ اس کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھا وہ کوشش کے باوجود رباب کے حکم سے انحراف نہ کرسکا۔

دہشت اور سنسنی کی تیز لہریں اس کے جسم میں دوڑ رہی تھیں لیکن وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا اس کے اعضاء پتھرا گئے تھے۔

سہاگ رات گزر گئی ارمانوں کی رات ارمانوں کی موت بن گئی۔ رباب خوش تھی، مسکرا رہی تھی وہ تھک کر اس کے پہلو میں سوگئی۔ لیکن وہ اسی طرح بے بس تھا اس خوفناک ڈھانچے کے پاس سے اُٹھ بھی نہیں سکتا تھا جو دلہن کے لباس میں عجیب وغریب لگ رہا تھا۔

پھر روشنی کی کرنیں دروازے کے اندر رینگیں میں تو رباب نے انگڑائی لی اور اس کے دانت مسکراہٹ کے انداز میں پھیل گئے دن میں شکل اور بھی بھیانک لگ رہی تھی۔

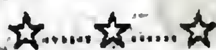
"صبح بخیر ڈارلنگ! اب تم باہر جاسکتے ہو۔" اور اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی مسعود کے جسم کی زندگی لوٹ آئی، وہ تھکے تھکے انداز میں اُٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔



پھر ناشتے کی میز پر اس کی ملاقات رباب سے ہوئی وہ پہلی رباب تھی۔ دلکش وحسین چہرہ، زندگی سے بھرپور اس کی آنکھوں میں رات کا خمار تھا۔ رابعہ خاتون کے علاوہ امتیاز علی نے بھی شاید حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا قصور بیٹے کا تھا آنے والی سے ناراضگی کا اظہار کیوں کیا جائے چنانچہ ان دونوں نے بہو کو خوش آمدید کہا اس کے حسن کے وہ دل سے قائل تھے۔ لیکن مسعود کے دل کی جو کیفیت تھی وہی جانتا تھا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا وہ برسوں کا مریض نظر آنے لگا۔ والدین نے اس کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور نجانے کیا سمجھ کر نظر انداز کردیا۔

ناشتے کے بعد رباب کو آنے جانے والیوں نے گھیر لیا اور مسعود گھر سے نکل آیا۔ اس کے حواس گم تھے۔ یہ کیا ہو گیا تھا رباب کون تھی؟ لیکن ان سوالات کا وہ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ رات کے بھیانک تجربے کو پھر نہیں دہرا سکتا تھا۔ اب وہ رباب کی قربت سے موت کو بہتر سمجھتا تھا۔

پھر وہ کیا کرے، کہاں جائے کس سے حقیقت حال کہے کون اس کا ہمدرد ہے؟؟ لیکن اسے پوری دنیا خالی نظر آئی بالکل خالی۔ اس کا ایک بھی ہمدرد نہیں تھا۔ رباب اس کی دریافت تھی اس نے کسی سے اس کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں لیا تھا پھر اس سے چھٹکارا پانے کی ترکیب کیا ہوسکتی ہے ایک ہی صورت تھی یہاں سے نکل کر چلا جائے کہیں دور بھاگ جایا جائے، خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر، اور یہ خیال اس کے ذہن میں جڑ پکڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر واپس آ گیا۔ مہمانوں کا زبردست ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ سب رباب کے حسن میں کھوئے ہوئے تھے، ولیمے کی تیاریاں ہو رہی تھیں زبردست انتظامات ہو رہے تھے، لیکن وہ ان تمام انتظامات سے بددل خاموشی سے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کپڑے وغیرہ لیتا تو گھر والوں کو شبہ ہوسکتا تھا، کپڑے دوسرے بھی خریدے جاسکتے ہیں۔ رقم کی صورت میں اس نے بڑے بڑے نوٹوں کی موٹی گڈیاں جیبوں میں ٹھونس لیں اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔



اب اس کا رُخ اسٹیشن کی طرف تھا۔ اس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ بس وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد جس طرح اور جہاں زندگی گزرے۔ اسے یہ گھر یہ عیش وعشرت کی زندگی چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے والدین کی پریشانی کا بھی احساس تھا لیکن ان تمام احساسات پر رباب کی بھیانک شکل حاوی تھی۔ اسے اس کے سوکھے ہوئے کریہہ دانت اپنے ہونٹوں سے چپکے ہوئے محسوس کر کے گھن آ رہی تھی اس کی سوکھی ہوئی ہڈیاں جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ رباب کی رفاقت، برداشت نہیں کرسکتا تھا

چنانچہ وہ سب کچھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔
ٹیکسی نے اسے اسٹیشن چھوڑ دیا کئی ٹرینیں گزر چکی تھیں۔اب جو ٹرین جانے والی تھی۔ وہ دن کے ساڑھے بارہ بجے چلتی تھی وہ ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ اور اس نے ساڑھے بارہ وہیں بجا دیے اسے خطرہ تھا کہ اس کی تلاش شروع نہ کر دی جائے بہر حال اگر تلاش ہوئی بھی تھی تو کوئی اسٹیشن کی طرف نہ آیا تھا۔ اس نے ٹرین کے آخری اسٹیشن کا ٹکٹ لیا اس ہزار میل سے زیادہ کا سفر تھا۔ اس نے سوچا منحوس شہر سے جس قدر دور نکل جائے بہتر ہے۔
ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں چند ہی مسافر تھے اسے کسی سے سروکار نہیں تھا۔ وہ تو اپنی تباہ شدہ زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر رباب کون ہے اس کا راز کیا ہے کیا، درحقیقت وہ یورپ سے آئی ہے، کیا اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ درست تھا۔ ؟؟؟
اور غور کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس سے زبردست حماقت ہوئی ہے وہ رباب کی محبت میں گرفتار ہو کر حواس کھو بیٹھا تھا، ورنہ رباب کی تو ایک بات بھی درست نہیں تھی۔ جب اس کا اپنا مکان موجود تھا تو اس نے اس کے گھر میں ہی شادی کیوں کی تھی؟ جب بقول اس کے وہ ایک ارب پتی باپ کی بیٹی تھی تو اس کی دولت کہاں تھی؟ ٹھیک ہے وہ اعلیٰ لباس پہنتی تھی، اعلیٰ طریقے سے رہتی تھی لیکن یہ نمائش؟ اس کے الفاظ کی تائید تو نہ تھی پھر وہ کیوں بے وقوف بن گیا اور ان تمام باتوں کا ایک ہی جواب تھا، وہ تھا رباب کا حسن، جس نے اسے عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔
لیکن پھر یہی سوال۔ رباب نے اس کے ساتھ یہ دھوکا کیوں کیا؟ اس نے اپنی حقیقت پہلے ہی کیوں نہ بتادی؟ یا اگر وہ اپنی حقیقت چھپا سکتی تھی تو پھر اس نے اس سے بھی چھپی کیوں نہ رہنے دی؟
وہ رباب سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی باتیں سوچنے لگا۔ رباب خود اس کی طرف مائل نہیں ہوئی تھی، اس نے خود کوشش کی تھی رباب نے تو اس سے اظہار الفت بھی نہ کیا تھا سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ یہ کیسی شادی تھی۔ یہ کیسی بیوی تھی اس کی حقیقت تو اب بھی اسے معلوم نہیں تھی۔
اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور سیٹ کی پشت سے گردن لگا دی۔ گاڑی ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی رہی پوری رات جاگتے گزری تھی ٹرین بدستور دوڑ رہی تھی اور مسافروں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ نجانے کتنے اسٹیشن آکر گزر گئے تھے۔ اس نے گردن جھٹکی بخار کی سی کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں نے اس کے ذہنی انتشار کو کسی قدر سکون بخشا، بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کمپارٹمنٹ سے نکل کر ڈائننگ کمپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا۔
گرم کافی اور سینڈوچ طلب کرنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگائی اور اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگا گھر کے لوگ اب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ہر جگہ اسے تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ سب حیران ہوں گے کہ وہ اپنی دلہن کو چھوڑ کر کہاں فرار ہو گیا ہے۔ رباب تو اس کی محبوبہ ہے۔ اس کے ہونٹ کراہیت آمیز انداز میں سکڑ گئے۔ بیرے نے اس کے سامنے مطلوبہ سامان رکھ دیا تھا۔ اور وہ سینڈوچ کھانے لگا۔ گرم اور سوندھی کافی نے اس کے ذہن کو سکون بخشا سونے سے طبیعت کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ ان خیالات کو ذہن سے کس طرح جھٹک سکتا تھا۔ جو اس کے ہوش اڑائے دے رہے تھے۔
تب اس نے سوچا کہ ممکن ہے یہ اس کی سزا ہو؟ اس نے کبھی کسی لڑکی کو گھاس نہیں ڈالی تھی، اس نے خود پر ناز کیا تھا، اس نے رخشندہ کا صبر لیا تھا۔ رخشندہ جس نے اپنی توہین پر جان دے دی تھی۔ جب وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا تو وہ کسی پتھر کی مورت کی طرح ساکت کھڑی تھی! اُفوہ۔ اس نے واقعی ظلم کیا تھا۔ احمد علی کی آہیں رائیگاں نہیں گئیں تھیں وہ دل ہی دل میں پچھتانے لگا۔
لیکن پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا، خاصی رات گئے تک وہ ڈائننگ کمپارٹمنٹ میں بیٹھا رہا اور پھر جب ڈائننگ کمپارٹ بالکل خالی ہو گیا اور بیرے اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگے تو اس نے بل ادا کیا۔ بل ادا کر کے واپس کمپارٹمنٹ میں آگیا۔ ٹرین کا ابھی طویل سفر باقی

تھا۔ وہ آکر اپنی سیٹ پر لیٹ گیا۔ تمام مسافر سو گئے تھے وہ خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگا، اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

اور ابھی اس نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔ ایک منمناتی ہوئی آواز، ڈارلنگ تم کہاں ہو۔ ڈالنگ آؤ۔ واپس آجاؤ ڈارلنگ، آواز اس کے حواس پر طاری ہوگئی اور ٹرین کا شور یک لخت رک گیا۔ اب اس کے جسم کو ہچکولے بھی نہیں لگ رہے تھے۔ اور پھر وہی سوکھی سوکھی انگلیاں بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر کنگھی کرنے والی کلائی پکڑلی۔

اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا وہ اس کلائی کو پہچانتا تھا۔ پچھلی رات وہ اس کے سوکھے جسم سے پوری طرح آشنا ہوچکا تھا۔ مگر یہ جسم ٹرین میں کہاں سے آگیا، اس نے وحشت زدہ انداز میں آنکھیں کھول دیں اور اس کا سر گھوم گیا وہ اپنی خواب گاہ میں اپنے بیڈ پر تھا۔ اور رباب اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے لمبے دانت نظر آرہے تھے اور آنکھوں کے گڑھے چمک رہے تھے۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور وحشت زدہ نظروں سے خواب گاہ کو دیکھنے لگا۔

''گھبراؤ نہیں ڈارلنگ! تم میری آغوش میں ہو۔'' رباب کی منمناتی ہوئی آواز گونجی۔ ''تم مجھ سے فرار ہوکر کہاں جاؤ گے؟ لیٹے رہو، تم نے دن بھر کا سفر کیا ہے۔ لاؤ تمہارا سر دبا دوں۔'' اس کا سوکھا ہاتھ مسعود کی پیشانی پر پہنچ گیا۔

''میں...... میں یہاں کیسے آگیا؟ میں......'' وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔

''میں نے تمہیں بلایا ہے تم چلے آئے۔ آخر میں تمہاری بیوی ہوں۔ میری محبت معمولی نہیں ہے۔ تم دنیا کے کسی حصے میں چلے جاؤ، میں جب بھی تمہیں آواز دوں گی۔ تم میرے پاس چلے آؤ گے۔ گھر کے سب لوگ تمہارے لیے پریشان تھے۔ لیکن میں مطمئن تھی میں جانتی ہوں کہ میری محبت کے تار کمزور نہیں۔ آواز جب بھی دوں گی تم چلے آؤ گے اور تم آگئے میرے محبوب!'' رباب کے جبڑے بھیانک انداز میں کھل گئے۔

مسعود کے حواس گم ہوتے جارہے تھے۔ کوئی بات جو سمجھ میں آتی ہو۔ یہ استخوانی ڈھانچہ اس پر مسلط تھا۔ لکڑیوں جیسے سوکھے ہاتھ محبت سے اس کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔ بھیانک دانت باہر نکل پڑ رہے تھے۔ اس کی لرزشیں بے قابو ہوئی جارہی تھیں۔ وہ متعجبانہ انداز میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس طلسم میں گرفتار ہوکر رہ گیا ہے۔ ٹرین کا سفر ایک خواب تھا یا یہ نجات۔ ہاں وہ تو ٹرین ہی میں سفر کررہا تھا اور پھر اس کے کانوں میں ایک آواز اُبھری تھی ٹرین اسٹیشن سے سینکڑوں میل دور نکل چکی تھی۔ اس قدر جلد واپسی کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہاں، یہ رات ہی کا وقت تھا اور شاید اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور منمناتی ہنسی اس کے کانوں میں اُبھری۔

''میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔''

''میں...... میں رباب! میں......''

''مسعود! تم جانتے ہو بیوی ساری عمر کی ساتھی ہوتی ہے اسے چھوڑنا کہاں کی عقلمندی ہے اور پھر تم نے خود ہی مجھ سے پینگیں بڑھائی تھیں۔ میں تو تمہاری طرف متوجہ بھی نہیں ہوئی تھی۔ ڈارلنگ اب مجھے اپنی شریک زندگی بنانے کے بعد، مجھ سے منہ کیوں موڑ رہے ہو؟''

''رباب! خدا کے لیے میری زندگی کے ساتھ یہ مذاق مت کرو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم کون ہو مجھے بتاؤ تم کون ہو؟''

''بتا بھی دوں تو تمہیں اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ ڈارلنگ! اب تو میں جو کوئی بھی ہوں تمہاری بیوی ہوں۔''

''مگر تمہارا استخوانی بدن اور تمہارا یہ بھیانک چہرہ؟''

''دیکھو ڈیئر! ایسی باتیں مت کرو۔ تم نے تو میرے لیے سب کچھ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ تمہیں اپنے الفاظ یاد نہیں ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ کہیں تم مجھ سے شادی کرنے کے بعد پچھتاؤ نہ۔ تم نے کہا تھا کہ میں پچھتانا چاہتا ہوں۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں اب جب اپنی ساری زندگی تمہارے قدموں پر نچھاور کرنے آگئی ہوں تو تم مجھ سے اس طرح گھبرا رہے ہو۔ میری توہین کیوں کررہے ہو ڈارلنگ؟''

بے ہوش ہونے کی کوششیں بھی ناکام ہوگئی تھیں۔

کوئی اور ہوتا یا کسی اور ماحول میں اگر یہ ڈھانچہ نظر آتا تو لاکھ روشن خیال ہونے کے باوجود مسعود کو اپنے ذہن و دل پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ لیکن یہ رباب تھی اس کی بیوی، اس کی آواز وہی تھی لیکن بس گوشت پوست غائب ہو جانے کی وجہ سے اس آواز میں ایک منمناہٹ سی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کا پورا بدن پسینے میں بھیگ رہا تھا وہ بے بسی سے زخمی چڑیا کی طرح رباب کی طرف دیکھتا رہا۔ رباب کی آنکھوں کے حلقوں کی گہرائی سے روشنی جھانک رہی تھی۔ وہ تو بہت خوش تھی اور اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ بار بار ہل رہے تھے۔

''تم کہاں چلے گئے مسعود؟''

''رباب! رباب! میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میں مر جاؤں گا۔''

''اگر تم مر بھی جاؤ گے تو بھی میں پیار کرتی رہوں گی۔ مسعود اب میں تمہاری بیوی بن چکی ہوں۔ تم کہیں بھی چلے جاؤ، جہاں بھی ہو گے مجھ سے نہ بچ سکو گے، سمجھے! خود کو میرے حوالے کر دو جو کچھ تم کر چکے ہو وہ تو اب تمہیں بھگتنا ہو گا۔''

اور رباب کا کہا سچ ہی تھا اس کا دل ہوتا رہا وہ اس کے سامنے بے بس پڑا رہا۔ یہاں تک کہ کہیں دور سے موذن کی آواز ابھری۔

رباب اٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔

مسعود نے دونوں ہاتھ آنکھوں کے نیچے رکھے اور چکرائے ہوئے ذہن کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔

رباب جب غسل وغیرہ سے فارغ ہوئی تو وہی شباب اس پر آچکا تھا جسے دیکھ کر مسعود دیوانہ ہو گیا تھا۔ لمبے لمبے بال ٹخنوں سے نیچے تک بکھرے ہوئے تھے حالاں کہ نیچے سے یہ بال تراش دیے گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی لمبائی بے پناہ تھی۔ چہرے پر دلکشی اور شادابی ایسی کہ دیکھنے والے کی آنکھ اس پر سے نہ ہٹے۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں جوانی کا خمار تیر رہا تھا۔ مسعود نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ رباب کی آواز میں بھی اب وہ منمناہٹ نہیں تھی۔

''اٹھو مسعود! جاؤ غسل کر لو تھکن دور ہو جائے گی۔ اتنا طویل سفر طے کیا ہے تم نے۔ سارے گھر والے پریشان تھے۔''

مسعود نے کوئی جواب نہ دیا وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد دروازے پر دستک سنائی دی۔ رابعہ بیگم کی آواز تھی۔

''بہو! کیا تم جاگ رہی ہو بہو؟''

''ہاں، امی حاضر ہو رہی ہوں۔'' رباب نے نہایت نرم اور شیریں آواز میں کہا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ رابعہ بیگم کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے ابھر آئے تھے۔ بدن میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔

''بہو! اب تک کوئی پتہ نہیں چل سکا نجانے، نجانے۔''

''کس کی بات کر رہی ہیں امی؟'' رباب نے چاندی جیسے ترنم سے پوچھا۔

''مسعود کی اور کس کی۔ مصیبت بن گیا ہے گھر والوں کے لیے ہمیشہ ہی کی۔''

''نہیں، نہیں امی آپ اسے کیوں کوس رہی ہیں۔ غسل خانے میں ہیں۔ غسل کر رہے ہیں۔''

''کون'' رابعہ بیگم کا دل ایک بار پھر لرز گیا۔

''آپ کے بیٹے اور کون؟''

''کہاں ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟ کیا واقعی؟ کیا واقعی تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں امی وہ غسل خانہ میں ہیں۔'' رباب نے کہا اور رابعہ بیگم بے اختیار دوڑی ہوئی غسل خانے کے قریب پہنچ گئیں۔ اندر سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ انہوں نے لرزتی آواز میں پکارا۔

''مسعود! مسعود بیٹے کیا تم اندر ہو؟''

''ہاں۔'' مسعود کی گھٹی گھٹی آواز ابھری اور رابعہ بیگم نے دروازے سے رخسار لگا دیا۔ بہر طور اس کے بعد وہ وہاں سے واپس پلٹ پڑیں اور امتیاز علی صاحب کے کمرے میں پہنچ کر زور زور سے دروازہ پیٹا اور پھر اندر گھس گئیں۔

''کیا طوفان آ گیا؟ کیا بات ہے؟'' امتیاز علی نے بگڑتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"وہ۔ وہ تو۔ وہ تو بہو کے کمرے میں موجود ہے۔"

"کیا؟" امتیاز علی بھی اچھل پڑے۔

"ہاں۔ وہ غسل کر رہا ہے۔"

"کہاں مر گیا تھا کل؟ لوگوں سے مجھے کیا کیا بہانے تراشنے پڑے۔ خدا کی قسم زندگی میں جھوٹ بولنے سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ بڑے سے بڑا نقصان ہو گیا لیکن جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن کل کا دن میری زندگی کا منحوس ترین دن تھا۔ میں لوگوں کو نجانے کیا کیا کہہ کر سمجھاتا رہا۔ خدا کی پناہ! خدا کی پناہ! کہاں مر گیا تھا وہ تم نے پوچھا نہیں؟"

"ابھی تو میری اس سے بات چیت ہی نہیں ہوئی۔ بہو نے بتایا کہ وہ غسل کر رہا ہے۔"

"بہو کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہے بلاؤں؟"

"ہاں بلاؤ اسے اور اس ذلیل سے کہو کہ تیار ہو کر میرے پاس پہنچے۔" امتیاز علی نے کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد رابعہ بیگم لجاتی شرماتی بہو کے ساتھ کمرے میں پہنچ گئیں۔ رباب نے جھک کر امتیاز علی کو سلام کیا۔

"خوش رہو۔ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی اپنے جذبات کے ہاتھوں غلط انسان کے چکر میں پڑ گئی تھیں۔ وہ ذلیل بدفطرت ہے۔ میرا بیٹا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کاش میرا کوئی بیٹا نہ ہوتا۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ بہو سے بیٹھنے کو بھی نہ کہیں گے۔" رابعہ بیگم نے کہا۔

"بیٹھو۔ کس وقت واپس آیا تھا وہ؟"

"رات کو آ گئے تھے۔"

"تم نے پوچھا نہیں۔ کہاں چلا گیا تھا؟"

"کچھ بتایا ہی نہیں عجیب سے ہو گئے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں پریشان سے ہیں؟"

"تمہیں بھی اس نے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی؟"

"میں نے بہت معلوم کیا لیکن انہوں نے زبان نہیں کھولی۔" بہو نے سادگی اور معصومیت سے کہا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مسعود اندر پہنچ گیا۔ امتیاز علی صاحب اس پر گرجنے اور برسنے لگے۔

"کیا حرکت کی تھی تو نے کل ولیمہ تھا کل سارے مہمان تیرے بارے میں پوچھ رہے تھے اور میں طرح طرح کے بہانے بناتا رہا تھا۔ کہاں مر گیا تھا تو۔ کہاں مر گیا تھا؟"

"وہ۔ وہ بس میں......"

"ہاں، ہاں۔ جواب دو۔ بہو کا کیا قصور ہے یہ تو تیری پسند ہے؟ تیرا آئیڈیل ہے۔ میں کسی بچی کی زندگی تجھ سے منسوب کر کے تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تیری ماں، تیری ماں نے مجھے بھی برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ تماشا بن کر رہ گیا ہوں دنیا کے سامنے اب۔ جواب دے کہاں مر گیا تھا تو جواب دے؟"

"ڈیڈی! بس آپ اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھیں، کہیں چلا گیا تھا۔"

"ہاں۔ چلا گیا تھا۔ بیٹے خوب بدلا لے رہے ہو اپنے باپ سے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے بدلا لینا چاہیے۔ عورت کے فریب میں جو کوئی آیا۔ اس نے زندگی میں کبھی خوشی کی شکل نہیں دیکھی۔ کاش میں تمہاری ماں کے فریب میں نہ آتا۔ مجھے گناہ تو ملے گا ہی میں اس عذاب کو برداشت کروں گا جو میں نے احمد علی پر مسلط کیا تھا۔ ہاں میں بھی تو اس گناہ کا برابر کا شریک تھا جو تیری ماں کرنے جا رہی تھی۔ کاش میں اس وقت اسے روک دیتا۔ کاش میں عورت کی باتوں میں نہ آتا۔"

امتیاز علی اور فول بکتے رہے۔ مسعود پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

مسعود سڑکوں پر کار دوڑائے پھر رہا تھا، کوئی منزل نہیں تھی اس کے سامنے، کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی تقدیر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "یہ کیا ہوا؟ ایسا کیوں ہوا؟ وہ کون ہے؟ آخر رباب کا راز کیا ہے؟ وہ کہتی ہے کہ وہ اس کی اصلی شکل ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کے استخوانی ڈھانچے کے نیچے گوشت پوست کا کوئی وجود تو نہیں۔ وہ اسے دھوکا نہیں دے رہی، کوئی مذاق نہیں کر رہی اس کے ساتھ اور پھر سینکڑوں میل دور سے اس طرح چلے آنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا یہ حقیقت ہے کہ وہ بدروح ہمیشہ کے لیے اس پر مسلط ہو گئی۔ ساری زندگی اسے یہ عذاب بھگتنا پڑے گا۔ کیوں آخر کیوں؟"

وہ سوچتا رہا۔ کئی جگہ سڑکوں پر حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس کا ذہن اس کے قابو میں نہ رہا تھا۔ تب اس

نے ایک سنسان پارک کے کنارے گاڑی روک دی اور اتر کر اندر چلا گیا۔

پارک میں بھیڑ نہیں تھی۔ ایک خوب صورت گوشے میں وہ ایک بینچ پر بیٹھ کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ آخر ایسا کیوں ہوا ہے؟ رباب کی اصلیت کیا ہے؟ کس طرح یہ اصلیت معلوم ہو سکتی ہے؟ بظاہر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ دل کا حال کس سے کہتا۔ دوست مذاق اڑانے کے علاوہ کیا کر سکتے تھے۔ بہت دیر تک وہ سوچتا رہا۔ کوئی بات جو سمجھ میں آتی ہو۔ بھاگ جانے کی کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ اور کیا عجب تھا کہ مزید کوششیں بھی ناکام ہوتی رہیں۔

بہت دیر تک بیٹھا وہ سوچتا رہا۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ اپنے ایک دوست کی طرف چل پڑا۔ ایک پبلک کال بوتھ سے اس نے اپنے دوست کے گھر ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے گھر پر ہی موجود ہے۔

مسعود کی آواز سن کر وہ چونک پڑا اور حیرت سے بولا۔ ”ارے ارے دولہا میاں کہاں سے بول رہے ہیں آپ؟“

”ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے۔“

”خیریت؟“

”ہاں۔“ مسعود مدہم لہجے میں بولا۔

”بھئی نئی نئی دلہن ملی ہے اور یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس کے بعد بھی ہم یاد رہے۔“

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں محسن!“

”تو محسن حاضر ہے، کہیں پہنچ جاؤں یا گھر آ رہے ہو؟“

”بہتر یہ ہے کہ تم کسی ریستوران میں مجھ سے ملاقات کر لو۔“ اس نے کہا اور ریستوران کا نام بتانے کے بعد وہاں پہنچ گیا تھا۔

محسن تھوڑی ہی دیر میں اس کے پاس آ گیا تھا اس کا چہرہ دیکھ کر محسن چونک پڑا۔

”ارے مسعود! کیا بات ہے؟ بجھے بجھے نظر آ رہے ہو خیریت تو ہے؟“

”خیریت!“ مسعود نے محسن کی آنکھوں میں دیکھا لیکن دفعتاً اس کا سر بھاری ہونے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی ریستوران کے بجائے ویرانے میں کھڑا ہو۔

چاروں طرف تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ ان ہواؤں نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ محسن تعجب سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسعود کو کیا ہوا ہے؟ لیکن مسعود اس کی سوچ سے بے نیاز اپنے آپ کو ایک صحرا میں کھویا محسوس کر رہا تھا۔ پھر منمناتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

”مسعود! میں تمہاری بیوی ہوں، میرا راز تمہاری امانت ہے۔ تم نے اگر یہ راز کسی کو بتا دیا تو اچھا نہیں ہو گا مسعود! تم یہ راز کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ اپنی زبان بند کر لو، خاموش ہو جاؤ تم کچھ نہیں بولو گے۔ تم کچھ نہیں بولو گے۔“

اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو، کوئی آواز اس کے حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ تب محسن نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور وہ جیسے ان ویرانوں سے لوٹ آیا۔ اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”مسعود! تمہاری حالت کچھ بہتر نہیں معلوم ہوتی کیا بات ہے دوست؟ پریشان کیوں ہو؟“

”کچھ بھی نہیں طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“

”اس وقت گھر سے کیسے نکل آئے؟ بھابی خیریت سے تو ہیں؟“

”ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ بس اچانک دل گھبرایا تھا۔ تو باہر نکل آیا۔“

”کمال ہے یار! ایسی حسین بیوی، ایسا حسین ساتھی اور تمہارا دل گھبرانے لگا۔ صرف ایک ہی دن میں اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ ولیمے کے دن تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”بس کسی کام سے چلا گیا تھا۔ گاڑی خراب ہو گئی اور واپسی میں دیر لگ گئی۔ بڑی پریشانی کے عالم میں کل کا دن گزرا۔“

”سب لوگ تمہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ شاید تم اپنے ڈیڈی کو بھی بتا کر نہیں گئے تھے۔ وہ بے چارے مہمانوں کو بھی ریسیو کر رہے تھے اور ان کی حالت خراب تھی۔“

”ہاں میں سب کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوں مجھے افسوس ہے۔“

”لیکن ایسی ضرورت کیا پیش آ گئی تھی کہیں دور

جانے کی؟"

"بس ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ وہ شادی میں شریک نہیں ہوا۔ وہ خود بھی نہیں ملا اور واپسی میں گاڑی خراب ہوگئی۔"

"بھئی ابھی تمہیں لمبا سفر نہیں کرنا چاہیے۔ بھابی صاحبہ کیا سوچتی ہوں گی اور پھر مسعود تمہیں تو تمہارا آئیڈیل ملا ہے۔ سچی بات تو یہ کل بھابی کو بغور دیکھا۔ وہ تو اس زمین کی مخلوق معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں۔"

"ہاں۔" مسعود دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ اس زمین کی مخلوق معلوم نہیں ہوتی۔ محسن سے کافی دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ اپنے دل کا حال کسی کو بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ زبان ہی بند کردی جاتی تھی۔ پھر وہ محسن سے رخصت ہونے کے بعد سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ گھر واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک سڑک پر کار دوڑا رہا تھا جب اسے کانوں میں ایک سرگوشی سنائی دی۔

"کھانا گھر پر نہیں کھاؤ گے مسعود!" یہ آواز اسی کی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کا ہاتھ بہک گیا تھا اور کار سڑک پر لہراگئی۔ لیکن سنسان سڑک تھی۔ اس لیے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس نے کار کو سنبھال لیا۔

"آجاؤ میں انتظار کررہی ہوں۔" اور غیر اختیاری طور پر اس کا رخ گھر کی جانب ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی کوٹھی میں داخل ہورہا تھا پہلی ملاقات رابعہ بیگم ہی سے ہوئی، انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم نے ایسے نوبیاہتا جوڑے کہیں نہیں دیکھے۔ بہو گھر میں اکیلی ہے۔ ملنے جلنے والوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کل بھی بہت سے لوگ تم سے نہیں ملے تھے اس لیے آج دریافت حال کے لیے آئے تھے۔ لیکن تمہیں موجود نہ پاکر وہ سب چہروں پر شک وشبہات کے سائے لے کر گئے ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟"

"امی آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہیں۔ کوئی بات ہو تو آپ کو بتاؤں۔"

"لیکن تمہاری اس طرح غیر موجودگی مجھے کچھ عجیب سی لگ رہی ہے۔ یہ سب کچھ تمہاری فطرت کے خلاف ہے مسعود! تمہارے ڈیڈی بھی پریشان ہیں بتاؤ میں انہیں کیا جواب دوں؟"

"کمال کی بات ہے۔ آپ لوگوں نے خواہ مخواہ ایک پریشانی اپنے اوپر مسلط کرلی ہے۔ میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" وہ جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"لیکن میں ایک بات جانتی ہوں۔ وہ یہ کہ کوئی بات ضرور ہے۔" رابعہ بیگم نے کہا۔

"امی آپ خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں سوچ رہی ہیں، کوئی بات نہیں ہے سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب کیا میں گھر میں ہی گھسا رہوں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کیسے کروں۔ میرے اوپر جو ذمہ داریاں پڑ گئی ہیں۔ انہیں پورا کرنا چاہتا ہوں۔"

"اگر یہ بات ہے بیٹے! تو تو کیوں پریشان ہے؟ میں تیرے ڈیڈی سے بات کروں گی۔ وہ جو فیصلہ کریں گے۔ تیرے حق میں بہتر ہوگا۔"

رات کو اس نے بہت تھوڑا سا کھانا کھایا۔ امتیاز علی گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بہر طور سارے معاملات سے فارغ ہوکر وہ پھر اس بدنصیبی کے کمرے میں پہنچ گیا جہاں حسینہ عالم اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

رباب کی استخوانی انگلیاں گوشت پوست سے بے نیاز دوپٹے کا پلو مسل رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے حضور پہنچ گیا اور رباب کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہنس رہی ہو مجھ پر۔ ہنس رہی ہو میری تقدیر پر۔ واقعی میں اسی قابل ہوں۔"

"کیوں خیریت ہے کیا ہوا؟" رباب نے پوچھا۔

"رباب! خدا کے لیے۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میری زندگی سے نکل جاؤ۔"

"کیسی باتیں کررہے ہو سرتاج۔ میں غم کی ماری کہاں جاؤں گی۔ تم جانتے ہو اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں باپ نہ کوئی اور سہارا۔ صرف تم ہی اپنے ہو، تمہیں کیا ہوگیا ہے کیا ہوگیا ہے؟"

"مجھ سے پوچھ رہی ہو، اپنے وجود کو کبھی آئینے کے سامنے دیکھو، تمہیں خود اندازہ ہوجائے گا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔"

"ہاں، میں خود جب اپنی اصلی شکل کو دیکھتی ہوں تو مجھے احساس ہوجاتا ہے کہ میرا یہ روپ دنیا کے لیے ناپسندیدہ ہے۔ لیکن میری زندگی کے مالک کے لیے

نہیں، میرے مجازی خدا کے لیے نہیں کیوں کہ میں اسے دھوکا نہیں دینا چاہتی۔"

"مجھے دھوکا دو رباب، خدا کے لیے مجھے دھوکا دو اپنی اسی شکل میں آجاؤ۔"

"نہیں ایک شریف اور مشرقی عورت کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے مجازی خدا کو دھوکا دے۔"

"اے مشرقی عورت مجھ سے بھی تو پوچھ اپنے اسی اصلی رنگ و روپ میں، تو جیسی بھی ہے۔ اس صورت میں تجھے قبول کرلوں گا۔ مجھے اذیت نہ دے۔ میں تجھ سے تیرے بارے میں کبھی نہیں پوچھوں گا۔ تو اسی حالت میں رہ جس حالت میں نظر آتی ہے۔"

"نہیں میں کہہ رہی ہوں۔ میری یہ حیثیت دوسروں کے لیے ہے، آپ کے سامنے میں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہوں۔ یوں بھی آپ نے زندگی مصنوعی لبادوں میں گزاری ہے سرتاج! اب حقیقت کا رنگ بھی دیکھ لیں۔ آخر آپ حقیقت سے چشم پوشی کیوں کرتے ہیں؟"

"میں مرجاؤں گا، تمہیں قبول کرنے کو تیار ہوں لیکن اس صورت میں اگر تم میرے سامنے اپنی مصنوعی شکل میں رہا کرو۔"

"لیکن۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں جو ہوں وہی رہوں گی۔ اس وقت تک جب تک آپ تصنع نہیں چھوڑ دیں گے۔" رباب نے کہا۔

☆......☆......☆

کوئی بات نہ بن سکی تو وہ دوبارہ گھر سے نکل آیا۔ اب اس نے شراب پینا شروع کردی تھی۔ شراب نے اسے اس وقتی غم سے دور کردیا تھا۔ اب جب وہ بالکل ہی بے سدھ ہوگیا۔ تو نجانے نے کیسے گھر پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

شراب ہر وقت شراب، امتیاز علی کو بھی معلوم ہوگیا۔ کہ اب وہ باقاعدہ شراب پینے لگا ہے۔ شادی کو کئی ماہ گزر گئے تھے۔ دلہن خوش و خرم تھی۔ اس نے کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس کی یہ کیفیت دوسروں کے لیے بھی تعجب خیز تھی۔ مسعود کے حالات اس پر اثر انداز نہیں تھے۔ اس کی صحت دن بدن گرتی جارہی تھی۔ اس سے معلوم کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئی تھیں۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔

امتیاز صاحب بھی صدمے کی تمام حدود سے گزر کر اب خاموش ہوگئے تھے۔ انہیں چپ لگ گئی تھی۔ دوست واحباب بیٹے کے بارے میں پوچھتے تو ان پر جھلاہٹ کے دورے پڑ جاتے۔

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں بیمار رہتا ہے؟ کیوں شراب پیتا ہے؟ آپ لوگ میرے دوست ہیں مجھ سے غرض رکھیں۔ میرے گھر کے بارے میں کیوں چھان بین کرتے رہتے ہیں؟"

بہت سے لوگ امتیاز صاحب کی باتیں سن کر حیران رہ جاتے تھے۔ یہ شخص تو بہت خوش اخلاق اور ملنسار تھا۔ نہ جانے بے چارہ کن غموں کا شکار ہے؟

رابعہ بیگم الگ پریشان تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک دن بہو سے کہا۔

"بہو! تم اس سلسلے میں میری مدد نہیں کروگی؟"

"کس سلسلے میں امی جان؟"

"مسعود ایسا تو نہ تھا؟"

"ہاں مسعود ایسے تو نہ تھے۔"

"پھر اسے کیا ہوگیا؟"

"آپ نے نہیں پوچھا؟"

"بہت پوچھا مگر وہ کسی کو کب بتاتا ہے؟"

"میرے ساتھ بھی ان کا یہی سلوک ہے۔"

"تم اسے مجبور کرو۔ رباب بیٹی! وہ ہمارے ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے۔"

"ایک بات کا جواب دیں گی امی۔" رباب نے پوچھا۔

"ہاں ضرور۔"

"آپ ان کی ماں ہیں کیا آپ کسی سلسلے میں انہیں مجبور کرسکیں؟"

"وہ بہت ضدی ہے۔" رابعہ بیگم مایوسی سے بولیں۔

"میرے ساتھ بھی یہی کیفیت ہے ان کی۔ دراصل امی فطرتیں تو انسان کی ایک عمر میں بنتی ہیں ہم لوگ اپنے بے جا لاڈ پیار سے حالات کو بہت بگاڑ دیتے ہیں۔ مسعود کی تربیت غلط بنیادوں پر ہوئی ہے اور درخت وہی پھل دیتا ہے۔ جس کے بیج ڈالے جاتے ہیں۔"

بہو کا ٹکا سا جواب پاکر رابعہ بیگم خاموش ہوگئیں۔

شوہر سے اس گفتگو کے بارے میں کہا تو جھلا کر بولے۔
"ایک ایک لفظ سچ ہے اس کا۔ اس کتے نے مجھے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔ کسی وقت اس سے نمٹنا ہی پڑے گا۔" امتیاز صاحب کے لہجے میں ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔ پھر اک دن یہ طوفان اُمڈ پڑا۔ مسعود اپنے کمرے میں بیٹھا پی رہا تھا۔ امتیاز صاحب نے دیکھ لیا۔ برداشت نہ کر سکے اور کمرے میں گھس گئے۔ مسعود نے اک نگاہ ان پر ڈالی اور گلاس منہ سے لگا لیا۔
"ناخلف نامراد۔ اب تیری نگاہ میں میری بھی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی۔ کیا چاہتا ہے آخر اب کیوں دیوداس بن گیا ہے؟ کیا غم ہے تجھے؟ تو نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ ہم نے یہ بھی تجھ سے نہیں پوچھا کہ اس کا کس خاندان سے تعلق ہے؟ ہم نے اسے اپنا لیا لیکن۔"
"بھوت بھوت۔ بچاؤ، بچاؤ۔" مسعود کے حلق سے ایک بھیانک آواز نکلی اور وہ کمرے میں اچھل کود مچانے لگا۔ اس نے شوپیس توڑ ڈالے۔ وہ حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ یہ ہنگامہ سن کر رابعہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو انہوں نے مسعود کو ایک میز پر چڑھے ہوئے پایا۔
"مسعود! میرے بچے یہ سب......" ان کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا تھا کہ مسعود نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ رابعہ بیگم اس کی لپیٹ میں آ کر بری طرح نیچے گری تھیں۔ مسعود نے ان کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور ان کا منہ نوچ کر رکھ دیا۔ خود امتیاز صاحب، رابعہ بیگم کو اس سے چھڑانے میں ناکام ہو گئے تھے۔ مجبوراً انہوں نے پتھر کا ایک گلدان اُٹھا کر مسعود کے سر پر دے مارا تب کہیں جا کر مسعود سے رابعہ بیگم کا پیچھا چھوٹا لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔

☆......☆......☆

اس حسین و جمیل کوٹھی پر ویرانی چھا گئی تھی۔ جہاں کبھی رات نہیں ہوتی تھی۔ وہاں ہر وقت تاریکی چھائی رہتی۔ مسعود پاگل ہو گیا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے دماغی اسپتال میں داخل تھا لیکن تین بار یہاں سے فرار ہو چکا تھا اور اب اسے زنجیروں میں قید رکھا جاتا تھا۔
مغرور مسعود امتیاز اب لوگوں کے قہقہوں کا شکار بن چکا تھا۔ اب امتیاز علی بھی...... ہمت ہار چکے تھے۔ رابعہ بیگم سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ ایک دن انہوں نے ڈرتے ہوئے امتیاز علی سے کہا۔
"امتیاز! اب کیا ہوگا؟"
"یہ سوال خود سے کرو رابعہ بیگم!"
"میں نہیں سمجھی؟"
"کاش! تم میں سمجھنے کی صلاحیت ہوتی۔ کاش! تم اسی وقت سمجھ جاتیں جب میں نے تمہیں سمجھا دیا تھا۔ تمہارے اندر غرور بول رہا تھا۔ رابعہ بیگم! یاد ہے تم نے بڑے غرور سے کہا تھا کہ وہ میرا بیٹا ہے اور میں نے تم سے کہا تھا کہ بات اپنی حد تک رکھو کسی دوسرے خاندان کی عزت نہ گنواؤ۔"
"ہاں یاد ہے۔" رابعہ بیگم نے سسکتے ہوئے کہا۔
"مجھے تو حیرت تھی رابعہ بیگم کہ قدرت نے ہمیں کیوں معاف کر دیا؟ مظلوم رخشندہ کی آہیں خدا نے کیوں فراموش کر دیں؟ وہ اس کی موت کے کھیل کو کیوں بھول گئی؟ جو تم نے کھیلا تھا۔ یہ میری بھول تھی رابعہ بیگم! خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ یہ سزا ہمارا مقدر بن چکی تھی۔ دیکھ لو ہماری کیفیت احمد علی سے مختلف نہیں ہے۔ لوگ میرے بارے میں چپکے چپکے گفتگو کرتے ہیں۔ مجھ پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ کون جانے، کون کیا سمجھتا ہے۔ مسعود نے جو کچھ کیا۔ اس کی سزا بھگت رہا ہے، وہ، بے شک اس بدنصیب کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔"
"خدا کے لیے ایسا مت کہو۔"
"میرے کہنے نا کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ رابعہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔" امتیاز صاحب بولے۔
"میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔"
"کہہ دو۔ کہہ ڈالو۔"
"کیوں نہ ہم اسے علاج کے لیے ملک سے باہر لے چلیں دلہن کو بھی ساتھ لے جائیں گے ممکن ہے......"
"کچھ نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں کچھ نہ ہوگا۔ یہ خدا کی گرفت ہے۔ اس سے کون چھڑا سکتا ہے۔ اس کمینہ فطرت کو۔ تاہم دلہن سے مشورہ کر لو۔ میں اس کے لیے افسردہ ہوں۔"
"میری فکر نہ کریں آپ لوگ۔ میرا مشن پورا ہو چکا ہے۔ وہ ہو چکا ہے جو میں چاہتی تھی۔" دروازے سے

رباب کی آواز آئی اور وہ دونوں چونک کر دیکھنے لگے۔
''ہم سمجھے نہیں دلہن!'' امتیاز صاحب بولے۔
''ہاں، میرا مشن پورا ہو چکا ہے۔ میں جس مقصد کے لیے یہاں آئی تھی۔ اسے حاصل کر چکی ہوں اب میں آپ سے اجازت چاہتی ہوں۔''
''مشن؟ کیا مقصد؟'' امتیاز صاحب بولے۔
رباب کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
''ہاں۔ آیئے۔ مجھے میری منزل تک چھوڑ دیجیے۔''
''کون سی منزل؟ تم کیا کہہ رہی ہوں؟'' امتیاز صاحب پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔
''آپ دونوں میرے ساتھ آیئے۔'' رباب نے کہا اور دونوں ہی مشینی انداز میں اُٹھ گئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے اعصاب رباب کی آواز میں جکڑ گئے ہوں۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں ایک کار میں جا رہے تھے۔ رباب امتیاز علی کو راستہ بتاتی جا رہی تھی اور وہ کسی معمول کی مانند اس کے احکامات پر عمل کر رہے تھے۔
کار برق رفتاری سے فاصلے طے کر رہی تھی اور پھر ایک قبرستان کے سامنے رک گئی۔
''آیئے!'''' رباب بولی اور دونوں جیسے ہوش میں آ گئے۔ ''یہ تو ہمیں کہاں لے آئی رباب بیٹی! یہ تو قبرستان ہے۔ رابعہ بیگم گھبرا کر بولیں۔
''یہیں میرا گھر ہے۔ یہیں سے اُٹھ کر میں اپنے مشن پر گئی۔ اگر آپ رخشندہ کے جنازے میں شریک ہوئے ہوتے امتیاز صاحب! تو یہ جگہ آپ کے لیے اجنبی نہ ہوتی۔''
''مم۔ میں نہیں سمجھا رباب!'' امتیاز علی گھٹی گھٹی آواز میں بولے۔
''آپ کب سمجھتے تھے امتیاز صاحب! آپ نے تو پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ آپ کے آنے کے بعد اس بدنصیب شخص پر کیا گزری جو آپ کے مذاق کا شکار ہوا تھا۔ آپ کو کیا معلوم کہ احمد علی غریب نے کس طرح چوری چھپے اپنی رخشندہ کو دفن کیا تھا۔ آپ نے کب توجہ دی تھی۔ اس مظلوم خاندان پر۔ آیئے میں آپ کو رخشندہ کی قبر دکھاؤں۔''
''رخشندہ کی۔؟'' امتیاز صاحب خواب کے سے عالم میں بولے۔
''کچھ بھی تو نہیں معلوم آپ کو۔ کون کسی کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ہاں، آپ کو کیا خبر کہ بیٹی کو دفن کرنے کے بعد کس طرح احمد علی نے یہ شہر چھوڑ دیا اور وہ ایک دوسرے شہر چلے گئے۔ آپ کیا جانیں کہ کس طرح رخشندہ کی مظلوم ماں اس کی موت کے ایک ہفتے بعد چل بسی اور ٹھیک چھ ماہ کے بعد احمد علی نے بھی ایک اسپتال میں خون تھوکتے ہوئے جان دے دی۔ وہ غریب اس شہر میں اپنا سب کچھ چھوڑ گئے تھے۔ سب کچھ۔''
رباب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
''احمد علی مر گیا۔ میرا دوست۔ میرا بھائی۔'' امتیاز صاحب رو پڑے۔
''رہنے دیں ان مگر مچھ کے آنسوؤں کو۔ یہ آپ محفوظ رکھیں۔ اب اپنے لخت جگر کے لیے جو ایک دن ہسپتال میں مر جائے گا۔ آپ اسے دنیا کے کسی کونے میں لے جائیں امتیاز صاحب! اسے وہ زندگی دوبارہ نہ مل سکے گی۔ یہی میرا مشن تھا۔ جس کو پورا کرنے کے لیے میں بھٹک رہی تھی۔''
''تم۔ تم کون ہو رباب؟''
''رباب نہیں رخشندہ کہیے مجھے۔ رباب میرا مصنوعی خول تھا۔ میں رخشندہ ہوں۔'' رباب کے چہرے سے ایک نقاب سی سرک گئی اور اب رخشندہ ان کے سامنے تھی۔
رابعہ بیگم چیخ مار کر امتیاز صاحب سے لپٹ گئیں۔ رخشندہ کے بدن سے گوشت آہستہ آہستہ غائب ہوتا جا رہا تھا اور پھر چند لمحات کے بعد وہ ایک استخوانی ڈھانچے میں بدل گئی تھی۔ پھر اس نے جھک کر ایک قبر کے اوپری سرے کو ٹٹولا اور کسی صندوق کی طرح اس کا ڈھکن اُٹھا کر اس میں داخل ہو گئی۔ قبر ہموار ہو گئی تھی۔ رابعہ بیگم کی دلدوز چیخ نے ماحول کو منتشر کر دیا تھا اور امتیاز علی پتھر کے بت کی مانند ساکت کھڑے تھے۔

☆☆......☆☆

وہ مہربان



ممتاز احمد



ایک جن کا قصہ جو انسان کے احسان کا قرض چکاتا رہا

میرا نام زاہد ہے مجھے بچپن سے ہی ٹرین بہت اچھی لگتی ہے کیوں اچھی لگتی ہے اس کی کوئی خاص وجہ تو میں اب تک جان نہیں سکا ہاں ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے وہ یہ کہ وہ ہمارے گھر کے بالکل قریب ریلوے لائن سے گزرتی ہے جس پر سارا دن مختلف اوقات میں ریل گاڑیاں گزرتی تھیں جب کسی ٹرین کے گزرنے کا وقت ہوتا تو میں گھر سے نکل کر ریلوے لائن کے قریب کھڑا ہو جاتا جب ٹرین تیزی سے گرد وغبار اڑاتی تو میں وہیں کھڑا دور جاتی ٹرین کو دیکھتا رہتا اور مجھے ایک انجانی سی خوشی کا احساس ہوتا مجھے ٹرین میں سفر کرنے کا بڑا شوق تھا کچھ تھوڑے بہت سفر کیے بھی مگر ابھی تک لمبا سفر نہ کر سکا تھا۔ زندگی کے شب و روز گزرتے رہے سرکاری اسکول سے سرکاری کالج تک پہنچ گیا چونکہ بہت غربت تھی تو کسی قسم کی عیاشی اور تفریح کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا بس روٹین یہی تھی کہ گھر سے اسکول کالج جانا پھر گھر آ کر پڑھائی میں مگن ہو جانا اور گزرتی ٹرین کو دیکھنا انہی معمولات میں بہت اچھے نمبروں کے ساتھ گریجویشن مکمل کر لیا۔

☆......☆......☆

مزید آگے پڑھنے کے لیے ایم اے کرنے کا سوچ رہا تھا کہ زندگی کے سفر میں پہلے والدہ انتقال کر گئیں پھر دو ماہ بعد والد صاحب جو کہ ایک بزنس مین کے منشی تھے داغ مفارقت دے گئے مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی ہیں میں سب سے بڑا ہوں۔

والدین کی وفات کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری مجھ پر آ گئی تو میں نے مزید پڑھنے کا ارادہ ترک کر کے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد میں نے اسی بزنس مین جس کے پاس میرے والد بطور منشی کام کرتے تھے جا کر درخواست کی کہ جب تک مجھے اچھی یا سرکاری نوکری نہیں مل جاتی کوئی لکھنے پڑھنے کا کام دے دو تاکہ گھر کا چولھا جلتا رہے۔

اس نے ایک عارضی نوکری دے دی ایک دن شام کو کام سے گھر واپس آ رہا تھا سخت سردی تھی جب گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ریلوے لائن پر ایک چھوٹا سا پلا پڑا ہوا ٹھٹھر رہا تھا وہ ایک عجیب شکل کا تھا

میں اس پلے کو گھر لے آیا اس کے قریب آگ جلائی اور اس کو دودھ پلایا روٹی کے چند ٹکڑے کھلائے تو وہ پلا جو نیم جان تھا اس میں زندگی کی رمق دوڑنے لگی اور وہ مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگا اس کی نگاہوں میں تشکر جھلک رہا تھا چند دن وہ ہمارے گھر رہا اور پھر اچانک

غائب ہو گیا۔

کچھ دن گزرے تو فیصل آباد میں ہمارے ایک جاننے والے تھے ان کے بیٹے کی شادی تھی تو انھوں نے ہمیں شادی میں مدعو کیا میں نے اکیلے شادی میں شرکت کا فیصلہ کیا میری بچپن سے ہی ٹرین پر لمبے سفر کی خواہش تھی اب مجھے تھوڑی خوشی ہو رہی تھی چلو بہت لمبا سفر نہ سہی چار گھنٹے کا سفر کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

چنانچہ میں ایک مختصر سا سفری بیگ ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر آ گیا تھوڑی دیر بعد ٹرین آئی تو میں ایک ڈبے میں سوار ہو گیا بہت رش تھا مگر مجھے بیٹھنے کے لیے ایک سیٹ مل گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹرین ایک اسٹیشن پر چند منٹ کے لیے رکی تو ایک صاحب جن کے ساتھ ایک بریف کیس تھا اور تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا، بڑی بڑی مونچھیں سر کے لمبے گھنے سیاہ بال آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک مگر جذبات سے عاری سپاٹ چہرہ اس نے پورے ڈبے میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی مگر کوئی سیٹ خالی نہ تھی کچھ اور مسافر بھی سیٹ نہ ہونے کی وجہ سے کھڑے



ہوئے تھے تو وہ شخص میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اس کی چال ڈھال اور انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بہت زیادہ تھکا ہوا نڈھال ہے مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اپنی سیٹ اسے پیش کر دی کہ وہ میری جگہ بیٹھ جائے تو وہ فوراً میری سیٹ پر بیٹھ گیا اور میں سیٹ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک انتہائی سنجیدہ اور خاموش انسان تھا اس نے صرف گردن کے اشارے سے میرا شکریہ ادا کیا اور آنکھیں موند لیں گاڑی اپنی پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

جب ٹرین فیصل آباد کے قریب ترین پہنچی تو وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور سامان والے اسٹینڈ کے پاس جا کر میرے بیگ کو ہاتھ لگا کر مڑ کر میری طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں ہلکا سا سر ہلایا اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے ڈبے کے دروازے کے قریب پہنچ گیا جیسے ہی ٹرین نے بریک لگائی وہ گاڑی سے اترا اور اگلے ہی لمحہ نظروں سے اوجھل ہو گیا فیصل آباد پہنچ کر میں شادی والے گھر میں پہنچ گیا جب میں نے کپڑے نکالنے کے لیے بیگ کھولا تو دیکھا کہ کپڑوں کے درمیان ایک گہرے رنگ کا گلابی لفافہ پڑا ہوا ہے میں نے حیرانگی سے لفافہ کھولا تو اس میں کافی ساری رقم اور ایک وزیٹنگ کارڈ تھا کارڈ پر ایس اے کلیم مینیجنگ ڈائریکٹر اور نیچے ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا میں بہت حیران اور پریشان ہوا کہ یہ لفافہ بیگ کے اندر کیسے آ گیا جبکہ بیگ کو میں نے لاک کیا ہوا ہے اس وقت تو میں نے زیادہ نہیں سوچا لفافہ بیگ میں واپس رکھ دیا اور شادی کے ہنگاموں میں گم ہو گیا۔

شادی ختم ہوئی میں اگلے دن بذریعہ ٹرین اپنے شہر اور گھر واپس آ گیا اور پھر بیگ سے وہ لفافہ نکال کر رقم اور وزیٹنگ کارڈ پر غور کرنے لگا تو مجھے وہ پراسرار شخص یاد آ گیا کہ جس نے جاتے جاتے میرے بیگ کو ہاتھ لگا کر معنی خیز انداز سے میری طرف دیکھ کر اپنی گردن ہلا کر اشارہ کیا میں بہت حیرانی اور سوچ میں پڑ گیا کہ اس شخص کو کیسے پتا چلا کے یہ میرا بیگ ہے اور دوسرا یہ کہ کس طرح لفافہ بیگ میں ڈالا جبکہ بیگ کو میں نے چھوٹا سا تالا لگایا ہوا تھا رقم اور وزیٹنگ کارڈ کا کیا مقصد تھا......؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

کہ اچانک میرے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا کہ رقم اور کارڈ کہیں نوکری کی طرف تو اشارہ نہیں......؟ اور اگلے ہی دن میرے قدم ریلوے اسٹیشن کی طرف اٹھ پڑے اور چار دن بعد کی سیٹ اور برتھ مل گئی میں نے اپنے تمام کاغذات اور شناختی کارڈ تعلیمی اسناد اور تصاویر وغیرہ اور دیگر وسامان کپڑے وغیرہ بیگ میں ڈال کر اپنی تیاری مکمل کر لی جس بزنس مین کے ہاں میں حساب کتاب کا کام کرتا تھا ان کو کراچی جانے کا بتایا جس پر انھوں نے میرا حساب کتاب کر کے تنخواہ کی مد میں جو رقم بنتی تھی وہ مجھے ادا کی اور میں نے وہ ساری رقم اپنے بہن بھائی کے حوالے کی اور بتایا کہ نوکری کے لیے کراچی جا رہا ہوں اور پھر بذریعہ ٹرین کراچی پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

زندگی میں پہلی بار ایک بہت بڑے شہر میں آیا تھا کراچی کی بڑی بڑی اونچی عمارتیں شاپنگ مال اور چوبیس گھنٹے کا ٹرین کا سفر مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا ٹرین شام کے وقت کراچی پہنچی تھی چنانچہ رات میں نے ایک سستے سے ہوٹل میں بسر کی اور اگلی صبح اس ملٹی نیشنل کمپنی میں پہنچ گیا جس کا ایڈریس وزیٹنگ کارڈ پر درج تھا میں سیدھا ایس اے کلیم کے آفس پہنچا ان کے پرسنل سیکریٹری کو کارڈ دکھایا تو اس نے مجھے فوراً ایس اے کلیم مینیجنگ ڈائریکٹر MD کے روم میں بھیج دیا میں نے جا کر وہ وزیٹنگ کارڈ ان کو دیا اور سلام کیا ایم ڈی صاحب نے ایک طائرانہ سی نظر کا کارڈ پر ڈالی اور میرے آنے کا مقصد پوچھا تو بے اختیار میں نے کہا کے سر نوکری کے لیے آیا ہوں حیرت کی بات یہ تھی کہ انھوں نے ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کارڈ مجھے کس نے دیا ایم ڈی صاحب نے انٹرکام پر اپنے سیکریٹری کو بلایا اور اس سے بہت دھیمی آواز میں کوئی بات کی جس پر وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے کیبن میں لے آیا پھر مجھ سے درخواست لکھوا کر میری تصویر لگائی اور تعلیمی اسناد کی فوٹو کاپیاں ساتھ منسلک کیں پھر درخواست پر ایم ڈی صاحب کے آرڈر لگوا کر میرا اپائنٹمنٹ لیٹر تیار کیا اور حیرت انگیز طور پر کوئی

سوال جواب کیے بغیر مجھے نوکری دے دی گئی بلکہ مجھے ایک سنگل روم چھوٹے سے کچن اور باتھ روم والا اپارٹمنٹ بھی رہنے کے لیے دیا گیا جو کہ ایک ساحل سمندر پر واقع تھا۔

مجھے سیلز کے ڈپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا جس کے انچارج جہانزیب صاحب سیلز مینیجر تھے میری خوشی کی دید نہ تھی کہ بیٹھے بیٹھے نوکری مل گئی اور کراچی میں رہنے کے لیے ساحل سمندر پر چھوٹا سا گھر بھی مل گیا کراچی دیکھنے اور ساحل سمندر پر چلنے گھومنے پھرنے کی میری شدید حسرت اور آرزو تھی جو کہ اب پوری ہو چکی تھی۔

میں نے ڈیوٹی جوائن کر لی پہلا ایک مہینہ ٹریننگ دی گئی پھر مجھے روزانہ کمپنی کی مختلف پراڈکٹس کے کارٹن کے ساتھ کراچی سے حیدر آباد جانا ہوتا تھا سامان ٹرین کے luggage بریک میں بک ہوتے تھے حیدر آباد ریلوے اسٹیشن سے وہ سامان کے مختلف کارٹن پارٹیوں تک پہنچا کر اور پے منٹ لے کر میں واپس آ جاتا اور رقم آفس میں جمع کروا دیتا اب میرا ٹرین کے سفر کا شوق بھی پورا ہو جاتا کراچی بھی خوب گھومتا۔ ساحل سمندر کی سیر بھی خوب ہوتی جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی اور میں ہر جمعرات کو مغرب سے عشاء تک حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر حاضری دیتا اور جمعہ کی نماز بھی یہیں ادا کرتا مجھے بے حد سکون ملتا

میری بہت اچھی تنخواہ تھی اور معقول ٹی اے ڈی اے بھی ملتا اور پھر میں ہر ماہ اپنے بہن بھائیوں کو پیسے بذریعہ منی آڈر بھیج دیا کرتا خط و کتابت بھی رہتی بہن بھائی بڑے آرام سے رہ رہے تھے اور تن دہی سے اپنی تعلیم میں مگن تھے میں اپنی ڈیوٹی ایمانداری، دیانت داری اور محنت سے سرانجام دے رہا تھا۔

مجھ پر بھروسا اور اعتماد کیا جانے لگا ایک دن سامان لے کر حیدر آباد گیا اور پے منٹ جو کہ پچاس ہزار روپے وصول کی اور اپنے پرس میں ڈال کر اپنی پاکٹ میں پرس رکھا اور واپسی کے لیے چل پڑا ٹرین آنے میں ابھی پورا ایک گھنٹہ پڑا تھا تو ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے پیدل چل پڑا راستے میں ایک نہر گزرتی تھی جس کو پار کرنے کے لیے پل تو بنا تھا مگر حفاظتی جنگلا نہیں لگا تھا میں جیسے

یادیں

چمک رہی ہے پروں میں اُڑان کی خوشبو
بلا رہی ہے بہت آسمان کی خوشبو
بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو
سُنا کے کوئی کہانی ہمیں سُلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو
عجب وقار تھا سُوکھے سنہرے بالوں میں
اداسیوں کی چمک، زرد لان کی خوشبو
وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اُردو زبان کی خوشبو
عمارتوں کی بلندی پہ کوئی موسم کیا
کہاں سے آ گئی ہے کچے مکان کی خوشبو
گلوں پہ لکھتی ہوئی لا الہ الا اللہ
پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

انتخاب: بشیر بدر

ہی پل سے گزرنے لگا ایکدم میرا پاؤں پھسلا اور میں نہر میں گر پڑا نہر چونکہ زیادہ گہری نہیں تھی اس لیے ڈوبنے سے بچ گیا مگر میرا پرس، جس میں کمپنی کے پچاس ہزار اور میرے کچھ اپنے پیسے بھی تھے وہ نہر میں بہہ گیا میں نہر سے باہر نکلا اگرچہ مجھے کوئی چوٹ نہیں لگی تھی مگر بہت بڑا نقصان ہو گیا تھا کپڑے بھیگ گئے تھے میں پریشانی کے عالم میں ریلوے اسٹیشن پہنچا گرمی کا موسم تھا کپڑے تو سوکھ گئے مگر پرس کا نہر میں بہہ جانا بہت بڑا صدمہ تھا اب اتنی رقم کہاں سے لاؤں گا؟ کمپنی والے میری اس بات کا یقین کبھی نہیں کریں گے کہ رقم گم ہو گئی ہے۔

اسی پریشانی میں تھا کہ ٹرین آ گئی اور میں بوجھل دل سے گاڑی میں سوار ہو گیا اور ایک سنگل سیٹ پر افسردہ بیٹھ گیا گاڑی چل پڑی میں سوچوں کے سمندر میں غرق تھا جب گاڑی کوٹری اسٹیشن کے قریب پہنچی تو مجھے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہی پُراسرار شخص کھڑا تھا میں حیرت سے اس کو

دیکھنے لگ گیا تو اس نے میرا گمشدہ پرس جو کہ نہر میں گر گیا تھا مجھے پکڑایا اور ڈبے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا گاڑی کوٹری اسٹیشن پر کھڑی ہو چکی تھی اور وہ فوراً ٹرین سے نیچے اترا اور اگلے لمحے غائب ہو گیا جب میں نے پرس کھول کر دیکھا جو کہ خشک حالت میں تھا اور اس میں پچاس ہزار کے ساتھ میری رقم بھی موجود تھی اور ذرا بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ پانی میں گرا تھا۔

میں شدید حیرت میں ڈوبا رہا اور گاڑی کراچی پہنچ گئی میں نے جا کر وہ رقم فوراً کمپنی کے اکاؤنٹ میں جمع کروائی اور گھر آ کر شکرانے کے نفل ادا کیے کچھ دن گزرے تو بھائی کا خط آیا کہ اس کا گریجویشن کا رزلٹ آ گیا ہے جو کہ بہت اعلیٰ نمبروں سے اس نے پاس کیا تھا وہ MBA میں ایڈمیشن لینا چاہتا تھا۔ اس وقت MBA کلاسز لاہور میں ہوا کرتی تھیں مزید برآں بھائی نے یہ بھی لکھا تھا کہ مالک مکان اب مکان خالی کرنے کا کہہ رہا ہے میں نے بھائی کو جوابی خط لکھا کہ مالک مکان سے دو ماہ کا وقت لے لو اور لاہور جا کر یونیورسٹی میں ایڈمیشن اپلائی کرو اور ساتھ ہی داخلے اور خرچ کے لیے رقم بھی منی آڈر کر دی۔

ہماری کمپنی کی ایک شاخ لاہور میں بھی تھی اب میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آنے لگا کہ اگر میری ٹرانسفر لاہور ہو جائے تو میں اپنے بہن بھائیوں کو لاہور لے آؤں گا اور اپنے ساتھ رکھوں گا مگر لاہور میں کوئی سیٹ بھی خالی نہ تھی اور نہ ہی میرے ٹرانسفر کا کوئی جواز تھا مجھے جاب کرتے ہوئے پورا ایک سال ہو چکا تھا سال بعد کمپنی کے ایم۔ڈی صاحب کو تمام ملازمین اور متعلقہ شعبہ جات کی رپورٹ پیش کی جاتی تھی۔ جس پر ایم ڈی صاحب کمپنی ملازمین کو بونس دیا کرتے تھے میری رپورٹ بہت شاندار تھی ادھر لاہور والی برانچ مسلسل خسارے میں کی جا رہی تھی وجہ یہ تھی کہ وہاں بہت گھپلے ہو رہے تھے مگر پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس قسم کے گھپلے ہو رہے ہیں اور کون کون ان میں ملوث ہے۔

اگلے دن جمعرات تھی میں نے مغرب کی اور عشاء کی نماز حضرت عبداللہ شاہ کے مزار پر ادا کی حاضری دی جب واپسی کے لیے دربار سے باہر نکلا تو میرا سامنا اسی شخص سے ہوا اس نے مجھے فوراً ایک گہرے رنگ کا گلابی لفافہ پکڑایا اور لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا میں نے گھر آ کر وہ لفافہ کھولا تو اس میں ایک کاغذ پر لاہور برانچ میں ہونے والے تمام گھپلوں کی تفصیل لکھی تھی اور جو جو ملازمین اس میں ملوث تھے ان کے نام لکھے تھے اور گھپلے کس طرح کیے جاتے ہیں سب کا طریقہ کار لکھا تھا ہفتہ والے دن کمپنی کا سالانہ فنکشن ہونا تھا جس میں ملازمین اور کمپنی کے افسران شامل ہوتے اور اسی فنکشن یا پارٹی میں بونس کا اعلان بھی کیا جاتا تھا حسب معمول پارٹی ہوئی بونس کا اعلان بھی کیا گیا تو وہیں پر لاہور میں ہونے والے گھپلے بھی زیر بحث آئے پارٹی میں ایم ڈی صاحب نے میری کارکردگی کو سراہا تو میں نے تجویز دی اگر مجھے لاہور ٹرانسفر کر دیا جائے تو ایک ماہ کے اندر تمام گھپلوں کا سراغ لگا سکتا ہوں۔

اور یہ کام میں نے چیلنج کے طور پر کرنے کا اعلان کیا تو ایم۔ڈی صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد میری ٹرانسفر لاہور برانچ میں کر دی چنانچہ میں نے اگلے روز اپنا سامان سمیٹا اور بذریعہ ٹرین لاہور پہنچ کر کمپنی کی برانچ میں اپنی Arrival Report دی گھپلے پکڑنے کے ٹاسک کو انتہائی رازداری میں خفیہ رکھا گیا میری ٹرانسفر کو ایک روٹین کی ٹرانسفر سمجھا گیا میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور اپنے آبائی شہر بہن بھائیوں سے ملنے چلا گیا پورے ایک سال بعد گھر آیا تھا سب بہت خوش ہوئے میں ڈھیر سارے تحفے تحائف بہن بھائیوں کے لیے لایا تھا۔

میری ٹرانسفر تو لاہور ہو چکی تھی میں نے سب سے پہلے رہائش کے لیے لاہور میں مکان تلاش کیا پھر بہن بھائیوں کو لاہور والے گھر میں شفٹ کیا دیکھتے ہی دیکھتے ایک ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا چونکہ گھپلوں کی مکمل تفصیل میرے پاس پہلے سے ہی موجود تھی جو کہ اس پراسرار شخص نے مجھے دی تھی تو میں نے تمام معاملات کا جائزہ لے کر ایک خفیہ رپورٹ ایم ڈی صاحب کو ارسال کر دی جس کی روشنی میں کمپنی کے افسران نے لاہور آ کر مکمل تحقیق اور چھان بین کی تمام امور حساب کتاب سامنے آ گیا جس کے نتیجے میں تمام بددیانت، کرپٹ

اور کام چور ملازمین کو ملازمت سے نکال دیا گیا۔
زیادہ سنگین نوعیت کے گھپلوں میں ملوث لوگوں کے خلاف فوجداری مقدمات بھی بنا دیے گئے۔
چونکہ میری بھیجی ہوئی رپورٹ سو فیصد درست تھی اور اسی کے نتیجے میں یہ ساری کاروائی عمل میں آئی تھی تو مجھے سیل میں سے اسسٹنٹ سیل مینیجر بنا دیا گیا مجھے تین بونس دیے گئے تنخواہ بھی بڑھا دی گئی یہ ملٹی نیشنل کمپنی بہت ساری مصنوعات تیار کرتی تھی جن میں زیادہ تر گھریلو استعمال کی اشیاء مثلاً نہانے والا صابن، چائے کی پتی، شیمپو کپڑے دھونے والا صابن وغیرہ وغیرہ تو ہمیں ہیڈ آفس کراچی سے ان اشیاء کی سیل بڑھانے کا ٹاسک دیا گیا جس کے نتیجے میں میں نے لاہور اور لاہور سے باہر وزٹ کرنا شروع کر دیا۔
ایک بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ہماری کمپنی کی مصنوعات کو خریدنے کے لیے کوئی تیار ہی نہ ہوتا وجہ یہ بتائی گئی کے ہماری کمپنی کی مصنوعات انتہائی ناقص ہیں جنکی سیل مارکیٹ میں نہ ہونے کے برابر ہے حالانکہ ہماری کمپنی کی مصنوعات بہت اعلیٰ درجے کی تھیں تو پھر ایسا کیوں ہو رہا تھا......؟
یہ صورت حال بہت پریشان کن تھی اس روز جمعرات کا دن تھا میں نے حضرت علی ھجویری داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دی نماز مغرب ادا کی تو وہیں پر وہ پر اسرار شخص مجھے نظر آیا اور اس نے مجھے لفافہ پکڑایا اور اگلے ہی لمحے نظروں سے اوجھل ہو گیا میں نے گھر آ کر لفافہ کھولا تو ایک کاغذ پر تفصیل درج تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ جعلی اور ناقص دو نمبر مصنوعات پر ہماری کمپنی کی مہر لگا کر مارکیٹ میں فروخت کیا جا رہا ہے اور جو لوگ اس مذموم دھندے میں ملوث تھے ان کی نشاندہی کے ساتھ جہاں یہ گھٹیا میٹریل تیار ہوتا تھا اس کا بھی پورا محل وقوع اور دیگر تفصیل موجود تھی
خیر اگلے روز میں نے اللہ کا نام لے کر کراچی ایم۔ڈی صاحب کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو اگلے روز ایم۔ڈی صاحب خود دیگر افسران کے ہمراہ بذریعہ جہاز لاہور پہنچے اور اعلیٰ حکام سے رابطے کے بعد پولیس کی مدد لی گئی اور کامیاب چھاپے کے بعد وہ تمام لوگ گرفتار کر لیے گئے تمام جعلی مصنوعات برآمد کر لی گئی اور نئی وی اخبار میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی جس کے نتیجے میں کمپنی کی ساکھ بحال ہوئی اور پھر مصنوعات کی سیل بڑھ گئی۔
ایم۔ڈی صاحب نے مجھے بہت سراہا مجھ سے بہت خوش ہوئے مجھے انعام دیا گیا اور سیلز مینیجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اب مجھے اس پر اسرار شخص کی کھوج لگ گئی کہ وہ کون ہے، جس کی مدد سے مجھے نوکری ملی اور دیگر معاملات بھی سامنے آئے جہاں میری ترقی ہوئی عزت، مقام اور مرتبے میں اضافہ ہوا اور کمپنی کو بھی بہت مالی فوائد حاصل ہوئے میں نے ارادہ کر لیا اب اگر وہ پر اسرار شخص ملا تو اس کا ہاتھ یا بازو مضبوطی سے پکڑ لوں گا اور اس سے اس کی حقیقت پوچھوں گا کہ وہ مجھ پر اتنا مہرباں کیوں ہے......؟
مگر میرے اس ارادے کے بعد وہ مجھے پھر نہ ملا مگر ہوا اس یہ کہ جب کوئی اہم واقعہ ہونا ہوتا تو مجھے گہرے گلابی رنگ کا لفافہ گھر میں مل جاتا وہ اس طرح کہ کبھی ڈاک کے ذریعے موصول ہو جاتا اور کبھی گھر آ کر میں دروازہ کھولتا تو وہ لفافہ پڑا ہوتا جس میں تمام تفصیل درج ہوتی اسی طرح کچھ لوگ ہماری کمپنی کے آفس اور فیکٹری کو آگ لگانا چاہتے تھے تو اس کی اطلاع بھی مجھے گہرے رنگ کے گلابی لفافے کے ذریعہ ملی تو بروقت اقدامات سے وہ شر پسند گرفتار ہو گئے اور ہمارا لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہونے سے بچ گیا۔
سارے بہن بھائیوں کی شادی کے بعد میں نے بھی اپنا گھر بسا لیا
اللہ رب العزت نے اولاد کی نعمت اور رحمت سے نوازا ہے زندگی بہت پرسکون گزر رہی ہے مگر آج تک اس پر اسرار شخص کی حقیقت کا پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کون تھا بہت غور کرتا ہوں سوچتا ہوں مگر یہ گتھی سلجھ ہی نہیں پائی اور یہ معمہ حل نہ ہو سکا۔
ہاں ایک بزرگ کی وساطت سے اتنا پتا چلا ہے کہ جس پلے کو ریلوے لائن سے اٹھا کر لایا تھا اس کا تعلق جنات کی مخلوق سے تھا مگر اس پر اسرار شخص کی حقیقت کا پتہ آج تک نہیں چل سکا کہ وہ کون تھا؟
☆☆......☆☆

مانو یا نہ مانو!



مور شاہد حسین



خوف واذیت میں ڈوبی ایک داستان

یہ ایک حقیقت ہے جو برسوں پہلے مجھ پہ گزری تھی میں نے اس زندگی کی ایک رات تنہا، اکیلے قبرستان میں گزاری تھی۔ اس رات کے کسی بھی منظر کا خیال آتے ہی آج بھی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس رات میں نے اپنی موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا مگر اللہ اکبر کی صدا نے میری موت کو زندگی میں بدل دیا نہیں تو آج میں شہرخموشاں کے کسی کونے کا حصہ ہوتا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں سیٹھ نواب احمد خان کے فارم پر چوکیدار تھا، جو ہمارے گاؤں سے تقریباً ایک کلومیٹر شمال کی جانب آج بھی قائم ہے۔ گاؤں سے فارم کی جانب ایک ہی راستہ جاتا ہے۔ اس راستے کے دونوں جانب مختلف درخت راستے کی رونق بنے ہوئے ہیں اور بیچ میں بہت قدیم شہرخموشاں بھی ہے۔ قبرستان کے کچھ فاصلے پر پل اور پھر تھوڑے فاصلے پر نواب صاحب کا فارم واقع ہے۔

اس روز موسم کافی خراب تھا۔ صبح سے ہی بارش ہو رہی تھی اور ساتھ ہی زور کی ہوائیں چل رہی تھیں۔ حسب معمول اس دن بھی مغرب کی اذان کے بعد نواب صاحب کی جانب چل پڑا۔ اس وقت رات اپنے پر پھیلا چکی تھی اور آہستہ آہستہ بارش بھی کافی تیز ہو رہی تھی۔ بارش سے بھیگے درخت ہوا کے تیز جھونکوں سے ہولناک شور سے لرز رہے تھے۔ ماحول کافی پراسرار لگ رہا تھا میں اس راستے سے روزانہ آتا جاتا تھا۔ اس لیے بغیر کسی ڈر یا خوف کے منزل کی جانب چلا جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر سامنے کا راستے کا بالکل بیچ بیٹھے بلے پر پڑی جو مجھے ہی گھور رہا تھا۔ میں گھبرا کر رک گیا وہ سیاہ بلا مجھے بے انتہاء بدصورت لگا۔ میرے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی اور پھر میں خوف سے چند قدم پیچھے کھسک گیا وہ بلا مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے کوشش...... کوشش کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے پڑتے محسوس ہوئے پھر میں نے اپنے حوصلہ بحال کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا پوری طاقت سے اُسے رسید کیا تو ایک زوردار دلخراش چیخ بلند ہوئی اس چیخ میں اتنا درد اور کرب تھا کہ میں پوری جان سے لرز گیا چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بہت ہی خوف ناک صورت حال تھی چاروں طرف وحشت ہی وحشت کا سماں تھا۔ کڑی سردی کے باوجود بھی میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

وہ عجیب و غریب خوف ناک آوازیں کبھی مدھم تو کبھی بے انتہاء تیز ہونے لگیں میرے دل و دماغ میں کئی طرح کے وسوسے جنم لے رہے تھے کہ اچانک کہیں سے تین سیاہ بلے وہ بھی کتے کے برابر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر میرے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں اس اچانک مصیبت پر گھبرا گیا میں ان کو اپنے قریب آتا دیکھ کر مزید خوف زدہ ہو گیا۔ وہ میرے بہت ہی قریب پہنچ گئے بھاگتے بھاگتے میں کسی چیز سے ٹکرا کے دھڑام سے زمین پر منہ کے بل گر گیا کہ اس سے پہلے میں خود کو سنبھالتا ان تینوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنے ہاتھ پیر چلائے اور چیختے چلاتے ہوئے خود کو ان سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر میری ہر کوشش ناکام رہی۔ میں ان بلوں سے خود کو بچا نہ سکا وہ مجھے گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جانے لگے، انہوں نے مجھے بری طرح زخمی کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

خوف اور وحشت کے باعث میرا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے قبرستان کے قریب اُگی ہوئی جھاڑیوں میں لے گئے۔ اس وقت میرا سر چکرانے لگا مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ خوف کی وجہ سے مجھ پر کپکپی طاری تھی۔ میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور وہ تینوں سیاہ بلے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بے انتہاء ڈراؤنی شکل کے تھے۔ ان کے پورے جسم پر بڑے بڑے بال تھے جو انتہائی خوف ناک، بدصورت اور بھیانک لگے، ان کی ہیبت دیکھتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ شہر خموشاں میں پھیلے اندھیرے میں پراسرار خاموشی اور تاریکی کا سناٹا تھا۔ قبرستان، اس کی دل دہلا دینے والی تاریکی اور خوفناک ماحول



میں میری نظر سامنے دو کتوں پر پڑی جو ایک دھنسی ہوئی قبر سے لاش کو نکال کر کھا رہے تھے۔ ان کتوں پر میری نظر پڑتے ہی میرے جسم میں کپکپی جاری ہو گئی۔

پھر یکا یک مختلف آوازیں بڑھنے لگیں اور آدم خور کتے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لپکے۔ وہ آدم خور کتے تیز تیز غرانے لگے اور آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہے تھے، شاید وہ مجھے کاٹ کر کھانا چاہتے تھے۔ ان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں قبروں کے اوپر چھلانگیں لگاتا بھاگ کھڑا ہوا مجھے اپنا ہوش تک نہیں تھا۔ میں اندھا دھند بھاگنے لگا رات کی اس تاریکی میں مجھے کچھ صاف نظر نہیں آ رہا تھا ۔کہ میں ایک قبر سے ٹکرا کر پانی سے بھرے کھڈے میں جا گرا۔ وہ بے انتہاء بدبودار پانی تھا بدبودار پانی مجھے کمر تک بھگو رہا تھا۔ اس وقت کتے نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ میں کافی دیر کے بعد سرد اور تاریک رات میں اس بدبودار پانی سے باہر نکلا۔ ایک دم سے پھر کتوں نے دھاوا بول دیا۔ عین اس وقت کہیں دور سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی آواز اس پراسرار ماحول میں گونجی۔ یقیناً فجر کی اذان تھی۔ میں نے ایک دم کثرت سے کلمہ طیبہ اور درود شریف پڑھنا شروع کیا تو کتے عوں عوں کی آوازیں نکالتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

☆......☆......☆

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ خدا کی کرم فرمائی تھی کہ اللہ اکبر کی آواز سنتے ہی خون خوار کتوں نے جان بخشی، نہیں تو شاید میری جان لے لیتے پھر میں نے اپنی پوری ہمت یکجا کی اور بمشکل تکلیف سے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اب میں شہر خموشاں کے داخلی دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا۔ کہ اگلے لمحے کا منظر دیکھ کر مجھے میری سانسیں رکتی ہوئیں محسوس ہوئی۔ نہ جانے کہاں سے یکا یک سانپ، بچھو، اژدھے اپنا بڑا سا پھن پھیلائے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے وہ اپنے خوف ناک منہ کھولے پھنکار رہے تھے۔ اس وقت بالکل غیر ارادی طور پر میں نے آیت الکرسی کا دم اپنے سینے پر کر کے اپنے گرد حصار کر لیا۔ وہ مخلوق میرے چاروں طرف گھومتی پھرتی رہی مگر وہ مخلوق مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی تھی۔ شاید میں انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا میرا یقین تازہ ہوا اور پھر میں کثرت سے آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا تو وہ سارے کے سارے منحوس چہرے کسی چھلاوے کی طرح جانے کہاں غائب ہو گئے ماحول پہ چھائی وحشت ختم ہو گئی۔

☆......☆......☆

لمحہ بہ لمحہ صبح کی۔ کرن آہستہ آہستہ چاروں طرف اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ میرے جسم پر جگہ جگہ ناخنوں کے نشانات تھے۔ اور ان سے خون بھی رس رہا تھا میں زخموں سے چور تھا مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بمشکل مین قدم اٹھاتے اٹھاتے گھر کی جانب چل پڑا اور جب میں گھر پہنچا تو سب گھر والے پریشان ہو گئے۔ پھر انہیں ساری حقیقت سے آگاہ کیا۔

میں اس وقت بخار میں بری طرح مبتلا تھا۔ اپنے ایک کزن کے ہمراہ شہر ڈاکٹر کے کلینک پر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائی دی جسے کھا کر شام تک طبعیت میں کچھ بہتری آئی اس رات کے نجانے کس پہر جب میری آنکھ کھلی تو مجھے سخت حاجت محسوس ہوئی اس وقت میرا پورا بدن بُری طرح تپ رہا تھا مجھے اپنا پورا جسم بہت بھاری لگا میں نے ہمت کر کے باتھ روم جانے کے لیے خود کو تیار کر لیا۔

اس وقت پورا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سردی کے باعث میں کانپ رہا تھا۔ میں نے باتھ روم کی جانب اپنے قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی کے چلنے کی آہٹ پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے چونک نظریں گھمائیں تو میں جہاں تھا وہیں رہ گیا گھر کے پورے صحن میں عجیب و غریب شکل کے لوگ کھڑے نظر آئے۔ ان میں سے چند نے ہیبت ناک شکلیں اختیار کر لیں۔ مجھے یوں لگا مجھے یہ مخلوق کچا کھا جائے گی وہ سب غصے کے عالم میں تھے۔ ان کی آوازوں سے پورے صحن میں شور برپا ہوا شاید وہ کسی بات پر چلا رہے تھے۔ ان کی عجیب غیر مانوس زبان مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی انہیں دیکھ کر میری حالت

غیر ہوتی جا رہی تھی اور پھر میں لڑکھڑا کر گر پڑا مگر بے ہوش نہیں ہوا ان کی آوازیں بخوبی سن رہا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے لمحے ان میں سے چند نے مجھے زمین سے تین چار فٹ اوپر اٹھایا اور پھر زور سے زمین پر پٹک دیا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ موت کو سامنے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جیسے دل سینہ چیر کر باہر نکل پڑے گا۔ میں پہلے تو اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ مگر تب مرنے کے لیے تیار ہو گیا ویسے بھی بچنے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں تھا۔ مجھ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل پا رہی تھی اور نہ ہی میرے جسم میں جان تھی بس آنکھیں تھی جو سارا منظر دیکھ رہی تھیں اور کان عجیب غیر مانوس زبان میں کیگ گئی باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے مار مار کر مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔

سچ کہتے ہیں جسے خدا زندگی بخشے اسے موت بھی نہیں مار سکتی ہے۔ صبح جب گھر والے اٹھے تو مجھے صحن میں بے جان دیکھ کر چیخنے چلانے لگے۔ گھر میں قیامت برپا ہو گئی۔ مجھے کاندھے پر اٹھا کر کمرے میں لایا گیا مجھے تیز بخار چڑھ گیا۔ میرے منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ میری حالت دیکھ کر میرے گھر والے خاصے فکر مند ہو گئے۔

پھر ایک بزرگ کے آستانے پر لے جایا گیا جو گاؤں سے کچھ فاصلے پر دوسرے گاؤں میں ہے۔ ان بزرگ کی کرامات کے قصے پورے علاقے میں مشہور ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضر کیا گیا مجھے اس وقت اپنا ہوش تک نہیں تھا۔ بزرگ نے میرے اردگرد کچھ پڑھ کر دم کیا تو مجھے کچھ آرام سا محسوس ہوا مگر ان کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی انہوں نے فرمایا کہ میں کسی پر اسرار مخلوق کے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں نے انہیں لرزتے لرزتے پوری روداد سنا دی وہ بزرگ مسلسل پڑھائی کیے جا رہے تھے۔

اچانک کمرے میں چیخنے کی آواز بلند ہوئی "حضور یہ قاتل ہے۔ اس نے ہمارے ایک ساتھی کو تکلیف دے کر مارا ہے۔" اس کی آواز پر سب کو حیرانگی ہوئی کیوں کہ وہ آواز جہاں سے آ رہی تھی۔ وہاں کسی ذی روح کا احساس تک نہیں تھا اور اس آواز کا لہجہ بھی کافی عجیب تھا۔

☆......☆......☆

بزرگ باعب، حکم فرما ہوئے "کب اور کیسے؟" بزرگ کمرے کی چھت کے ایک کونے میں گھورتے رہے۔

"حضور کل رات ڈنڈے کی مدد سے اس نے ہمارے ایک ساتھی کو کچل ڈالا ہے" پھر وہی آواز کمرے میں گونجی۔ خوف سے میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میری تو جان نکلی جا رہی تھی۔

تم لوگوں کی وجہ سے اس کے گھر والے کافی پریشان تھے۔ یہ رحمٰن کے بندے عبادت گذار ہیں۔ آئندہ انہیں کسی قسم کی تکلیف دینے کی کوشش بھی نہیں کرو" بزرگ نے دھمکی آمیز لہجے میں فرمایا۔

"لیکن حضور" پھر وہی آواز بلند ہوئی جس میں احتجاج بظاہر تھا۔

بزرگ غصے سے بھڑک اٹھے اور فرمایا کہ "اب اگر اس رحمٰن کے بندے کو کوئی بھی تکلیف دینے کی کوشش کی تو سب کو بھسم کر دوں گا۔" پھر معافی تلافی شروع ہوئی بزرگ کا حکم ہوتے ہی ماحول پر گہری خاموشی چھا گئی اور کمرے سے دھواں سا اڑتا فضا میں نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

بزرگ کافی دیر تک اللہ اکبر کا ورد کرتے رہے پھر تلاوت قرآن شریف شروع کی، پانی پر دم کر کے پانی پلایا اور قوم اجناء کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے تعویذ دیا وہ تعویذ آج بھی میرے گلے میں بندھا ہوا ہے۔

الحمدللہ آج میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پانچ وقت نماز باجماعت پڑھتا ہوں اور قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتا ہوں، اس کے علاوہ درود شریف بھی بکثرت پڑھتا ہوں اور جب بھی کوئی مشکل مصیبت یا پریشانی ہوتی ہے تو میرے لبوں پر بس ایک ہی ورد ہوتا ہے اللہ اکبر...... اللہ اکبر بے شک وہ غفور الرحیم ہے۔

☆......☆......☆

سودائی میرا...



مہر پرویز احمد

ایک دوشیزہ کا قصہ، جس کا حسن اُس کا عذاب بن گیا

اتنی حسین لڑکی کا نظر بد سے محفوظ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ نجمہ ہزاروں میں ایک تھی، جو اسے دیکھتا اس کی سانس ہی رک جاتی۔ چٹا گورا رنگ، غزالی آنکھیں سیاہ گھٹا ٹوپ بال، اس پر قیامت ڈھا دیتے۔ اس کو بھی حسین ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مزید تصدیق راستے میں کھڑے ہونے والے من چلوں نے کر دی تھی۔ حسن کی گھٹا ٹوپ گھٹائیں کھل کر برستی تھیں، جو دیکھنے والوں کے ہوش اڑا دیتی تھیں۔ جب سے اس کو خوبصورت ہونے کا احساس ہوا اس نے زیادہ ہی نخرے دکھانے شروع کر دیے تھے۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتی، ہر کسی کو نخوت سے دیکھتی برادری کا کوئی بھی لڑکا اس کے معیار کا نہ تھا۔

ایک دن عجیب واقعہ ہو گیا یہ بانکی ناری جب سہیلیوں کے ہمراہ پانی بھرنے گئی تو اس کا مٹکا فوراً پانی سے بھر گیا۔ وہ حیران تو ہوئی لیکن سوچا، شاید کسی دوسری لڑکی نے اپنا مٹکا بھرنے کے بجائے اس کا مٹکا بھر دیا ہو بہر حال بات آئی گئی ہو گئی پھر ایک دن وہ سو کر اٹھی تو اپنے سامنے پھلوں کے ڈھیر دیکھ کر حیران رہ گئی۔

پھر یوں ہونے لگا کہ جونہی وہ کسی کام کو ہاتھ لگاتی، وہ فوراً ہو جاتا جھاڑو دینا چاہتی تو لمحوں میں پورا سارا صاف ہو جاتا، آٹا گوندھنے کی دیر ہوتی تو فوراً روٹی سالن تیار ہو جاتا پانی بھرنا کپڑے دھونا بہت آسان ہو گیا تھا۔ جس بھی چیز کی خواہش ہوتی بس شروع کرنے کی دیر ہوتی یہ باتیں کب چھپی رہتی ہیں پورے گاؤں میں شور مچ گیا۔

☆......☆......☆

اب تو اس کو بے ہوشی کے دورے بھی پڑنے لگتے اگر کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا تو پورے گھر کے برتن چکنا چور کر دیے جاتے، کپڑوں کو آگ لگ جاتی، لکڑی کی چار پائیاں توڑ دی جاتیں۔ پھر بڑی منت سماجت سے اس کو مطمئن کیا جاتا تب گھر میں سکون آتا۔ گھر والے ان حالات سے سخت پریشان تھے۔ کئی جگہ سے پانی دم کر کے پلایا گیا، تعویز گنڈے بازوؤں میں باندھے گئے۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہوا بلکہ اس کا غصہ اور شدید ہو جاتا۔

کافی بھاگ دوڑ کے بعد ایک پیر صاحب کا پتہ چلا جو کہ جن نکالنے کے دو ہزار روپے لیتا تھا اس کو لایا گیا۔ جونہی وہ نجمہ کے پاس بیٹھ کر پڑھنے لگا نجمہ نے اس کو گردن سے پکڑا اور سر زمین میں دبا دیا اور اوپر



سے زور لگانے لگی۔ نیچے پیر صاحب کی چیخ و پکار، آہ و بکا جاری تھی۔ بڑی مشکل سے ان کی گردن چھڑائی گئی جونہی پیر صاحب آزاد ہوئے، ننگے پاؤں دروازے کی طرف بھاگے۔ گھر والے آوازیں دیتے رہ گئے پیر صاحب نے تو مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ پورا گاؤں پیر صاحب کی درگت دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا

☆......☆......☆

گاؤں والوں نے نجمہ کے گھر بھی آنا چھوڑ دیا نجمہ کے والد کی گاؤں کے ایک شخص سے لین دین کے معاملے میں تکرار ہوگئی۔ جونہی نجمہ کو پتا چلا وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی اور پھر جب جھگڑا کرنے والا شخص جانوروں کے لیے چارہ کاٹنے کھیتوں میں گیا تو اس کی دو ایکڑ کپاس کی فصل پورے کھیت میں بکھری پڑی تھی۔ اس کو جڑوں سے نکال کر پھینک دیا گیا تھا جب یہ خبر گاؤں میں پہنچی تو پورے گاؤں میں نجمہ کے گھر والوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ اب ہر شخص ان سے جائز بات یا کام کہتے ہوئے بھی ڈرنے لگا۔ بہر حال وقت چلتا رہا۔

اب کسی نے نجمہ کے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ نجمہ کی شادی کر دو۔ کوئی جن نہیں سب فراڈ ہے دراصل وہ شادی کرنا چاہتی ہے۔ شادی ہوگئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دور پار کے رشتہ دار کو قائل کیا گیا جب وہ لوگ رشتہ دیکھنے آئے تو نجمہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ جس گاڑی میں رشتے والے آئے تھے وہ گھر کے باہر کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس سے شعلے اٹھنے لگے۔ وہ لوگ سراسیمہ، پریشان اور ہیجان کا شکار ہوگئے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس گئے۔

نجمہ کے گھر والے سخت کرب کا شکار تھے۔ ان کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون غارت ہوگیا تھا۔

پھر ایک عالم کے بارے میں معلومات ملیں۔ وہ باعمل، باکردار، پاکیزہ خیالات کے مالک، ہمدرد، غمگسار اور بغیر لالچ کے انسانیت کی خدمت کررہے تھے۔ ان کے پاس نجمہ کے گھر والے

گئے۔ تمام حالات گوش گزار کئے اور منت سماجت کرنے لگے عالم صاحب ان لوگوں کی مجبوری دیکھ کر فوراً ان کے ساتھ گاؤں آ گئے۔

جب وہ بزرگ نجمہ کے پاس بیٹھ گئے تو ان کو دیکھتے ہی دیکھتے نجمہ کے تیور بدلنے لگے۔ اول فول بکنے لگی۔ ''میں تم لوگوں کو دیکھ لوں گی، تم کون ہوتے ہو میری زندگی میں دخل دینے والے مجھ سے جو بھی ٹکرایا ریزہ ریزہ ہو گیا تم کو میری طاقت کا اندازہ نہیں، میں تمہیں ابھی بتاتی ہوں۔''

پھر اس دوران صحن میں لوہے کے تار پر ٹنگے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ لوگوں کا جم غفیر تھا وہ یہ سب دیکھ کر بہت حیران پریشان تھے۔ اس دوران عالم صاحب جلال میں آ گئے اور کہا اب میں تم کو کمال دکھاتا ہوں انھوں نے آواز نکالی'' مجھے کھانے کے لیے بھٹے چاہئیں'' کچھ ہی دیر گزری صحن میں بھٹوں کا ڈھیر لگ گیا پھر اس دوران بالوں سے پکڑ کر نجمہ کو جھٹکا دیا اور ایک ڈنڈے سے اس کی پٹائی کرنے لگے اب تو نجمہ زور زور سے چیخیں مارنے لگی اور معافی مانگنے لگی۔ جب مار مار کر عالم صاحب تھک گئے تو گھر والوں کو کہا کہ'' ایک من سرسوں کا تیل لاؤ ایک کڑاہے میں ڈال کر اس کو خوب گرم کرو میں نے اس کو اس گرم تیل میں ڈال کر اس کا تیل نکالنا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ نجمہ عالم صاحب کے پاؤں میں گر گئی اور معافی مانگنے لگی بولی'' آپ جو حکم کریں میں مانوں گی، ساری زندگی اس گاؤں میں دوبارہ نہیں آؤں گی آئندہ کسی انسان کو تنگ نہیں کروں گی اور نہ ہی اس کے پاس رہوں گی۔ آپ جس طرح چاہیں مجھ سے تسلی کر لیں بس مجھ پر ترس کریں اور مجھ کو نہ جلائیں'' اپنی تسلی کر لینے کے بعد عالم صاحب نے اسے معاف کر دیا۔ وہ دن گیا اور آج کا دن آیا نجمہ کو دوبارہ دورہ نہیں پڑا اس کی شادی ہو گئی اور اب وہ اپنے تین بچوں اور خاوند کے ہمراہ خوشحال زندگی گزار رہی ہے۔

☆☆......☆☆☆

حوا کی بیٹیاں



تحریر: نور علی



حسنی اور نوری بچپن کی سہیلیاں تھیں دونوں کے گھر ایک ہی گاؤں، محلے اور ایک ہی گلی میں ساتھ ساتھ تھے وہ اپنے دل کی ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتیں تھیں دونوں بہت ہی چالاک اور مکار تھیں مگر نوری بہت زیادہ گھاگ لڑکی تھی انہیں گاؤں کے ہر گھر کی خبر معلوم ہوتی تھی اور وہ دونوں مزے سے گاؤں کی خبر کو ادھر ادھر پھیلایا کرتیں۔

پیار، محبت، عشق اور چاہت کے نام سے انہیں نفرت تھی نوری اور حسنی کے دل و دماغ میں اور رگ رگ میں بس ایک ہی شوق، جنوں سرایت کر چکا تھا

بس ان کی ایک ہی خواہش تھی اور وہ تھی جادو سیکھنے کی یہ شوق بچپن سے ہی ان میں سما چکا تھا۔

☆......☆......☆

نوری کے والدین وفات پا چکے تھے جبکہ حسنی اپنے ایک بھائی اور ماں کے ساتھ رہتی تھی حسنی کا باپ حسنی کے دنیا میں آنے کے دو سال بعد ہی اس کی ماں کو طلاق دے کر ایک عورت سے نکاح کر کے شہر چلا گیا تھا اور آج جب حسنی 23 سال کی تھی مگر اس کے باپ نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا یوں اس طرح دونوں ہی بہت آزاد تھیں وہ ہر جگہ آزادی سے آیا جایا کرتیں حسنی کا بھائی اس سے تین سال بڑا تھا مگر اس سے یوں ڈرتا تھا جیسے حسنی کوئی چڑیل ہو وہ اسی طرح اس سے خوف کھایا کرتا تھا نوری اور حسنی دونوں میٹرک پاس تھیں۔

ایک دن حسنی نوری کے پاس ایک کاپی لے کر آئی نوری کی آنکھوں کے آگے کچھ لہرایا کیا ہے یہ؟ نوری نے اس چھوٹی سی کتاب کی طرف اشارہ کیا جو حسنی کے ہاتھ میں تھی نوری اب اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں تمہارے لیے یہ تحفہ لے کر آئی ہوں حسنی نے وہ کتاب اس کے ہاتھوں میں پکڑائی وہ وظیفوں والی کاپی تھی اب جنات آپ کے قابو میں نوری نے پہلا صفحہ پلٹا تو لکھا تھا جنات آپ کے روبرو دنیا کا کوئی بھی کام اب مشکل نہیں آپ کی ہر مشکل آسان صرف آدھی رات کا کام ساری زندگی سہل اور آسان۔

☆......☆......☆

جب نوری نے یہ سب پڑھا تو خوشی کے مارے اچھل پڑی اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا وہ دیوانہ وار حسنی کے ہاتھ چومتی جاتی اور قہقہے لگاتی جاتی جنات کو حاضر کرنے کے کئی طریقے لکھے ہوئے تھے مگر سارے کے سارے ہی مشکل تھے مگر وہ دونوں ہر مشکل سے مشکل وظیفہ بھی کرنے کو تیار تھیں بالآخر انہوں نے ایک وظیفہ منتخب کر لیا دونوں نے ہی وہ وظیفہ کرنے کا فیصلہ کیا آدھی رات کے بعد کا وظیفہ تھا۔

بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے حسنی آہستہ آہستہ اٹھی اور بھائی اور ماں کی طرف نظر دوڑائی دونوں نیند کی وادیوں میں گم تھے اس نے اچھی طرح وضو کیا الماری میں سے قرآن شریف اٹھایا چوم کر آنکھوں پھر سینے سے لگایا اور اپنے کمرے میں نیچے آ کر بیٹھ گئی بارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے اس نے سورہ جن پڑھنی شروع کی۔

☆......☆......☆

رات سیاہ تھی ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اندھیرے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا یوں لگتا تھا کہ یہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ ہو نوری دس بجے سے ہی بے چین تھی اسے بارہ بجنے کا انتظار تھا بارہ کے انتظار میں وہ سولی پر ٹنگی ہوئی تھی گھڑی کی سوئی کی ٹک ٹک ہر لمحہ اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی آخر کار وہ لمحہ آ ہی گیا نوری نے جلدی سے وضو کیا اس قدر سناٹے اور اندھیری رات میں اس کا چہرہ بہت دہشت زدہ لگ رہا تھا دل آنے والے لمحوں کے احساس سے ڈر رہا تھا نوری نے قرآن پاک چوم کر کھولا اور سورہ جن پڑھنا شروع کر دی وہ جوں جوں پڑھتی جاتی اس کا دل خوف کے مارے کانپنے لگا۔

اس نے پہلا وظیفہ مکمل کر لیا پھر دوسرا اب تیسرے کے اختتام پر تھی مگر وہ مایوس ہو چکی تھی وظیفہ ختم کر کے اس نے کمرے کی لائٹ بند کی اور اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا ہر طرف خاموشی کا راج تھا ہر طرف کسی وقت بہت دور سے ہی کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی تو سناٹے میں ارتعاش پیدا ہوتا اب نوری سر جھکائے دعا مانگنے لگی دعا ختم کر کے اس نے سر اوپر اٹھایا اس کا منہ دروازے کی جانب تھا اچانک دروازہ آہستہ آہستہ ہلا اور کھلتا چلا گیا اور ایک ہیولا آہستگی سے اندر داخل ہوا اندھیرے میں اس کا چہرہ بہت خوفناک اور بھیانک لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

نوری کا بال بال کانپنے لگا وہ جو خود کو اتنا مضبوط سمجھتی تھی اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگی زبان گنگ ہو چکی تھی وہ اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلی پھر اچانک ہیولے نے چاروں

طرف نظریں گھمانا شروع کردیں اور پھر اچانک دروازے کے ساتھ لگے ہوئے سوئچ بٹن آن کر دیا نوری نے ہیولے کی جانب نہ دیکھا اور چہرہ جھکا دیا مگر لائٹ آن ہونے پر جو ایک دم چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اس کی خالہ بلقیس خانم بہت حیرانگی اور پریشانی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی نوری بیٹا تو اس وقت آدھی رات کو اندر کیا کر رہی ہے؟ نوری کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے ماتم کرے اپنی بے بسی پر اسکا چاہا دل اپنی خالہ کا گلا گھونٹ دے جس نے عین وقت پر رنگ میں بھنگ ڈال دیا بیٹا" میں نے پوچھا تم کیا کر رہی ہو؟ نوری نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ کر قرآن مجید الماری میں رکھ دیا اس کے حلق میں آنسوؤں کی گھٹی نکل گئی۔

بلقیس خانم بہت حیران تھی کہ نوری نے تو کبھی قرآن پاک کو چھوا تک نہیں آج آدھی رات کو قرآن پاک پڑھ رہی اس کا یا پلٹ پر انہیں بہت خوشی ہوئی اور وہ باہر نکل گئیں نوری نے پھر لائٹ بند کی اور اپنی جگہ آکر بیٹھی۔

دوسری طرف حسنی عمل شروع کرتے وقت بہت پر جوش تھی مگر جیسے جیسے اس کا عمل آگے بڑھتا جاتا ویسے ویسے اس کا دل خوف کے شکنجے میں پھنستا جا رہا تھا ماحول میں پُر اسرار خاموشی پھیلی ہوئی تھی حسنی نے عمل مکمل کر کے لائٹ بند کر دی تو اس کا دل خوف کے مارے اچھل کر باہر آنے لگا مارے دہشت کے وہ ادھر اُدھر دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھی ایک انجانا سا خوف اس کے دل میں سرایت کرتا جا رہا تھا اچانک امی کمرے میں داخل ہوگئیں ارے آج کیا بات ہے ابھی تک جاگ رہی ہو۔

☆......☆......☆

حسنی نے کہا سر میں درد ہو رہا تھا اور وہ اپنے بھائی اور ماں کو کوسنے لگی جنہوں نے بروقت اس کا عمل ضائع کروا دیا کیسے جن؟ اور کونسے جن؟

صبح کی سفیدی پھیلتی گئی صبح سے دوپہر ہوگئی حسنی بابستہ ہی دیکھتی رہی کہ نوری اب آئی کہ تب آئی اور اسے اپنی کامیابی کی نوید سنائے گی مگر نوری نے نہ آنا تھا نہ آئی۔

دوسری صبح نوری نے اپنی روداد حسنی کو سنائی اور حسنی سے سنی تو اس کی آنکھوں میں دور تک حیرانی پھیلتی چلی گئی وہ دونوں ہی خود کو بہت بے بس اور لاچار محسوس کرنے لگیں۔

مگر پھر وقت نے اچانک ایسا پلٹا کھایا کہ حسنی اور نوری کی شادیاں ہوگئیں وہ دونوں بیاہ کر ساتھ والے گاؤں میں چلی گئیں دونوں نے بہت ہاتھ پیر مارے (بہت کوشش کی) کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتیں مگر بڑی مشکلوں سے راضی کیا گیا دونوں کے گھر ایک ہی گاؤں کے محلے میں تھے مگر کچھ فاصلے پر۔ دونوں میں دوستی تھی پہلے سے بھی زیادہ۔

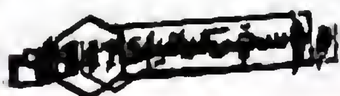
☆......☆......☆

اللہ نے نوری کو دو بیٹے جبکہ حسنی کو ایک بیٹی اور ایک بیٹا دیا اللہ نے انہیں ہر نعمت دی مگر پھر بھی انہوں نے کبھی شکر کا کلمہ نہیں پڑھا انہیں اللہ سے یہی شکوہ رہتا کہ انہیں جادوگر نہیں بنایا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہیں اور بڑے سے بڑا گناہ بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کسی وقت تو میرا بندہ میرے در پہ آئے گا مگر نوری اور حسنی نے کبھی شاذو نادر ہی نماز پڑھی ہوگی۔ وہ جب ملتیں ان کے درمیان اب بھی جادو اور جنات کی باتیں ہوتیں انہیں اور کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی اب بھی ان کی یہی خواہش تھی کہ کسی طرح جادو سیکھ لیں۔

ایک دن حسنی نوری کے گھر آئی اور کہا" میرے گھر کے ساتھ جو بڑا سا پلاٹ خالی پڑا ہے وہاں پر جو ایک کمرہ ہے بڑا سا وہاں ایک بہت بڑا جادوگر آیا ہے چلتی ہو؟

ہاں کیوں نہیں اب دونوں باتیں کرتی ہوئی اس جگہ پہنچ چکی تھیں باہر سائن بورڈ لگایا جا چکا تھا اس پہ لکھا تھا گھریلو نا چاقی، ساس سے جھگڑا، بیرون ملک سفر، پسند کی شادی، کاروبار میں بندش ہر کام سو فیصد گارنٹی کے ساتھ اب 24 گھنٹوں کے اندر نوری نے جب یہ پڑھا تو خوشی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگی



اگلے دو منٹ میں وہ اس کے سامنے تھیں بھاری جسم اور اس پر بھی ایک ہی کپڑا پہنا ہوا تھا پیٹ کی موٹی توند لٹکی ہوئی گلے میں بھاری بھاری مالا ئیں انگوٹھیوں سے بھرے ہوئے ہاتھ نوری اور حسنی اس کا مکمل جائزہ لے چکی تھیں۔

☆......☆......☆

اور نوری تو بہت بے چین تھی اس سے بات کرنے کے لیے مگر اسکے پاس دو آدمی نیچے بیٹھے ہوئے تھے اس کا سر جھکا ہوا تھا مگر ماتھے پہ لگے ہوئے تلک سے واضح پتا چلتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہے وہ اپنی کالی آنکھیں چاروں طرف گھما رہا تھا اس کے پاس ہی تعویز لکھنے والا پیڈ اور پوائنٹر پڑا تھا جب اسکی نظر ان دونوں پر پڑی تو وہ اٹھ کر آ گیا وہ دونوں اس کے پاس بیٹھ گئیں دونوں کی ہی زبان گنگ، اس کا چہرہ اتنا مکروہ اور غلیظ تھا وہ شیطانی نظروں سے جب ان کی جانب ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔

کیا کام ہے تم کو؟ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ دونوں ہی خاموش، اسکا چہرہ ہی اتنا بھیانک کرخت اور رعب دار تھا کہ ان سے کچھ بھی نہ بولا جا رہا تھا۔

عامل صاحب ہم نے ...... ہم دونوں جادو سیکھنا چاہتی ہیں ہمیں بچپن سے ہی شوق اور جنون ہے مگر ہمارا یہ شوق......

تم کیا کر سکتی ہو عامل جادوگر ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا جی جو آپ آپ کہیں گے ہم وہ کریں گے۔

اچھا مثال کے طور پر ''اگر تمہیں کسی کو قتل کرنا پڑے تو'' وہ ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

نن...... نہیں ہم نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا۔

پھر جاؤ یہاں سے تم جادو نہیں سیکھ سکتیں عامل غضب ناک آواز میں بولا اس کی آوز میں بادلوں جیسی گرج تھی اور آنکھوں میں بجلیوں جیسی چمک تھی حسنی اور نوری لرز کر رہ گئیں۔

☆......☆......☆

نوری حسنی کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے گڑگڑا کر بولی آپ ہمیں معاف کریں آپ جو کچھ کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔

ٹھیک ہے تم آج رات بارہ بجے میرے آستانے پر آ جانا۔

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا اس کے منہ سے بدبو کے اٹھنے والے بھبکے سے حسنی اور نوری کا سانس لینا محال ہو رہا تھا پھر وہ دونوں اٹھ کر آ گئیں اب انہیں رات بارہ بجے کا انتظار تھا نوری کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا حسنی بھی بہت خوش تھی کیوں کہ اب انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ جادو سیکھ لیں گی جلد ہی۔

رات کی پُر ہول تاریکی ہر سمت چھائی جا رہی تھی ہر طرف دہشت ناک سناٹے کا راج تھا ہر طرف اندھیرا رقص کر رہا تھا گاؤں کے آوارہ کتے کسی وقت بھونکتے تو ماحول میں ارتعاش پیدا ہوتا۔

نوری اور حسنی خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئیں دونوں چلتی ہوئی عامل پرکاش جادوگر کے آستانے پر پہنچ گئیں لگتا تھا وہ ان دونوں کا ہی منتظر تھا انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اندھیرے میں اس کا چہرہ اور بھی زیادہ ڈراؤنا اور دہشتناک لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

مجھے پتا تھا تم ضرور آؤ گی اور بھگوان کی کرپا سے تم ضرور جادوگرنی بن جاؤ گی مگر اس کے لیے تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا ورنہ ابھی بھی ٹائم ہے تم جا سکتی ہو۔

نن...... نہیں پرکاش جی حسنی جلدی سے بولی۔

''آپ ہمیں سکھائیں'' نوری بولی تو جادوگر نے کہا ''ہاں آؤ ادھر میرے پاس'' حسنی اور نوری اس کے پاس سامنے جا کر بیٹھ گئیں۔

اب تم دونوں میری ہو ٹھیک کہا نا۔ جی دونوں نے بیک زبان بولیں۔

کل مجھے ایک دل چاہیے

اچھا کس کا میرا یا حسنی کا؟ نوری نے پوچھا۔

ایک بچے کا اب جاؤ باقی کام بعد میں کئی دن کی مشقت کے بعد آخر کار ایک سراغ مل ہی گیا جہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی دونوں نے مہارت سے بچہ

چرا کر جادوگر کے آستانے پر پہنچا دیا جسے وہ ایک ہی منٹ میں چبا گیا جادوگر نے کہا اب اسکا لاشہ قبرستان میں دفنا دو وہ انہیں روز ہی قلم کاغذ پکڑا کر کوئی منتر سکھاتا رہتا ان کے پلے کچھ نہ پڑ رہا تھا بلکہ جادوگر اپنا مقصد پورا کرتا رہا دو ماہ ہوگئے تھے مگر جادو کا انہیں کوئی گر نہ سکھایا اس دوران انہوں نے کئی بچے مار کر جادو گر کا نوالہ بنا دیا۔

گاؤں میں کہرام برپا تھا روز بچے غائب ہونے لگے تو انہیں پکڑے جانے کے ڈر سے جادوگر انہیں کچھ ایسا پھونک کر بھیجتا جس سے وہ کسی کو نظر نہیں آتی اب جادوگر کہتا ہسپتال سے بچے اٹھا کر لاؤ حسنی اور نوری دونوں جانور بن چکی تھیں۔

☆......☆......☆

آدھی رات کے بعد کا وقت تھا نوری اور حسنی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گردونواح سے بے خبر قبرستان چلی آ رہی تھیں گاؤں کے عام لوگ اس وقت گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے گورکن کھلے آسمان تلے زمین پر ہی کپڑا بچھائے گہری نیند میں تھا۔

قبرستان میں ہر طرف وحشت کا سماں تھا نوری کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا تھا جس کا ایک کونہ حسنی نے پکڑ رکھا تھا وہ قبروں کو پھلانگتی ہوئی آ رہی تھی آخری آرام گاہ کے مسافر یہ کب جانتے ہیں کہ دنیا والے ان کی قبروں اور میتوں کے ساتھ کیسی کیسی بے حرمتیاں کرتے ہیں۔

اب وہ اپنی مخصوص قبر کے پاس آ کر وہاں رک گئیں قبر پر تازہ گلاب کی پتیاں پڑی ہوئی تھیں قبر گیلی تھی ابھی اس کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ دو ظالم عورتیں اپنے ظلم کا نشانہ بنانے پہنچ گئیں دونوں نے تھیلے میں سے کھرپے نکال لیے اور قبر کھودنا شروع کر دی آہستہ آہستہ مٹی ہٹاتی جاتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ادھر ادھر دیکھ لیتی کہ انہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا پھر انہوں نے قبر کی سلیں ہٹا دیں۔

☆......☆......☆

حسنی اور نوری قبر میں اتر گئیں اور میت کو اٹھا کر باہر زمین پر رکھ دیا حسنی نے جلدی سے کفن کو کھولا اور سینے سے کپڑا ہٹا کر ایک خنجر دل کی سائیڈ پر مارا پھر چھری کی مدد سے دل کو چاروں طرف سے کاٹ کر ایک شاپر میں ڈال دیا اور کفن ٹھیک کیے بغیر زور سے اندر قبر میں دھکیل دیا پھر نوری نے ایک ایک کر کے تمام سلیں رکھنی شروع کیں ابھی اس نے کچھ سلیں ہی رکھیں تھیں کہ وہ ہو گیا جس کا کبھی حسنی اور نوری نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔

اچانک قبر پر رکھی ہوئی سلیں اڑیں اور فضا میں لہرا کر دور جا گریں اور ایک کالے رنگ کا کتا قبر سے نکلا تیز نوکیلے دانت کالا سیاہ رنگ آنکھیں چمکتی ہوئی زبان ساری باہر نکلی ہوئی اس سے پہلے کہ نوری اور حسنی کے حواس گم ہوتے اس سے پہلے کہ ان کے جسموں پر سنسنی دوڑتی ان کے دل دہلتے کتا جھپٹ کر نوری کے اوپر چڑھا اور پھر دوسرا کتا نکلا اور حسنی پر جھپٹا اور پھر تیسرا کتا نکلا اور قبرستان کا گیٹ پار کر گیا۔

☆......☆......☆

حسنی اور نوری چیخنا چاہتیں مگر ان کی چیخ نہ نکلتی وہ اپنے آپ کو چھڑانا چاہتیں مگر وہ تو قدرت کے شکنجے میں جکڑ چکیں تھیں کتے نے تب تک نہ چھوڑا جب تک ان کے جسم پر ذرا سا گوشت تھا ان کا ڈھانچہ رہ گیا۔

صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا حسنی اور نوری گھر سے غائب تھیں بہت تلاش کیا مگر جب لوگ قبرستان سے گزرے اور انہوں نے دیکھا کہ قبر کھلی ہوئی تھی پاس ہی کچھ اوزار اور دو ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے انہیں اٹھا لیا گیا حسنی اور نوری کے شوہر بھی ان کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ کسی طور بھی ماننے کو تیار نہ تھے کہ یہ ہڈیوں کے ڈھانچے ان کی بیویوں کے ہیں مگر آج تک یہ گاؤں والے ان دو ڈھانچوں کا معمہ حل نہیں کر سکے۔

کہتے ہیں کہ اللہ ظالم کی رسی کو ضرور دراز کرتے ہیں مگر جب اچانک کھینچتے ہیں تو ظالم کے سارے کس بل آپ ہی آپ نکل آتے ہیں۔

عورت کا ظاہر، باطن اتنا بھیانک ہے؟ یہ حوا کی بیٹیاں کس راستے پر چل نکلیں ہیں؟۔

☆......☆......☆

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ "ناگن۔" آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر:12

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پرداوا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آجائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے



ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔ وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو ناگن والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ”ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔“ شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔

مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کرتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلکرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ سامری، شکنتلا، بلکرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ان کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بھی بن چکی تھی۔ شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔ شکنتلا خسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو نرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شکران اور سامری تینوں گرو نرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو نرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرو نرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چھٹکارے سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔ ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا خسکران۔ پریہ کو پتا تھا گرو نرائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک خسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرو نرائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو نرائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کا رحیکا کو اپنی سہاگا کے لیے پکارتا ہے، گرو نرائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گرو نرائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی

ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی گگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چنکار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چنکار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوئی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔ شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پا کر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔

دلاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری دلاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کر دے گا۔ پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرنا۔ پریہ حسکران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز حسکران شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بلگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر بلگرام بھی بے بسی کی موت مارا جاتا ہے۔ شکنتلا کو چنکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی گگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چنکار شکنتلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں گگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکنتلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ گگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔ سپیرا کرونڈیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔ کوٹھاری دلاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ دلاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد دلاور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی لگتی تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلانے لگتی ہے۔ دلاور اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے، اور دلاور کے ساتھ اپنی شکتی کے ذریعے ایک بنجر اور بیابان علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس دوشیزہ کو ایک چبوترے پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے گڑگڑانے لگتی ہے۔

دلاور کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری غصے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جنتر منتر میں مشغول ہو جاتا ہے، تب ایک نیلا شعلہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے جس کے ساتھ دھواں سا تھا، وہ دھواں جو کہ حسکران جن تھا، آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوٹھاری ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت بڑی شکتی بن گیا ہے، ایک جن اس کے قابو میں آ گیا ہے جو اس کے سارے کام کرے گا۔ کوٹھاری اس سارے عمل کے بعد سامان سمیت کر اٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ راجہ ہری داس کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ راجہ ہری داس عیاش ہونے کے باوجود ایک رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے جادوگر اور جادوگرنیوں کے خلاف سخت قانون بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے پوری راجدھانی میں جادو ٹونے کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کئی بار اس جرم میں گرفتار رہا تھا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے ہری داس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی دیے گئے تھے۔ ہری داس کو کوٹھاری کے تھیلے سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جا رہا تھا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ راجہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں حسکران جن موجود تھا جو بوتل میں بند تھا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ حسکران کوٹھاری کو آزاد کروا دیتا ہے اور وہ اسے پوری ریاست کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر گگن شکنتلا کے متعلق سوچتا ہے کہ شکنتلا کو کیسے اس چڑیل کا پتا چلا اور کیسے اسے ختم کر دیا۔ شکنتلا گگن سے رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کے پاس ملنے کے لیے کہتی ہے۔ شکنتلا کو خون کی پیاس بے تاب کرتی ہے، لیکن گگن کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ گگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا


WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ پنچایت میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں نئے آنے والوں کو علاقہ بدر کر دیا جائے اور وہ لوگ گاؤں کے مکھیا مگن کے چتا سے شکنتلا کو بھی علاقے سے باہر نکالنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

شکنتلا صحن میں ٹہل رہی تھی۔ صحن کے آگے مندر کی اندرونی عمارت تھی۔ چھوٹے بڑے دروازوں پر سانپوں کی شبیہہ نمایاں ہیں۔ بڑے دروازے سے اندر شکنتلا داخل ہوتی ہے۔ بے شمار یاتری ناگ دیوتا کے گرد پوجا پاٹ کرتے نظر آئے۔ اچانک ناگ دیوتا بت کے عقبی دروازے سے ایک پالکی برآمد ہوتی ہے جس پر لکشمن داس براجمان تھا۔ جس کا ناگ مندر بلکہ ناگ بھون میں سکہ چلتا تھا۔ شکنتلا نے دیکھا کہ کامنی اور ایک لڑکے کو زنجیروں میں جکڑ کر ناگ دیوتا کے مجسمے کے عقب سے گھسیٹ کر لایا گیا۔

راجکماری پریہ کو ریاست دھرم پور راجہ کی شادی میں شرکت کا موقع آیا۔ راجہ کا محل دیکھ کر پریہ نے اس سے بڑھ کر خوبصورت محل تعمیر کرنے کا سوچا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اپنی رعایا پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ کر ہر دم کام پر لگا کر آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔

شکنتلا ناگ دیوتا کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ میں ناگن دیوی ہوں اور دیوتا کے حکم سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ شکنتلا لکشمن داس کا مکروہ چہرہ یاتریوں کے آگے پیش کرتی ہے جس سے عوام میں غم وغصے کی لہر دوڑ جاتی ہے پھر شکنتلا کامنی کو مندر کی مہان پجارن بنا دیتی ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

”کچھ کرنے کے لیے ہی آئے ہیں دلاور بھائی لیکن بغیر سوچے سمجھے پانی میں چھلانگ نہیں لگانی چاہیے فی الحال تو رات ہو رہی ہے میں تمہارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ پھر تم آرام کرو صبح سے باقاعدہ کام شروع کر دیں گے۔

کالی رات رات کا مہیب اور پراسرار سناٹا پہاڑوں پر پوری طرح اپنے پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ دلاور کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے...... کسی نے اسے جگایا ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ خسکران انسانی شکل میں اس کے پاس ہی پڑا سو رہا تھا۔“ اچانک اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ چونک کر پلٹا تو حیران رہ گیا۔ سائیں مرچو اپنی سفید دودھیا بارلیش صورت کے ساتھ کھڑے تھے۔ ”سائیں بابا......“ دلاور کے دل میں امید وبیم بھرے خیالات ابھرنے لگے۔

”ہاں...... میں سائیں مرچو ہی ہوں ایک عرصے بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ میری ہدایت پر عمل نہیں کرتے اسی لیے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہو۔“

مم...... میں سمجھا نہیں سائیں بابا......“ دلاور اچانک سائیں مرچو کو سامنے پا کر عقیدت بھرے انداز میں بولنے لگا۔ کب سمجھے گا نا سمجھ...... جب پانی سر سے گزر جائے گا۔“

”میں کیا کروں بابا جی......“ دلاور سائیں مرچو کو پاس دیکھ کر بہت خوش ہو گیا تھا۔

”ان سرخ پہاڑوں میں کھوٹھاری کا جادو اثر نہیں کرتا۔ آگے بارا کاری کا جنگل ہے پیچھے کوٹھاری بیٹھا ہے نماز قائم کر لے اور آیت الکرسی کا ورد کرتا رہا کر۔ جب بھی کسی مصیبت، یعنی جنگ جادوگر یا مافوق الفطرت چیز کو سامنے پاؤ تو باتوں میں وقت ضائع نہ کرنے کے بجائے آیۃ الکرسی پڑھ کر فوراً اپنے سینے پر پھونک لیا کرو۔ اس طرح تم کافی حد تک محفوظ رہو گے۔ اور اپنے آپ کو دلیر کرو۔ ڈرنا...... رونا منہ بسورنا چھوڑ دو۔“

”میں ایسا ہی کروں گا بابا جی۔“

”اب تمہاری زندگی کا نازک دور شروع ہو گیا ہے اور فتح ہمیشہ بہادروں کا مقدر بنتی ہے۔“

بابا جی...... دلاور نے کچھ کہنا چاہا لیکن تیز روشنی کا جھماکہ ہوا اور پھر دلاور کو کوئی ہوش نہ رہا جب ہوش آیا تو خسکران اسے جگا رہا تھا۔ ”اٹھ دلاور بھائی صبح ہو گئی۔ سورج دیوتا آنے والا ہے۔“

”دلاور اٹھ بیٹھا...... دیکھا تو پو پھٹ چکی تھی۔ چہار سو اجالہ پھیل رہا تھا۔ دلاور نے کلمہ طیبہ کا ورد کیا اور اٹھ بیٹھا کلمہ سنتے ہی خسکران تیزی سے پیچھے ہٹا اور خشمگیں نگاہوں سے اسے تکنے لگا۔

''دلاور......'' وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولا۔ ''یہ کون سا منتر پڑھا ہے تونے......؟''

''یہ منتر نہیں خسکران بھائی۔ مالک کائنات اور اس کے پیارے کی تعریف ہے۔'' اور اس کے بعد خسکران کو نظر انداز کرتے ہوئے دلاور تیمم کرنے لگا اور پھر فجر کی نماز پڑھنے لگا۔ خسکران دور ہٹ کر حیران نظروں ان سے اسے گھورنے لگا۔

جب دلاور نماز سے فارغ ہو گیا تو اس سے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اب وہ مطمئن اور پرسکون ہو چکا تھا۔

اس کے بعد وہ اٹھا اور خسکران قریب آ گیا۔ خسکران بدک کر پیچھے ہٹنے لگا۔

''ڈرو نہیں خسکران۔ میں اپنے رب کی عبادت کر رہا تھا۔''

''کون سے رب کی؟'' خسکران نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ایک ہی رب ہے جو میرا بھی ہے اور تیرا بھی۔ جس کے آگے نہ کوتھاری دم مار سکتا ہے نہ تبریشیا کی کوئی وقت ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' خسکران سر کھجانے لگا۔

سمجھ تو مجھے بھی دیر سے آئی ہے۔ خیر چھوڑو ناشتے کا بندوبست کرو۔

''خسکران نے ہاتھ بلند کیا تو فوراً ہی ایک تھال میں گرما گرم روٹیاں، سالن اور چائے حاضر ہو گئی اور دلاور کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے بعد خسکران نے دلاور کا ہاتھ پکڑا اور ہوا میں بلند ہونے لگا۔ دلاور بھی اس کے ساتھ ہی اڑنے لگا ہوا میں بلند ہونے کا دلاور کا یہ پہلا تجربہ تھا بلند ہوتے ہوتے وہ خاصی بلندی پر آ گئے اور پھر سامنے موجود پہاڑ سے بھی اوپر ہو گئے پہاڑ کی دوسری طرف وادی تھی وہ مسلسل اڑتے رہے دو تین پہاڑوں کے بعد ایک بہت بڑا دریا آ گیا جس کا پانی خون کی طرح سرخ تھا۔ دلاور حیرت سے خونی دریا دیکھنے لگا جبکہ خسکران ایسی باتوں کا عادی تھا۔ دریا کا پاٹ خاصا چوڑا تھا لیکن چونکہ وہ اڑ رہے تھے لہذا انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

''اب ذرا سنبھل جانا دلاور۔ کیوں کہ دریا کے بعد ہاراکاری کا علاقہ شروع ہو رہا ہے'' دریا پار کر کے وہ اتر گئے۔ اب زمین قدرے زرخیز تھی۔ پہاڑوں کی طرح پتھریلا پن نہ تھا۔ کافی دیر چلتے رہے۔ اکا دکا درخت شروع ہو چکے تھے۔ اب دونوں ہی چوکنے تھے کیوں کہ اب ہاراکاری کا علاقہ شروع تھا۔ اس قبیلے کے لوگ آدم خور اور انتہائی جنگجو تھے اور وحشی تھے جبکہ قبیلے کا سردار تبریشیا بہت بڑا جادوگر تھا اور عنکبوت جیسا وحشی اور خرانٹ جن اس کا غلام تھا۔ آگے چل کر جنگل گھنا ہونا شروع ہو گیا آہستہ آہستہ اتنا گھنا ہو گیا کہ اب دھوپ بھی نہ پہنچ رہی تھی۔ اب زمین بھی کئی جگہ سے پلپلی ہو رہی تھی جا بجا لمبی گھاس اگی تھی گندے جوہڑ اور کانٹوں والے پودے تھے۔ انتہائی تنگ و تاریک جنگل شروع ہو چکا تھا راستہ بنانا بھی مشکل ہو رہا تھا جنگل گھنے سے گھنا ہوتا جا رہا تھا اسی طرح چلتے چلتے رات ہو گئی۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھانے لگا خسکران کو رات کو کوئی مسئلہ نہ تھا وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا البتہ دلاور مشکل سے دو چار تھا۔ وہ بار بار درختوں کی ٹہنیوں سے ٹکرا جاتا اور کانٹوں سے الجھ جاتا تھوڑی ہی دیر بعد ہر طرف قبر کا اندھیرا پھیل گیا ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا تھا۔ ایسے میں خسکران نے دلاور کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ کافی دیر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد ایک ایسی جگہ آ گئی جہاں ایک درخت ایک دائرے کی شکل میں کھڑے تھے اور ان کے درمیان چھوٹا سا میدان بنا ہوا تھا کشادہ جگہ دیکھ کر وہ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

''کس مصیبت میں پھنس گئے......'' دلاور مایوسی سے بولا تو خسکران ہنسنے لگا۔

''ہم غلام ہیں بھئی کوتھاری کے اور غلام کا کام بس حکم بجالانا ہوتا ہے۔''

''لیکن ان جنگلوں میں تبریشیا کو کہاں تلاش کریں گے یہاں تو ہمارے علاوہ صرف الو بولتے ہیں۔

''بولیں گے ضرور بولیں گے۔ جن کی تلاش میں ہم یہاں آئے ہیں وہ خود بولیں گے۔ فکر نہ کرو۔ ہمارے استقبال کو وہ تیار بیٹھے ہوں گے۔'' خسکران کی بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی اچانک قدموں کی چاپ ابھری۔ دلاور چونک پڑا ''تمہاری بات درست معلوم ہوتی ہے خسکران بھائی۔ یہ آوازیں سن رہے ہو۔'' دلاور نے خسکران کو توجہ دلائی۔



"ہاں لگتا ہے اب کام کا وقت آ گیا ہے۔"

دونوں دبک کر ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ گئے کچھ دیر خاموشی چھائی رہی کوئی آواز نہ ابھری اچانک ایک جانب سے کچھ سائے برآمد ہوئے اور کھلی جگہ میں آ کر ایک قطار میں سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ سب شکلوں سے ہی وحشی قبیلہ سے تعلق رکھنے والے نظر آتے تھے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر گزری تو کچھ مزید وحشی کہیں سے آ نکلے پھر تو ایک تانتا بندھ گیا۔ آنے والے تمام وحشی بالکل خاموش قطار میں آ کر کھڑے ہو جاتے۔

کافی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اب تک ان کی تعداد پچاس سے اوپر ہو گئی تھی سب کے سب پتوں کے لنگوٹ باندھے ہوئے تھے ان میں عورتیں بھی تھیں لیکن مردوں کی تعداد زیادہ تھی۔

پھر آہستہ آہستہ دائرہ بنانے لگے۔ دائرہ بنا کر سب نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

دلاور درخت کی اوٹ سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ دائرے کے درمیان سفید دھوئیں کا مرغولہ بننا شروع ہو گیا ہے۔ دھواں ظاہر ہوتے ہی تمام جنگلی اونچی اونچی آواز میں کچھ پڑھنا شروع ہو گئے۔ ایک ہی لے پر ایک ہی مخصوص جملے کو دعائیہ انداز میں دھرایا جا رہا تھا۔ دھوئیں کا مرغولہ اب بڑا ہو کر ہیئت بنانے لگا۔ چند ہی ساعتوں بعد یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی جانور ہو۔ کوئی چوپایہ۔ پھر دلاور کو دھوئیں میں سے ایک گدھے کی شکل ابھرتی دکھائی دی گدھے کی شبیہہ ابھرتے ہی سب وہی مخصوص جملہ دہراتے ہی سجدے میں گرتے چلے گئے وحشیوں کے سجدے میں گرتے ہی گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں رینکنے لگا گدھے کی رینکنے کی آواز سن کر وحشیوں نے سجدے سے سر اٹھا لیا اور مارے خوشی کے نعرے لگانے لگے جیسے کسی کو راضی کر لیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد تمام وحشی ایک جانب دیکھنے لگے جیسے کسی کا انتظار ہو۔ اور پھر جدھر وہ دیکھ رہے تھے اُدھر سے چار کہار برآمد ہوئے جنہوں نے ایک پالکی اٹھائی ہوئی تھی پالکی لا کر انہوں نے گدھے کے پیروں کے پاس رکھ دی۔ پالکی زمین سے لگتے ہی تمام وحشی ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چہار سو ویرانی چھا گئی پالکی کے چاروں کہار ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے...... گدھا خاموش ہو گیا تھا...... پالکی کا پردہ سرکا۔ اور ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی جس کے سنہری بال تھے باہر نکلی اور چلتے چلتے گدھے کے دو زانو بیٹھ گئی گدھا پھر رینکنے لگا اور لڑکی کے چاروں طرف چکر لگانے لگا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہونے لگا اور تحلیل ہونے کے بعد ایک دم غائب ہو گیا۔

"یہ کیا ہوا حسکران بھائی" دلاور حسکران کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ ابلیس کو پوجنے والی قوم ہے دلاور......" حسکران مسکرا کر بولا

"اچھا۔ دلاور بڑا حیران تھا"

"ہاں اور یہ لڑکی مجھے کسی اہم خاندان کی فرد لگتی ہے۔ آج کوئی خاص رات ہے۔ جس میں یہ لوگ شیطان کی عبادت کر رہے ہیں۔ اور یہ لڑکی کی آمد پجاری لوگوں کی رخصتی بتاتی ہے کہ لڑکی کو عام آدمی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اسی قبیلے کے کسی خاص آدمی کی بیوی یا بیٹی ہے۔۔۔" حسکران دلاور کو بتا رہا تھا۔

اب کہار پھر آگے بڑھے جب لڑکی پالکی میں بیٹھنے لگی تھی کہ ایک جانب سے کسی شیر کی گرج سنائی دی اور دلاور نے دیکھا کہ شیر کی گرج سن کر کہاروں نے ادھر اُدھر دیکھا ان کے رنگ پیلے پڑنے شروع ہو گئے تھے شاید شیر کی آمد ان کے لیے غیر متوقع تھی لڑکی بھی دونوں ہاتھ پالکی پر رکھے خوفزدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسی اثنا میں شیر پھر دھاڑا اور پھر درختوں کی اوٹ سے لڑکی کے سامنے آ گیا۔ شیر کو سامنے پا کر کہار بدحواس ہو کر مختلف سمتوں میں بھاگ کھڑے ہوئے اور لڑکی ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔ وہ بری طرح ڈر چکی تھی شیر اس کی آنکھوں کے عین سامنے کھڑا تھا اور کسی پل اس پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔

"حسکران بھائی ہمیں اس لڑکی کو بچانا چاہیے۔" دلاور اضطراری لہجے میں بولا۔

''ضرور......'' خسکران مسکرایا بلکہ اسی طرح ہمیں اس بستی اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں یہ لڑکی بہتر معلومات فراہم کر سکتی ہے۔

''میں جا رہا ہوں۔'' دلاور یہ کہہ کر خسکران کا جواب سنے بغیر جھاڑیوں سے باہر نکل کر لڑکی اور شیر کے مقابل آ گیا۔ کپڑوں کے اندر کمر کی پیٹی میں اڑسا لمبے پھل کا خنجر نکال کر دلاور نے دائیں ہاتھ میں تھام لیا نپے تلے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

شیر عقب سے آہٹ سن کر آہستگی سے پلٹا اور خنجر بردار حملہ آور کو سامنے پا کر گرجا اور اگلے دونوں پنجوں کے جست لینے پر جھکا اور اگلے ہی لمحے لمبی جست لگا کر دلاور کے اوپر آ گرا۔ دلاور شیر کو اتنے قریب پا کر ایک لمحہ کے لیے گھبرایا اور اور پھر اس نے خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور شیر کی بائیں آنکھ میں گھسیڑ دیا شیر اس اچانک افتاد سے گھبرایا اور دلاور کو اپنے کشادہ پنجے سے جھانپڑ کی زد میں لینے کی کوشش کی تو دلاور پھرتی سے جھکا اور دوسرے ہی لمحے سرعت کے ساتھ خنجر بلند کیا اور شیر کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ دی اور پھرتیلے انداز میں پیچھے ہٹ کر شیر کی پہنچ سے دور ہو کر اپنی جرأت اور بہادری پر خود ہی رقص کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ میں تو ایک عام سا انسان اور مصائب کا مارا شخص تھا۔ یہ کیسی بہادری کہ جنگل کے بادشاہ کو اندھا و ناکارہ کر دیا۔

''واہ دلاور بھائی واہ'' خسکران تالی بجاتا ہوا اوٹ سے باہر نکل آیا اور دلاور کا شانہ تھپتھپانے لگا میں تو تمہاری مدد کرنے کو تیار بیٹھا تھا مگر مجھے تو آج پتا چلا کہ تم واقعی میں دلیر ہو۔ ورنہ ایک عام انسان شیر کے سامنے آنا تو کیا شیر کی آہٹ سن کر دور بھاگتا ہے۔''

دلاور مسکرانے لگا اور خنجر کے پھل کو شہادت کی انگلی سے صاف کرنے لگا۔ اسی اثنا میں شیر تکلیف سے دھاڑتا ہوا، گرتا پڑتا جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ادھر سنہرے بالوں والی حسین دوشیزہ ابھی تک خوف سے باہر نہیں آئی تھی اور کانپ رہی تھی اس کے قدم تو جیسے جم کے رہ گئے تھے دلاور اور خسکران دونوں اس کی طرف بڑھے لڑکی دلاور کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے تک رہی تھی۔

''گھبراؤ نہیں لڑکی۔'' خسکران بولا۔ ہمیں بتاؤ کہ تم کون ہو۔''

''آپ نہ آتے تو اب تک میں مر چکی ہوتی شیر نے مجھے چیر پھاڑ دینا تھا۔'' لڑکی بولی تو دلاور کو یوں محسوس ہوا جیسے لمبی گردن والی صراحی سے پانی انڈیلا جائے تو قل قل کی سریلی آواز نکلتی ہو۔

''کون ہو تم اور یہ لوگ کون تھے جو عبادت کر رہے تھے؟''

''ہم ہاراکاری ہیں۔'' لڑکی بولی تو دلاور اور خسکران دونوں چونکے۔ اب لڑکی کا خوف کم ہونے لگا تھا وہ دلاور کو میٹھی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

''میں قبیلے کے سردار تمریشیا کی بیٹی ہوں۔'' اس نے بتایا تو دلاور کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ ''تم لوگ کون ہو اور اس طرف کیسے آ نکلے۔''

''ہم دونوں دوست ہیں اور راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلے ہیں۔ خسکران کے بولنے سے قبل ہی دلاور بول اٹھا اور خسکران اس کی ہوشیاری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔

لڑکی کا اعتماد اب بحال ہو چکا تھا۔ وہ اس وقت پھولوں سے بنے لباس میں ملبوس تھی جبکہ اس کے سنہرے لچکدار بال چاند کی روشنی میں بکھرے ہوئے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔

سنو نوجوان۔ لڑکی بولی۔ تم اس وقت ہاراکاری کے قبیلے کی حدود میں ہو۔ اور یہ تم نہیں جانتے کہ ہم لوگ ابلیس کے پیروکار ہیں اور آدم خور ہیں۔ مقدس تمریشیا اس قبیلے کے سیاہ سفید کا مالک ہے اجنبی لوگوں کا داخلہ تو ہو جاتا ہے مگر واپسی کا ہر دروازہ سختی سے بند ہے لیکن تم لوگوں نے مقدس تمریشیا کی بیٹی اور ابلیسی شہزادی شکولی کی جان بچائی ہے آؤ میں تمہیں اس علاقے کی حدود سے باہر چھوڑ آؤں۔

"نہیں۔" دلاور اعتماد سے بولا۔

"نہیں ابلیسی شہزادی۔ ہم راستہ بھول کر آ ہی گئے ہیں تو اب تمہارے علاقے کی سیر کر کے ہی جائیں گے دیکھیں تو سہی تم اور تمہارا قبیلہ کیا چیز ہو۔ تمہاری رسمیں، تمہاری عبادتیں اور تمہارا رہن سہن ہم دیکھنا چاہیں گے۔"

سنو اجنبی......" شکولی خراماں خراماں چلتی ہوئی آگے آئی اور دلاور کو شانوں سے پکڑتی ہوئی بولی۔

"بیوقوفوں جیسی باتیں نہ کرو یہ جگہ جہاں تم کھڑے ہو کاہن مقدس شیکارا کی حدود ہے جو ابلیس کا نائب ہے۔"

"کاہن مقدس کون ہے" خسکران بولا۔

"کاہن مقدس شیکارا میرے باپ اور اس قبیلے کے سردار تبرشیا کا دست راست بھی ہے اور ہاراکاری کے قبیلے کا کاہن بھی۔ اور وہ کسی اجنبی کو برداشت نہیں کرتا جلدی کرو آؤ میرے ساتھ یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو صرف پچھتاوا رہ جائے گا۔ آج گھمل کٹی کی رات ہے کیوں کہ آج پورن ماشی ہے آج کی رات کے آخری پہر ابلیس کے حضور قربانی دی جاتی ہے اور بلیدان کے لیے جتنے بھی اجنبی مل جائیں کم ہیں۔ کہیں تم بھی ان میں شامل نہ ہو جاؤ میں تمہاری جان بچا کر تمہارا احسان اتارنا چاہتی ہوں۔"

"سنو شکولی۔" دلاور جو شیر کا مقابلہ جیتنے کے بعد دلیر ہو چکا تھا سنہرے بالوں والی سے مخاطب ہوا اصل بات یہ ہے کہ تم مجھے پسند آ گئی ہو تم بھی ہمارے ساتھ چلو" اس کا یہ کہنا تھا کہ شکولی کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

"تم دو ٹکے کے اجنبی ہاراکاری کی شہزادی شکولی پر بری نظر رکھتے ہو اگر تمہارا مجھ پر احسان نہ ہوتا تو میں تمہیں دیکھ لیتی۔"

"کیا دیکھتی تو خوب صورت شہزادی۔ شیر کو دیکھ کر تو تمہاری جان نکل رہی تھی۔"

"وہ وقت اور تھا یہ وقت اور ہے۔ اس وقت ابلیس دیوتا جا چکے ہیں اور میرے محافظ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔"

"اور اب دلاور طنزیہ بولا۔

اب ذرا اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑاؤ۔"

شکولی کی بات سن کر دلاور چونکا اور اب جو اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو درجنوں وحشی اپنے نیزے سنبھالے خاموشی سے ان کے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔

"برے پھنسے دلاور بڑبڑایا۔

"میں نہ کہتی تھی اب شکولی چہکنے لگی تھی۔" مگر تم نے میری بات نہ مانی اب بھگتو۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتی۔" یہ کہہ کر شکولی اپنی پالکی کی طرف بڑھ گئی اور کچھ وحشیوں نے آگے بڑھ کر پالکی اپنے شانوں پر اٹھائی اور نامعلوم سمت کی طرف چل دیے۔

"اب کیا کریں خسکران۔" دلاور نے پُرامید نظروں سے خسکران کی طرف دیکھا۔

بغیر مزاحمت کے چپ چاپ گرفتاری دے دو دیکھا جائے گا۔ اسی بہانے ہمیں ان کی بستی کے اندر جانے کا موقع تو ملے گا۔"

وحشیوں نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا اور نیزے کی انی چبھو کر ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

☆......☆......☆

یہ ایک کھلا میدان تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک آگ کا الاؤ روشن تھا۔ سینکڑوں کالے بھجنگ وحشی نیزے سنبھالے نیم دائرے میں بیٹھے تھے۔ ایک طرف چبوترہ بنا تھا جس پر سیاہ لکڑی کی کرسیوں پر بیچ صورت سوکھا سڑا سا پستہ قد بوڑھا بیٹھا تھا جس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے بنے تھے تھوڑی عجیب سی باہر کو نکلی ہوئی تھی یہ تبرشیا تھا اس کے دائیں طرف والی کرسی پر لمبے لمبے چاندی کی طرح سفید لٹوں والا سانولے رنگ کا بوڑھا تھا یہ کاہن مقدس شیکارا و تھا۔ جس کی پشت پر ایک کب نکلا ہوا تھا۔ جبکہ بائیں طرف والی کرسی پر وہی سنہری بالوں والی حسین و جمیل لڑکی شکولی براجمان تھی۔ ان تینوں

سمیت ہت وحشی نے درخت کے پتوں اور چھالوں سے برائے نام ستر پوشی کی ہوئی تھی۔
ان سے کچھ دور سفید رنگ کا دائرہ بنا ہوا تھا جس کے درمیان ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جس پر ایک انسانی کھوپڑی ایستادہ تھی۔ ایک بڑا سا سیاہ پتھر تھا جس کے پاس ہی ایک تیز دھار کلہاڑی تھی جس کا پھل چمک رہا تھا۔ اس کے نزدیک ایک بڑے منہ والا مرتبان بھی تھا دلاور اور خسکران کے ہاتھ پیچھے باندھے ہوئے تھے اور انہیں الاؤ سے کچھ دور کھڑا کیا ہوا تھا دلاور کی نگاہیں اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے ان پانچ مذہب انسانوں پر تھیں جو بری طرح ہراساں اور سراسیمہ حالت میں تھے ان میں دو عورتیں اور تین مرد تھے۔ یہ بندھے ہوئے نہ تھے لیکن بھاگنے کی ان کے اندر قوت نہ تھی کیوں کہ اردگرد وحشی جنگلی گھیرا ڈالے کھڑے تھے ہر وحشی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار اور دوسرے میں مشعل تھی۔ وحشی خاصی تعداد میں تھے یوں پورا پنڈال روشن تھا۔ چاند بھی اپنی رعنائیوں کے ساتھ موجود تھا تاہم بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے کبھی کبھی اسے چھپا لیتے تھے۔
دلاور کو شکولی کی وہ بات یاد آ گئی کہ آج پورن ماشی کی رات ہے لہذا کھمیل کٹی کی رسم نبھائی جائے گی جس میں ابلیس دیوتا کی پوجا کی جاتی ہے اور اس کے حضور انسانی بلیدان پیش کرنا ہوتا ہے۔
ہر طرف سکوت مرگ طاری تھا۔ تمام وحشی حیرت انگیز طور پر خاموش تھے۔ درمیانی نشست سے وہ مکروہ صورت سوکھا سڑھا بوڑھا جو دلاور کے خیال میں یقینا تمبریشیا کھڑا ہو گیا ایک ہاتھ سے اس نے لاٹھی ٹیک رکھی تھی وہ کھنکار کر بولنا شروع ہوا۔
''ہاراکاری کے باسیو آج کھمیل کٹی کی رات ہے۔ آج کی رات ابلیس دیوتا جو تمام کالی شکتیوں سے مہان ہیں ہمیں اپنے درشن کرائیں گے اور آشیرباد دیں گے۔ پرنتو یہ سب اسی سے ممکن ہو گا جب دیوتا کے حضور بلیدان مکمل ہوں گے خوشی کی بات یہ ہے کے آج ہمارے پاس بلیدان کے لیے تین یا پانچ نہیں بلکہ پورے سات سفید جانور ہیں میں ہاراکاری قبیلے کے سردار کی حیثیت سے مقدس شیکارا کو حکم دیتا ہوں کہ قربانی شروع کی جائے تا کہ صبح کی روشنی سے پہلے تمام مقدس شیطانی رسومات ادا کی جا سکیں تا کہ ابلیس دیوتا مجھ پر اور آپ پر شیطانی سایہ قائم رکھے۔''
ان الفاظ کے ساتھ ہی تمبریشیا اپنی نشست پر ہی جم گیا اور شیکارا اٹھ کھڑا ہوا اس کے ہونٹ ہلتے نظر آ رہے تھے وہ چبوترے سے اتر کر دلاور اور خسکران سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ پانچ مہذب قیدیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ شکولی تاثرات سے عاری چہرے کے ساتھ میدان میں نظر جمائے ہوئے بیٹھی تھی۔ چاندی کی روپہلی روشنی میں اس کے سنہرے بال ہوا کے زور سے اڑتے ہوئے پراسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ شیکارا کے چبوترے سے اترتے ہی ہجوم کے اندر سے کہیں ڈھول کی تھاپ پڑی اور وحشی رقص کرنے لگے شیکارا وحشیانہ انداز میں آہستہ آہستہ مہذب انسانوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ ڈھول کی تھاپ اور جنگلیوں کے رقص میں شدت پیدا ہو رہی تھی۔۔ قیدی انسانوں کے رنگ زرد اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگیں۔ انہیں اپنی عبرت انگیز اور وحشت ناک موت کا یقین ہو چلا تھا۔ تمام وحشی منہ سے عجیب و غریب آوازیں بھی نکال رہے تھے۔
اب شیکارا ان قیدیوں کے سر پر پہنچ چکا تھا اور ہاتھ کی عجیب حرکتوں کے ساتھ با آواز بلند کچھ پڑھنے میں مشغول تھا۔ ہجوم کا شور شرابہ اور ڈھول اور تالیوں کی آواز سے شیکارا کی آواز دب کر رہ گئی تھی اب شیکارا نے ہجوم کی طرف دیکھ کر مخصوص قسم کی آوازیں نکالیں تو پانچ ہٹے کٹے نوجوان نیزے سنبھالے میدان میں اتر آئے اور اپنے نیزے بلند کر کے بیک وقت تمام قیدیوں کے جسموں میں پیوست کر دیے۔ جس سے قیدی ہذیانی انداز میں چیخ پڑے ان کے جسموں سے لہو رسنے لگا لیکن حبشیوں نے اس پر بس نہ کیا بلکہ بار بار ان کے نیم عریاں جسموں پر نیزے کی انیاں زوردار طریقے سے چبھونے لگے قیدی بری طرح چیخ چلا رہے تھے لیکن نیزہ بردار انہیں نیزوں سے مارتے ہوئے اسی پتھر کی طرف چل دیے جس کے پاس ایک چمکنے والی کلہاڑی پڑی تھی پتھر کے قریب پہنچتے ہی انہوں نے نیزے پھینک دیے اور تیزی سے ایک قیدی کو پکڑ کر اس کا سر پتھر پر رکھ دیا اور شیکارا نے پھرتی سے کلہاڑی اٹھائی اور ایک ہی وار میں قیدی کی گردن تن سے جدا کر دی اور دوسرے وحشیوں نے سرعت کے ساتھ قیدی کا دھڑ مرتبان کے منہ پر الٹ دیا تا کہ خون مرتبان کے اندر اکٹھا ہو جائے

۔قیدی کا لاشہ موت کے شدید جھٹکے لینے لگا بے چارے کو چیخنے کا موقعہ بھی نہیں ملا جب کہ اس کا عبرتناک حشر اس کے باقی ساتھی آنے والے لمحات کا سوچ کر چیخنے لگے ان میں شامل نوجوان عورتیں تو باقاعدہ سینہ کوبی کر رہی تھیں اور بار بار ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھ کر کسی معجزے کی منتظر تھیں لیکن معجزہ نہ ہوا اور اگلے ہی لمحے شیکارا کے اشارے پر دوسرے نوجوان کو گھسیٹ کر لایا گیا جو پہلے ہی نیم جان ہو چکا تھا اس کا سر بھی پتھر پر رکھ کر جھکا دیا گیا۔ شیکارا کا کلہاڑا حرکت میں آیا اور وحشیوں نے اس کا دھڑ بھی مرتبان میں الٹ دیا اور خون تھل تھل اس میں گرنے لگا تمام وحشی خوشی سے نعرے لگا رہے تھے اب ایک عورت کو بالوں سے کھینچ کر لایا جانے لگا جو اپنی زبان میں واسطے دے رہی تھی اور ہاتھ جوڑے رحم کی خواستگار تھی لیکن جاہل وحشیوں نے ہر بات سے بے نیاز ہو کر گھسیٹتے ہوئے اسے پتھر پر لا کر اس کا سر بھی تن سے جدا کر دیا ۔اسی طرح چوتھے اور پانچویں قیدی کا بھی حشر ہوا حسکران کے لیے تو یہ کوئی بات نہیں تھی مگر دلاور دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا اسے پتہ تھا کہ وحشی حسکران کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر وہ تو ایک عام آدمی ہے اس کا حشر تو لمحوں میں ان قیدیوں کی طرح ہوگا وہ دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے لگا اسے سائیں مرچو کی وہ بات یاد آ گئی مصیبت کے وقت آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا کرو اس سے بڑی مصیبت اور کب آئے گی یہ سوچتے ہوئے دلاور تیز تیز آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر پھونکیں مارنے لگا اور گڑگڑا کر اللہ سے اپنی جان بخشی کی دعائیں کرنے لگا وحشی پانچوں قیدیوں کی لاشوں کو اٹھا کر بڑی بڑی لوہے کی سلاخوں میں پرو کر آگ کے الاؤ کے اوپر رکھ رہے تھے اس کام سے فارغ ہو کر وہ دلاور اور حسکران کی طرف بڑھے تو پہلے دلاور کو انہوں نے پکڑا اور کھینچنے لگے عین اسی لمحے چاند بادل کی اوٹ میں پردہ پوش ہو گیا اور بڑے زور کا جھونکا آیا جس سے وحشیوں کے ہاتھ میں موجود مشعلیں پھڑ پھڑانے لگیں میدان میں اندھیرا چھا گیا وحشی ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے اور پھر دلاور کو ہانکنے لگے اسی اثنا میں ہوا کا زور بڑھ گیا اور آندھی کی صورت اختیار کر گیا دلاور کی نظر اچانک آسمان کی طرف اٹھی تو کیا دیکھتا ہے تمام آسمان بادلوں سے ڈھک چکا ہے اور بجلی کڑک رہی ہے ہواؤں کے جھکڑ چلنا شروع ہو گئے۔ مشعلیں ٹمٹمانے لگیں۔ حسکران بھی اچانک موسمی تغیر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک تمام مشعلیں بجھ گئیں۔وحشی شور و غوغا کرنے لگے کہ زوردار گڑگڑاہٹ کے ساتھ میدان کے عین وسط سے زمین شق ہونے لگی۔ تمریشیا اور شکولی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور وحشیوں سمیت حسکران اور دلاور نے بھی دل دہلا دینے والا ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔

☆......☆......☆

پریہ سخت عذاب کا شکار تھی۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا مطلق العنان ملکہ بننے کے بعد ایسے دن بھی آئیں گے کہ جو لوگ اس کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتے تھے اب اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھیں گے۔ اس کی ساری عزت شکنتلا نے خاک میں ملا دی تھی۔ دن میں ایک آدھ بار وہ سب کے سامنے پریہ کی خوب بے عزتی کرتی تھی اور کبھی جوتوں سے اس کی تواضع کرواتی اور کبھی بھوکا پیاسا دھوپ میں کھڑے رہنے کا حکم دیتی۔ پریہ کے تمام اختیارات تقریباً ختم ہو چکے تھے اور پریہ کسی کے سامنے نظریں اٹھانے کے قابل نہ رہی تھی۔ اور اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ شکنتلا چونکہ اس سے نفرت کرنے لگی ہے اس لیے روزانہ سر عام اس کی بے عزتی کرتی رہتی ہے۔ اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ شکنتلا کم از کم عالیہ والا مقام بحال کر دے لیکن شکنتلا کو شاید اس پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ یا پھر سامری نے اسے کچھ اس انداز میں ورغلایا تھا کہ وہ اب پریہ کو دیکھتے ہی نفرت سے مسکرانے اور اسے طنزیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ جس سے پریہ کی جان ہلکان ہونا شروع ہو جاتی۔ بار بار کوششوں کے بعد اب پریہ کو یقین ہوتا چلا گیا کہ کسی وقت اچانک شکنتلا پریہ کو ہٹا کر کسی بھی دوسری کنیز کو کنیز عالیہ بنا دے گی اور پھر اس کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کوشلیا کے ساتھ خود پریہ نے سلوک روا رکھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی یہ پریشان ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر جلد ہی کچھ نہیں کیا تو شکنتلا کسی دن اسے اذیت ناک طریقے سے قتل کروا دے گی اور یا پھر اسے ایک عام سی کنیز بنا کر سارا جیون سسکنے پر مجبور کر دے گی اور پریہ نہ تو ابھی مرنا چاہتی تھی اور نہ ہی شاہانہ سہولتوں کے بغیر جینے کا تصور کر سکتی تھی۔

اگلے دن صبح سویرے بلکہ منہ اندھیرے جب شکنتلا ابھی سو رہی تھی تو پریہ اپنے دور اقتدار کے شاہی پروہت سیتا رام سے

ملاقات کرنے اس کے مندر کی طرف چل دی۔ پریہ کو یاد تھا کہ جب اس نے سیتارام کو شاہی پروہت مقرر کیا تھا تو اس نے مسکراتے ہوئے اور اپنے گندے گندے دانتوں کی نمائش کرتے اور پریہ کے چرن چھوتے وقت کہا تھا کہ دیوی جی آپ نے مجھے عزت بخشی۔ اگر کبھی آپ کے اوپر کوئی بپتا آ پڑی تو اس مورکھ کو اپنا جان کر ضرور آگاہ کیجئے گا اور پریہ کو یاد تھا اس وقت وہ اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ایسے ہنس پڑی جیسے اس کے مذاق سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ اب اسے کیا پتا تھا کہ پروہت کی وہ معمولی سی بات آج اس کے تاریک جیون میں امید کی آخری کرن بن جائے گی۔ پریہ چاہتی تھی کہ شکنتلا کے بیدار ہونے سے قبل سیتارام کو اپنی ساری بپتا سنا کر سہائتا طلب کرے۔

☆......☆......☆

''آیئے آیئے پریہ دیوی۔ مجھے یاد کیا ہوتا۔ میں حاضر ہو جاتا۔'' سیتارام اپنے صفا چٹ گول مول شادولے کی چوہی کی طرح سر کو ہلاتے ہوئے بولا۔

''سیتارام جی۔'' پریہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر ملتجی انداز میں سسکی۔

''کچھ بتانے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں...... سیتارام سب سمجھتا ہے کہ دیوی جی کی آمد کا کیا کارن ہے۔''

''میری سہائتا کیجئے رام جی۔'' پریہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''شکنتلا کو ماردیں اور سامری کو ختم کر دیں اور مجھے ملکہ بنا دیں یا پھر مجھے تابانہ سے کہیں دور پہنچا دیں جہاں یہ دونوں نہ پہنچ سکیں تاکہ میں کچھ دولت ساتھ لے جاؤں اور باقی جیون آرام اور سکون سے بسر کرنا چاہتی ہوں۔''

''دیوی جی'' سیتارام نے نظریں پریہ کے چہرے پر جما کر کہا۔

''سامری اور شکنتلا سے ٹکر لینا تو سیتارام کے بس کا روگ نہیں۔ پرنتو ایک شکتی سیتارام کے پاس ایسی ہے جس کا توڑ نہ تو سامری کے پاس ہے نہ شکنتلا کے پاس ہے میں ان کی نظروں اور سوچوں سے بھی دور تمہیں بنگال کے جنگلوں میں لے جاؤں گا۔ اس کے لیے مجھے تمہارے ساتھ جانا پڑے گا۔ کچھ عرصہ روپوش ہو کر ہم وہاں کسی آبادی میں اپنے نئے دور کا آغاز کریں گے مگر...... پتی پتنی کی حیثیت میں بولو اگر منظور ہے تو؟''

پریہ سیتارام کی بات سن کر چونکی اور اس کے غلیظ اور بڈھے کھوسٹ وجود کو دیکھ کر ایک لحہ کو اسے ابکائی آنے لگی مگر پھر اپنی موجودہ حیثیت اسے یاد آنے آ گئی ورنہ اتنی جرائت پر سیتارام کی وہ کھال کھنچوا دیتی لیکن مرتی کیا نہ کرتی اس نے سوچا کہ فی الحال تو اس کو ساتھ لے چلتی ہے وہاں جا کر حالات دیکھ کر اگلا فیصلہ کروں گی۔

''مم...... میں تیار ہوں رام جی...... کب چلیں۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بے بسی سے بولی۔

''کل صبح تم اسی وقت مال و دولت لے کر میرے ڈیرے پر آ جاؤ میں آج اڑن کھٹولہ تیار کرلوں گا اور کل ہم دونوں اس پر بیٹھ کر سحر اسرار کی زمین سے بنگال کی طرف پرواز کر جائیں گے۔'' پریہ سیتارام کی بات سن کر خوش ہوگئی اور بانہیں اس کے گلے میں ڈال کر جھول گئی تاکہ سیتارام اپنے وعدے سے نہ مکر جائے۔ ''میں کل صبح ساتھ تو نہیں البتہ شام کو چند گدھوں پر زیور و جواہرات لاد کر اور اس کے اوپر کچھ اور سامان رکھ کر اپنے خاص غلاموں کی نگرانی میں آپ تک پہنچا دوں گی اور منہ اندھیرے میں بھی آپ کے پاس آ جاؤں گی اور پھر ہم بھاگ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے سیانی لگتی ہے۔'' سیتارام اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے بولا اور سسکنے کے انداز میں مسکرا دی۔

☆......☆......☆

شکنتلا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی کہ کسی نے اُسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، تو چنکارا ایسے کھڑا تھا کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے'' شکنتلا نے خشمگیں نگاہوں سے پوچھا۔ اس طرح جگانے سے شاید اس کا مزاج خراب ہو گیا تھا۔

''مالکن وہ پریہ......'' چنکارا ہکلایا۔

''کیا ہوا پریہ کو'' شکنتلا انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ''سیتارام اسے اڑن کھٹولے پر بٹھا کر فرار ہو گیا ہے۔''

''کیا بکواس ڈال رہے ہو۔ سیتارام کون ہے؟ سیدھی طرح پوری بات بتاؤ۔'' شکنتلا ٹھیک سے ہو کر بیٹھ گئی۔ اب اسے بات کچھ اہم معلوم ہوتی تھی ورنہ چنکاریوں ایسے پریشان نہ ہوتا۔

پریہ کے دور میں سیتارام شاہی پروہت تھا۔ پریہ آپ کے سلوک اور اپنی بے عزتی سے نالاں تھی اسے آپ پر اب وشواس نہ رہا تھا۔ اس نے سیتارام سے سہائتا مانگی۔ سیتارام کو عام سا پجاری ہے مگر کٹھن تپسیا سے ایک ایسی شکتی پراپت ہو چکی ہے جس کا توڑ کرنا چنکار کے بس میں نہیں۔ اس کے پاس ایک اڑن کھٹولہ ہے وہ پریہ کو ساتھ بٹھا کر بنگال کی طرف پرواز کر چکا ہے۔''

''تم اس وقت کہاں تھے جب یہ فرار ہو رہی تھی۔'' شکنتلا غصے سے بولی۔

''مالکن میرا دھیان پریہ کی طرف کبھی گیا ہی نہیں مجھے تو جب پتا چلتا ہے جب میں کسی پر نظر رکھتا ہوں اس کا خیال من میں رکھتا ہوں میں تو آپ کے تمام دشمنوں کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا اور اپنی برادری کے پاس گیا ہوا تھا۔ کافی دنوں کے بعد ایک جگہ ہمارا اکٹھ ہوا تھا میں نے سوچا کہ آپ جب آواز دیتی ہیں تو میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے آپ کی آواز مل جاتی ہے اور میرے فاصلے میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

''جب تمہیں پتا چل گیا تھا تو تم اُسے واپس کیوں نہیں لائے۔''

''مالکن میں نے اڑن کھٹولے کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ شاید میری بس سے باہر ہے۔''

''اب کیا کریں۔'' شکنتلا اسے گھور کر بولی۔

''جلدی سے سامری کو بلائیں تاکہ مل کر کوئی اپائے کیا جاسکے ورنہ وہ دور نکل جائیں گے۔''

''سامری۔ سامری۔ سامری۔'' شکنتلا تیزی سے بڑبڑائی۔

''سامری کا جادو کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔''

سامری کا مخصوص نعرہ سن کر شکنتلا پلٹی تو سامری کو اپنے ساتھ پلنگ پر بیٹھا پایا۔

''سامری جی۔'' شکنتلا اس کی طرف لپکی اور پھر ایک ہی سانس میں سارا ماجرا کہہ ڈالا۔

''چلو میرے ساتھ۔'' سامری شکنتلا کا ہاتھ تھام کر بولا اور تھوڑی دیر بعد وہ چنکار کی رہنمائی فضا میں بلند اڑے جا رہے تھے۔ سامری نے شکنتلا کا ہاتھ تھام رکھا تھا کہ شکنتلا نے فضا میں پھنکار ماری اور ایک نوجوان عقاب کی شکل اختیار کر گئی۔ اب تینوں تابانہ کی حدود سے نکل کر بنگال جانے والے راستے پر محو پرواز تھے سامری دونوں ہاتھ پھیلائے جہاز کی مانند اڑ رہا تھا اور چنکار اپنے وجود کے ساتھ ان کے آگے آگے تھا۔

''چنکار۔'' شکنتلا نے آواز دی۔

''جی مالکن۔''

''کتنے دور ہوں گے وہ ہم سے؟''

''مالکن اگر اسی رفتار سے چلتے رہے تو جلد ہی انہیں جالیں گے۔''

کافی دیر گزر گئی پرواز جاری تھی۔

ادھر پریہ سیتارام کے ساتھ ایک قالین جس پر عجیب و غریب شکلیں بنی ہوئی تھیں پر بیٹھی فضا میں اڑی جا رہی تھی۔ شروع میں اسے خاصا ڈر محسوس ہوا لیکن سیتارام نے اسے تسلی دی گھبرانے کی کوئی بات نہیں تم گرو گی نہیں لیکن پریہ کو گرنے کا نہیں شکنتلا اور سامری کا ڈر تھا۔

چنکار کو تو وہ جانتی ہی نہ تھی۔ قالین خاصا لمبا چوڑا تھا اور ایک طرف کئی تھیلوں میں بند ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے زیورات پڑے تھے۔ پرواز کے شروع ہونے پر پریہ بار بار پیچھے اور نیچے دیکھ رہی تھی کہ سامری یا شکنتلا کہیں سے نہ آجائیں۔ لیکن جب خاصی دیر تک کچھ نہ ہوا تو اس کا من مطمئن ہونے لگا اور خوفزدہ آنکھوں میں رعنائی اترنے لگی۔ پپڑیاں جمے ہونٹ وا ہونے لگے اور موتیوں ایسے دانت خود بخود نکلنے لگے۔

"سیتارام۔" پر یہ چہکی "ہم تاہانہ سے کتنی دور آ گئے ہوں گے اور اب کس علاقے سے گزر رہے ہیں۔"

"تاہانہ تو بہت دور رہ گیا پیاری۔ ہم لکھنؤ کے اوپر سے پرواز کر کے بھی آ گئے ہیں اور اب پٹنہ کا علاقہ ہمارے نیچے ہے اور اس وقت ہمارے دائیں طرف کچھ دور گوا ہے اور بائیں طرف کافی آگے ایک دو شہر چھوڑ کر نیپال ہے۔

"بنگال کب آئے گا۔" پر یہ بھولپن سے بولی تو سیتارام کو پیار آ گیا اور اس نے آگے بڑھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال لیا تو سیتارام کے جھریوں زدہ وجود سے پر یہ کو ابکائی سی محسوس ہوئی سیتارام کی بدبو اس کی ناک کو جلائے دے رہی تھی۔ لیکن وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے وہ زبردستی مسکرانے لگی اور سوچنے لگی ان تھیلوں میں اتنی دولت بند ہے کہ کسی بھی ریاست میں محل نما حویلی خرید کر کنیزوں اور غلاموں کی ایک فوج رکھ لوں گی اور بہترین کاروبار شروع کروں گی اور موقع ہاتھ آتے ہی سیتارام کا کانٹا راستے سے صاف کرتے ہی عیش کا جیون گزاروں گی اور پھر اپنی دولت، جوانی، اور حسن سے ریاست کے کسی راجکمار کو پھانس کر ایک شاہی جیون کا آغاز کروں گی اور اسی طرح آخر کار ایک بار پھر رانی بن کر حکومت کروں گی۔ شیخ چلی کے ان خیالات کے ساتھ پر یہ اڑن کھٹولے پر و بیٹھی ہوئی اس عجیب و غریب دلچسپ سفر سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور بار بار آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی تمام مکانات اور چلتے پھرتے لوگ اسے نیچے بہت چھوٹے محسوس ہو رہے تھے۔ اچانک اسے بہت دور سے دو چھوٹے چھوٹے پرندے اڑن کھٹولے کی طرف آتے محسوس ہوئے وہ بڑی حیران ہوئی کہ اتنی بلندی پر کافی دیر سے اس نے کوئی پرندہ نہ دیکھا تھا بہر حال اس نے کچھ خیال نہ کیا اور سیتارام کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"اور کتنا سفر ابھی باقی ہے رام جی۔"

"سفر تو اچھا خاصا ہے پرنتو ہم کچھ ہی دیر میں خلیج بنگال کے اوپر پہنچ جائیں گے اور پانی کی سطح سے کچھ ہی اوپر رہ کر سفر کریں گے تاکہ شکنتلا اور سامری کے جادو کے واروں سے بچ سکیں کیوں کہ کسی دوسرے کا جادو پانی کی لہروں کے پار آ کر نقصان نہیں پہنچاتا۔" سیتارام کی بات سن کر پر یہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب شکنتلا اور سامری کی پہنچ سے بہت دور نکل آئی ہے وہ نہ تو اس تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہی سوچوں میں گم تھی اچانک اڑن کھٹولے کو ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔ پر یہ اور سیتارام دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا سیتارام کی نظروں میں تشویش کے آثار ابھرے۔ لیکن اچانک ہی اس نے دہ مارا کا نعرہ لگایا۔ پر یہ پریشان ہو گئی تو سیتارام آگے بڑھ کر اور اس سے لپٹ جھپٹ کرتے ہوئے بولے۔

"پر یہ جان فکر کی کوئی بات نہیں وہ سامنے دیکھ۔" پر یہ نے دیکھا تو پانی کی نیلی موجیں تاحد نظر اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ساری زندگی اتنا پانی کبھی نہ دیکھا تھا۔

"یہ کیا ہے......؟" وہ متوحش ہو کر بولی۔

"یہ سمندر ہے۔ اسے خلیج بنگال کہتے ہیں۔ اب یہ زیادہ سے زیادہ چند ایک کوس رہ گیا ہے تھوڑی دیر بعد ہمارا اڑن کھٹولہ اس کے اوپر پہنچ جائے گا پھر ساری فکریں اور غم ختم ہو جائیں گے شکنتلا اور سامری کے جادو کی آخری حد پر ہم آ گئے ہیں۔"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اڑن کھٹولے کو پھر ایک جھٹکا لگا جو پہلے سے تیز تھا اور اس کے ساتھ اس کی رفتار اور بلندی کم ہونے لگی۔ پر یہ نے چونک کر پیچھے دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے شامری ان کے برابر اڑ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک عقاب بھی محو پرواز تھا جبکہ چنتکار کو وہ دیکھنے سے قاصر تھی۔ سیتا و رام کی آنکھوں سے بھی خوف جھلکنے لگا تھا کیوں کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سامری کچھ پڑھ کر جیسے ہی پھونک مارتا اڑن کھٹولہ کچھ سست پڑ جاتا۔ پھونک کا اثر ختم ہوتے ہی پھر اس کی رفتار بڑھ جاتی ادھر شکنتلا نے کالی کا شبد جاپ جپ کر اڑتے اڑتے پھنکار ماری اور انسانی روپ میں آ گئی وہ بھی سامری کے شانہ بشانہ اڑ رہی تھی شکنتلا کو سامنے پا کر پر یہ بری طرح بدحواس ہو گئی۔ سمندر لحہ بہ لحہ قریب ہو رہا تھا۔

"شکنتلا......" سامری نے آواز دی۔ "اڑن کھٹولے کو کسی صورت پانی تک نہ پہنچنے دیا جائے ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔" ادھر سیتارام بھی اپنے جھولے سے ایک چپٹی بوتل جس میں کالے رنگ کا پانی بھرا تھا نکال کر اڑن کھٹولے کے چاروں کونوں پر ڈالنے لگا اس کے اس عمل سے کھٹولے کی رفتار کافی حد تک بڑھ گئی تو چنتکار پھرتی سے اچک کر اڑن کھٹولے پر سوار ہو کر

ظاہر ہو گیا اس کی عجیب و غریب شکل اور جسامت دیکھ کر پر یہ چلانے لگی جبکہ سیتارام بڑھ کر اپنی بوتل سے کالا پانی اس کے اوپر چھڑکنے لگا پانی کا چھڑکاؤ پڑنے پر چنکار بری طرح تڑپا۔ اور پانی کی چھینٹوں سے بچنے کے لیے دائیں بائیں بدکنے لگا سیتارام نے اس پر چھڑکاؤ تیز کر دیا تو چنکار کے حلق سے دلخراش آوازیں نکلنے لگیں اور وہ تڑپتے، بدکتے اڑن کھٹولے سے نیچے گر گیا اور پھر بے جان وجود کی طرح عمودی گرتا چلا گیا۔

چنکار کا حشر دیکھ کر شکنتلا آگ بگولا ہو گئی اور آخری وار کے طور پر سکھروپ جاپ کے لیئے ہونٹ لگانے لگی اڑن کھٹولہ اب سمندر سے ایک کوس دور رہ گیا تھا۔ سیتارام کی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ فاصلہ ختم ہو جائے اور اڑن کھٹولہ پانی کے اوپر آ جائے تاکہ شکنتلا اور سامری بے بس ہو جائیں لیکن سامری شکنتلا کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر اس سے دور ہو گیا اور گھوم کر کھٹولے کی اگلی جانب آ گیا اور پھر پورا منہ کھول کر ہتھیلیاں ہونٹوں کے دائیں بائیں کھڑی کر کے پوری قوت سے پھونک مارنے لگا اب اس کھلے منہ سے ہوا کا تیز رفتار جھکڑ چلنے لگا جس نے حیرت انگیز طور پر اڑن کھٹولے کی رفتار کے آگے بندھ باندھ دیا اس کے منہ سے خارج ہونے والی ہوا تیز سرخ آندھی کا روپ دھارنے لگی جس سے اڑن کھٹولہ پھڑ پھڑانے لگا اور اس کے آگے بڑھنے کی رفتار چیونٹی کی مانند ہو گئی اور بلندی مزید کم ہو گئی۔

دوسری طرف شکنتلا نے پچھلی طرف سے سکھروپ جاپ جپنے کے بعد اڑن کھٹولے کا ایک حصہ انگوٹھے کی مدد سے تھام لیا اور کالی دیوی کا ان جاپ جپنے کے بعد من میں یہ خیال لانے لگی کہ کھٹولہ زمین پر اتر جائے۔

اس کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ کھٹولہ کی رفتار کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور وہ جھٹکے کے ساتھ تھوڑا آگے بڑھتا اور پھر رک جاتا پھر آگے کو جھٹکا کھاتا اور پھر تھوڑا نیچے کی طرف جانا شروع ہو جاتا کبھی تھوڑا تھوڑا بلند ہونا شروع کر دیتا۔

ادھر سیتارام نے دور سے بوتل کا پانی چھڑکانے کے انداز میں سامری پر پھینکا تو سامری کے منہ سے سسکی نکل گئی اسے یوں محسوس ہوا ہو جیسے کھولتا ہوا پانی اس پر آ پڑا ہو۔ سامری کو پتا تھا کہ پانی کا معمولی اثر دیکھ کر سیتارام پھر چھڑکاؤ کرے گا ۔لہذا سامری نے اور زور لگا کر اور منہ پھلا کر پھونک مارنا شروع کر دی جس سے سرخ آندھی اور تیز ہو گئی اور سیتارام کے لیے اپنا وجود سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس کے قدم اکھڑنے لگے اور وہ دھڑام سے اڑن کھٹولہ پر گر گیا اس کے قدم اکھڑتے دیکھ کر سامری اور شکنتلا کا حوصلہ اور بڑھ گیا اور شکنتلا بھی بڑھ بڑھ کر پھونکتے اور پیچھے سے کھٹولے کو اپنی جانب کھینچنے لگی ۔اس کھینچا تانی کے دوران کھٹولہ نہ نہ کرتے ہوئے بھی آگے کو آ رہا تھا۔ اب سمندر کا پانی چند بالشت ہی دور رہ گیا تھا جبکہ اڑن کھٹولے کی بلندی بھی زمین سے برائے نام عام مکان کی چھت جتنی رہ گئی تھی۔ نیچے سمندر کی ریت شروع ہو چکی تھی جبکہ کھٹولہ ابھی بھی جھٹکے جھٹکے سے آگے بڑھ رہا تھا سیتارام سامری کی آندھی بگولوں جیسی پھونکوں کے مقابلے میں کمزور پڑ کر کھٹولے کے فرش پر گرا ہوا تھا اور پریہ بھی اس کے ساتھ بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی اچانک شکنتلا نے محسوس کیا اڑن کھٹولے کا تناؤ کم ہو چکا ہے پریہ اور سیتارام ایک ہی جگہ بیٹھے تھے ان کے بیٹھنے والی جگہ نیچے سے اڑن کھٹولہ کی باقی حصے کی نسبت اوپر سے دبی ہوئی تھی اور نیچے سے ابھری ہوئی تھی تو چھپاکے کی طرح شکنتلا کے ذہن میں بجلی کوندی کہ اب اڑن کھٹولہ اب زیادہ وزن برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا اور اگر معمولی تاخیر بھی ہوئی تو یہ پانی کی سطح پر پہنچ جائے گا کیوں کہ اب پانی کی ٹھاٹھیں مارتا سمندر شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔ ریت کہیں کہیں سے گیلی شروع ہو گئی تھی۔

شکنتلا نے پیچھے سے کھٹولے کا کونا چھوڑ دیا اور برق رفتاری سے کھٹولہ کے عین اوپر آ کر پھنکاری اور ایک بھاری بھرکم ہاتھی کی صورت اختیار کر لی اور دھپ سے اوپر آ گری۔ سیتارام کا جادوئی اڑن کھٹولہ جو اب اپنے بلندی رفتار اور وزن برداشت کرنے کی صلاحیت اور تناؤ قریب قریب کھو بیٹھا تھا ایک صحت مند وزنی ہاتھی کا بوجھ برداشت نہ کر سکا اور دھڑام سے خلیج بنگال کے ساحل پر آ گرا۔ عین اس وقت جبکہ منزل لب بام رہ گئی تھی اڑن کھٹولہ کے زمین پر گرتے ہی پریہ اور سیتا رام کی چیخیں نکل گئیں اور دونوں کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔

☆......☆......☆

یہ شیش محل کا عقوبت خانہ تھا۔ جو پریہ نے اس نیت سے بنوایا تھا کہ یہاں آ کر اپنی احساس برتری کو جلا بخشی جائے۔ لیکن

واوری قسمت۔ سامری اور شکنتلا، پریہ اور سیتارام کو اڑن کھٹولہ سے اتار کر یہاں لے آئے تھے۔ سامری جا چکا تھا کہ کل آئیں گا اور پھر ہم کوٹھاری کی تلاش میں نکلیں گے جس کے قبضے میں حسکران تھا۔ کیوں کہ کوٹھاری کی موت یا مرضی کے بغیر حسکران آزاد نہیں ہو سکتا۔

شکنتلا عقوبت خانے میں موجود تھی۔ سیتارام کے منہ سے خون نکل رہا تھا کیوں کے سامری نے اسے قابو میں کر کے اس کا منہ کھول کر اس کی زبان پکڑ کر مدی کھینچ کر توڑ لی تھی تا کہ کوئی جنتر منتر نہ پڑھ کر شکنتلا کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے پریہ شکنتلا کے سامنے کھڑی کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ اس کا دل بری پرح دھک دھک کر رہا تھا اب اسے یقین تھا کہ موت کا لمحہ آپہنچا ہے شکنتلا کسی قیمت پر بھی اسے نہ چھوڑے گی۔

اردگرد کنیزیں اور غلام مؤدب کھڑے تھے ایک طرف حبشی جلاد بھی کسی حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

''پریہ......'' شکنتلا زلفوں کو جھٹک کر بولی۔

''جی......'' پریہ لرزتی آواز میں بولی۔

''سیتارام کی آنکھیں نکال دو۔''

''کک......کیسے ملکہ حضور۔''

''اپنے ناخنوں سے......'' شکنتلا نے مسکراتے ہوئے کہا تو پریہ لرز گئی اپنے ہاتھوں سے کسی کی آنکھیں نکالنا یہ تو تصور ہی کراہیت آمیز تھا لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات پر دھیرے دھیرے سیتارام کی طرف بڑھنے لگی سیتارام شکنتلا کی طرف دیکھ کر رونے لگا اور اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ شکنتلا نے دو غلاموں کو اشارہ کیا تو انہوں نے سیتارام کو سیدھا کر کے مضبوطی سے جکڑ لیا۔

اب پریہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی مخروطی انگلیوں کے لمبے لمبے صاف ستھرے ناخنوں کو دیکھا اور انہیں گولائی میں آگے بڑھا کر ترشول نما کر لیا۔ غلاموں کی گرفت میں سیتارام پریہ کے ہاتھ کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر بری طرح کسمسانے لگا لیکن پریہ نے اگلے ہی لمحے ناخن اس کی بائیں آنکھ پر رکھ دیے اور پھر اچانک جھٹکے کے ساتھ اس کی آنکھ کو اپنے ناخنوں میں گرفت لینے لگی سیتارام کی زبردست کسمساہٹ کی وجہ سے پریہ کو مشکل پیش آ رہی تھی۔ لیکن آخر کار اس کے ناخنوں نے آنکھ کو اپنی گرفت میں کر لیا خون کے قطرے نمودار ہونا شروع ہو گئے اور پھر پریہ کے ناخن آنکھ میں اترتے چلے گئے۔ اور سیتارام کی دلدوز آہ بکا کلیجے چیرنے لگی اور شکنتلا دونوں ہاتھوں سے تالیاں پیٹنے لگی۔

سیتارام گلا کٹے بکرے کی طرح ڈکار رہا تھا۔

''اس کو اٹھا کر شہر کی گلیوں میں پھینک دیا جائے۔'' شکنتلا کا حکم سن کر غلام فوراً سیتارام کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور اگلے ہی لمحہ فرش شفاف کر دیا۔

''گرم دہکتی سلاخیں لائی جائیں۔'' شکنتلا کا حکم سن کر پریہ کپکپانے لگی اور دوڑ کر شکنتلا کے پیر میں سر رکھنے لگی تو شکنتلا نے جوتے کی نوک ماری جو پریہ کے ماتھے پر سرخ نشان بنا گئی۔

''نہیں پریہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے تم نے جتنے عیش کرنے تھے کر لیے اب باقی جیون تم بغیر ہاتھوں کے اور آنکھوں کے تابانہ کی سڑکوں پر بھیک مانگتے گزارو گی۔''

''بس ایک بار آخری دفعہ شما کر دیجیے۔'' پریہ گھگھیانے لگی۔ ''آئندہ کبھی غلطی نہیں ہو گی۔''

''اب تمہیں غلطی کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گی۔''

''مہارانی جی......ملکہ عالیہ......دیا کیجیے شما کیجیے۔'' پریہ دھاڑیں مارنے لگی اور اپنا سر زمین پر پٹخنے لگی وہ کسی قیمت پر معذور نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس کی بلند چیخیں پورے عقوبت خانے میں گونج رہیں تھیں لیکن کسی کنیز، غلام، سپاہی یا جلاد کی آنکھوں میں رحم کا جذبہ نہ تھا کیوں کہ پریہ نے خود بھی رحم نہ کیا تھا ان لوگوں کے سامنے اس نے سیکڑوں کو معمولی سی بات پر اس قسم کی بے شمار سزائیں دی تھیں اب شکنتلا مسکرائی۔ پریہ کی فریادیں تیز ہو گئیں۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر اور آنکھیں

خوف سے باہر ابلنے لگیں۔ شگفتلا مسکراتے ہوئے بڑھی اور پر یہ سے مخاطب ہوئی۔
"تم جیسی احسان فراموش کا زندہ رہنا میرے اقتدار کے لیے مناسب نہیں۔"
"آخری بار...... جاں بخشی کردی جائے۔ سارا جیون آپ کی خدمت کروں گی۔ آپ کے تلوے چاٹوں گی۔"
میں تمہیں ہمیشہ کے لیے خاک چاٹنے اور خون تھوکنے پر مجبور کردوں گی۔"
"لوہے کی گرم سلاخیں اس کی آنکھوں میں لگادی جائیں۔" لمحہ میں حکم پر عمل ہوا اور لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخیں پر یہ کی دونوں آنکھوں میں گھسیڑ دی گئیں اور پر یہ اندھی ہوگئی شدت تکلیف سے پر یہ چیخنا بھی بھول گئی اب صرف اکھڑی سانسوں کی آوازیں گونج رہی تھیں یوں لگتا تھا پر یہ تکلیف سے مر جائے گی۔ لیکن شگفتلا کے ہونٹ ہلے اس نے کچھ پڑھ کر پر یہ پر پھونکا تو اس کی تکلیف ختم ہوگئی۔ اب اسے بھی تاہانہ کے لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنا کر کسی گلی یا سڑک پر پھینک دیا جائے تاکہ شگفتلا کی عظمت و توقیر میں اضافے کا سبب بنے۔" شگفتلا نے گردن اٹھا کر تفاخر سے کہا۔

☆......☆......☆

سادھو کوٹھاری، خسکران اور ولاور کو تیر یشیا کو قتل کرنے کے لیے روانہ کرنے کے بعد رام داس کے محل میں اس کی کنیزوں کے ساتھ دن رات عیاشی کرنے کے بعد ایک دن ایک اور عمل کے لیے دھونی مار کر اور منڈل کھینچ کر چالیس راتوں کے لیے چلہ کشی میں مصروف ہوگیا اس عمل سے وہ ایسی شکتی حاصل کرسکتا تھا جس سے بھٹکتی آتماؤں کو غلام بنا کر اپنے کام نکلوائے جاسکتے ہیں محل کے اردگرد اس نے ایک ایسا حصار قایم کردیا تھا کہ کوئی باہر کا آدمی اندر اور اندر سے کوئی کنیز باہر نہ جاسکتی تھی۔
ادھر شگفتلا اور سامری اپنے کالے علم کی مدد سے کوٹھاری کا کھوج لگالیا تھا اور لمحہ بہ لمحہ محل کے قریب ہو رہے تھے اس وقت وہ ملے ہوئے شہر میں گھوم رہے تھے۔ ہر طرف گھر، مال اسباب، جانور اور انسانوں کی لاشیں بکھری تھیں۔ یہ سب کچھ خسکران نے کوٹھاری کا غلام بنا کر اور بوتل سے باہر آکر کیا تھا شاہی محل انہیں جلد نظر آگیا۔
میرا علم کہتا ہے کہ کوٹھاری سادھو اس محل کے اندر موجود ہے وہ دونوں خراماں خراماں محل کے بظاہر ویران صدر دروازے کی جانب بڑھنے لگے شگفتلا اس وقت سنہرے ریشمی چست لباس میں ملبوس تھی اور اس کے لانبے بال سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ جبکہ سامری زرد عبا پہنے ہاتھ میں انسانی پنڈلی کی ہڈی تھامے اور کاندھے پر جادوئی تھیلا لٹکائے ہوئے تھا اس کے دوسرے شانے پر کالا اُلو بیٹھا تھا محل کا صدر دروازہ سفید خوب صورت لکڑی کا بنا تھا جس پر مختلف نقش ونگار کھدے تھے دروازہ کھلا تھا جبکہ کوئی پہریدار موجود نہ تھا دونوں اندر داخل ہونے کو بڑھے لیکن سامری اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔
"کیا بات ہے شگفتلا مریل آواز میں بولی۔
سامری نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا عندیہ دیا اور کاندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے میں سے دو بیضوی گولے نکالے جو شیشے کے بنے تھے اور ان پر کسی جانور کی شبیہ تھی۔ دروازے سے چند قدم باہر کھڑے ہو کر سامری نے الٹے ہاتھ سے ایک گولا زور سے دروازے کے اندر کی جانب پھینکا تو چٹاخ کی آواز کے ساتھ گولہ پھٹ گیا۔
"ہوں......" سامری اپنا صفا چٹ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔
"کون سا خیال کچھ مجھے بھی تو بتاؤ سامری۔" شگفتلا نے پوچھا تو سامری نے اس کی خوب صورت سی ٹھوڑی ہلاتے ہوئے بتایا کہ شگفتلا محل کے گرد جادوئی حصار قائم ہے تو جادوگرنی تو بن گئی ہے مگر ابھی کچی ہے اور ایسے کچے پن میں ابھی اپنی شکل بگاڑ لیتی۔ حصار پار کرنے کے چکر میں تو جادو سیکھتی ہے بس اپنی آن بان شان کے لیے لیکن ہماری طرح جو سکہ بند جادوگر ہوتے ہیں ہر قدم سوچ کر اٹھاتے ہیں میں صدر دروازے کو کھلا اور ویران دیکھ کر ہی ٹھٹک گیا تھا کہ کوئی جادوگر اتنا غافل نہیں ہوسکتا۔
"پر تو اب کیا ہوگا سامری جی؟"
"بس دیکھتی رہ۔ میرا نام بھی سامری ہے ابھی میرا جادو سر چڑھ کر بولے گا۔" یہ کہہ کر سامری نے تھیلے میں سے ایک چھری نکالی اور تیزی سے کچھ پڑھنے لگا۔ اور شگفتلا کو بایاں ہاتھ آگے کرنے کو کہا۔ شگفتلا نے نہ سمجھنے کے انداز میں اپنا ہاتھ سامری

کے ہاتھ میں دے دیا سامری نے پھرتی سے اس کی ایک انگلی تھام کر چھری سے ہلکا سا چیر لگایا تو شکنتلا کی سسکاری نکل گئی اور انگلی پر خون کے قطرے نمودار ہونے لگے سامری نے وہ قطرے دوسرے بیضوی شیشے کے سفید گولے پر گرائے اس کے بعد اپنی انگلی کو چھری کے نک لگا کر خون نکالا اور وہ خون بھی گولے پر گرایا اور پھر کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا اور گولا اٹھا کر پہلے کی طرح اندر پھینکا بجائے چٹاخ پیدا ہونے کے گولا خاموشی سے دروازے کے اندر گر گیا اور معمولی وقفے کے بعد گولے سے گاڑھا دھواں نکلنے لگا جس نے پھیلنا شروع کر دیا دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں نے صدر دروازے کو گھیرے میں لے لیا۔

کچھ وقفے کے بعد دھواں تحلیل ہونا شروع ہو گیا اور واپس اسی سفید شفاف گولے میں داخل ہونے لگا لمحوں میں منظر صاف صاف ہوا تو صدر دروازہ اب سیاہ ہو گیا۔

''آؤ شکنتلا'' سامری شکنتلا کا ہاتھ تھام کر اندر گھستا چلا گیا۔ اندر ہر طرف ویرانی تھی۔

دونوں باغ، برآمدوں اور غلام گردشوں میں گھومتے رہے لیکن کوئی ذی روح دکھائی نہ دی گھومتے گھومتے محل کے پچھلے حصے کی طرف آنکلے تو انہیں چند کنیزیں دکھائی دیں وہ اجنبیوں کو دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئیں ایک کنیز بولی کون ہیں آپ اور محل میں کیسے آئے۔''

''میرا نام سامری جادوگر ہے اور محل کے اندر اور باہر جانا ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ بتاؤ کوٹھاری کہاں ہے۔''

''کنیزیں حیرت اور استعجاب سے انہیں دیکھنے لگیں۔''

''ہمیں کوٹھاری جی کے بارے میں بتانے کا حکم نہیں ہے۔'' ''کنیز بولی''

سامری نے اس کی گردن ناپ کی اور زمین سے اوپر اٹھا کر چھوڑا تو دوبارہ کنیز کے پاؤں زمین چھونے کی حسرت لے کر رہ گئے اور وہ ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی اب سامری نے دائیں ہاتھ کو کراٹے انداز میں اس کے سر پر مارا تو تڑخ کی آواز میں اس کا سر دو ٹکڑے ہو گیا۔ بے چاری کنیز چیخ بھی نہ سکی اور بے جان ہو کر گر پڑی۔ اس کے بعد سامری نے ایک دوسری کنیز کو گردن سے پکڑ لیا اور بولا۔ ''کوٹھاری کہاں ہے؟''

پہلی کنیز کا انجام دیکھ کر دوسری کنیز کو انکار کی ہمت ہی نہ رہی اور وہ تیزی سے ایک طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''وہ جو درختوں کا آخری جھنڈ نظر آرہا ہے اس کے پیچھے دائرہ کھینچ کر جاپ کر رہا ہے۔''

کنیز کا جواب سن کر سامری نے اسے چھوڑ دیا اور جدھر اس نے نشاندہی کی تھی اس طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا شکنتلا تم یہیں ٹھہرو اور اپنی پیاس بجھا کر آرام کرو میں ابھی اس راکشس کا کریا کرم کر کے آتا ہوں۔''

سامری کی باتیں سن کر شکنتلا کی آنکھوں میں چمک اور من میں خونی پیاس سر اٹھانے لگی اور وہ شہوت انگیز انداز میں کنیزوں کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی اور اپنے آپ سے بولی۔ واہ سامری جی کس وقت کیا بات یاد کرا دی۔ اس سے اچھا موقع اور حسین موسم پھر جانے کب ملے یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں بازو کھول کر سر اٹھایا اور ارد گرد سبزہ زار کو دیکھتے ہوئے ہولے ہولے پیروں سے گھومنے لگی آنے والے لذت آفریں لمحات کے تصور سے اس پر نشہ چھانے لگا تمام کنیزیں جو کچھ سمجھ نہ پائی تھیں حیرت سے اسے دیکھے جا رہی تھیں گھومتے گھومتے شکنتلا نے زور سے پھنکاری ماری اور شیش ناگن کے روپ میں زمین پر لوٹیں مارنے لگی۔ یہ محیر العقول منظر دیکھ کر کنیزیں خوفزدہ ہو گئیں چلاتی ہوئی ایک دوسرے سے پیوست ہونے لگیں۔

معمولی وقفے سے شیش ناگن پھر پھنکاری اور اگلے ہی لمحہ شکنتلا اپنی آن بان شان کے ساتھ کھڑی تھی اب وہ پوری طرح کسی ریاست کی ملکہ دکھائی دے رہی تھی شانوں پر بکھری زلفیں اور سر پر سونے کا قیمتی لیکن چھوٹا سا تاج پاؤں میں کھسے اور چہرہ سولہ سنگھار سے لبریز پھر شکنتلا کے ہونٹ ہلنے لگے اور ایک سمت میں ہلکی سی پھونک ماری تو ہیرے زیورات سے مزین شاہی تخت عالم غیب پر ظہور پذیر ہو گیا۔

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط ماہ جنوری میں ملاحظہ کیجیے)

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی



نوری اور بشی

جاوید راہی



آتشی مخلوق سے خاکی مخلوق کے جرائم کا پُر اسرار شاخسانہ

میرا نام محمد بشیر ہے اور میں ذات کا اوڈھ ہوں۔ ہمارا روز اول سے خاندانی روزگار بھیڑیں پالنا اور محنت مزدوری کرنا ہے۔ ہماری عورتیں بھی ہمارے ساتھ مل کر زیر تعمیر بلڈنگوں میں کام کرتی آ رہی ہیں مگر نئی نسل نے بھیڑوں کے ساتھ ساتھ گائے کے بھی ریوڑ بنالئے ہیں اور ساتھ میں چوری اور ڈکیتی کا بھی دھندہ شروع کر دیا ہے۔

پولیس مقابلے میں قتل و غارت گری بھی عام ہو کر رہ گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے میرے گھر میں کوئی بھی ایسا کام نہیں جس میں شرمندگی اٹھانی پڑے۔ والد صاحب سعودی عرب میں بطور کاریگر گئے اور کچھ ماہ بعد مجھ سے بڑے دونوں بھائیوں کو بھی اسی کمپنی میں لیبر کے ویزہ پر بلوالیا۔ پیچھے چھوٹا ہونے کے ناطے میں گھر میں رہ گیا، مال ڈھور کو سنبھالنا میری ذمہ داری تھی۔ سب سے بڑی بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ ایک مجھ سے بڑی بہن اور میں اپنی بھیڑوں کو دن بھر چراتے پھرتے۔ والدہ پیچھے رہ جاتی اس کے ذمہ گھرداری تھی۔

باہر سے والد روپیہ پیسہ بھجواتا تو والدہ بینک میں ڈال دیتی۔ جب بھیڑوں کے چھترے ذرا بڑے ہو جاتے تو میں بکر منڈی میں جا کر بیچ دیتا، ہم اوڈ برادری ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے کبھی اس گاؤں تو کبھی اس شہر۔ ہمارے مکان نہیں ہوتے ہم عارضی چھپر ڈال کر اس میں ہی رہتے آ رہے ہیں۔ مال کیلئے بڑے بڑے باڑے اور ان کی رکھوالی کیلئے خونخوار کتے پالنا بھی ہماری ریت میں شامل ہے۔ ہمارے کتے شیروں تک کا مقابلہ کرنے میں مشہور ہیں۔

نوری اور میں بھیڑوں کا ریوڑ لے کر پرانے قبرستان کی طرف جا رہے تھے میری بہن نوری نے مجھے آواز دی

"بوزو دکھائی نہیں دے رہا۔"

بوزو ہمارے کتے کا نام تھا بوزو صرف بول نہیں سکتا تھا مگر ہر بات سمجھ کر باقاعدہ اس پر عمل بھی کرتا میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر بوزو دکھائی نہیں دیا تو مجھے بھی پریشانی لاحق ہو گئی کہ وہ ہمارے آگے پیچھے ہی مال کے ساتھ ہوتا تھا۔ جب ہم گھر سے مال لے کر چلے تھے اس وقت تو ساتھ تھا مگر اچانک کہاں غائب ہو گیا۔

قبرستان قریب آ گیا تو بوزو مخالف سمت سے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔

"یہ بھی اب آوارہ گردی کرنے لگا ہے" نوری نے مجھے مخاطب کرتے کہا۔

جواباً میں اپنی بہن کی بات پر زور سے ہنس پڑا۔ ہم دونوں بہن بھائی مال کو چرنے کیلئے چھوڑ کر برگد کے بڑے درخت کی چھاؤں میں آن بیٹھے۔

"بشیر، اماں تیری شادی۔۔۔۔" میں نے بات کاٹتے اپنی بہن کا فقرہ پکڑ لیا ہم دونوں کی شادی۔

"ہاں ہاں اماں حاجی ابراہیم کی گھر والی سے اسی کی بات کر رہی تھی، اماں کو فکر تو ہے نا" نوری نے مجھے جواباً پھر بتایا۔

میں نے اٹھتے ہوئے مال کا رُخ جو آگے کی طرف جا رہا تھا واپس موڑنے کیلئے آواز لگائی۔ ساتھ ہی بوزو اُٹھ کر بھیڑوں کی طرف بھاگا جو قبروں کے اوپر اِدھر اُدھر منہ مار رہی تھیں۔ ایک دو بار قبروں کے متولی سے ہمارا اس بات پر جھگڑا بھی ہو چکا تھا۔ بھیڑوں کو دوبارہ قبرستان کے کونے کی طرف موڑتے میں نوری کے پاس آن بیٹھا جو ہاتھ میں پکڑی ٹہنی سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

نوری مجھ سے دو سال بڑی تھی مگر ہم دونوں میں بڑی بنتی تھی جب وہ اماں کے ساتھ شہر سودا سلف لینے جاتی تو میرے لئے جو بھی کپڑے خریدتی وہ اسی کی پسند کے ہوتے۔ میں اپنی بہن کی لائی ہوئی ہر چیز کو پسند کر لیتا تھا چاہے مجھے اچھی لگے یا نہ مگر اس کے سامنے میں تعریف ضرور کر دیتا۔

مال چرتے ہوئے جب بیٹھنے لگ جاتا تو ہمیں پتہ چلتا کہ اب ہمیں گھنٹہ بھر آرام کا موقع مل گیا ہے۔ نوری بہن ساتھ لائی ہوئی روٹی کھولتے مجھے پانی لانے کا کہتی اور میں قبرستان کے ہینڈ پمپ سے جو متولی کی کوٹھڑی کے قریب لگا تھا سے پانی لانے اُٹھ جاتا۔

جب سے ہم سکھ پور گاؤں میں آ کر آباد ہوئے تھے اپنا مال زیادہ تر اس پرانے قبرستان میں ہی لایا کرتے تھے جبکہ ہماری پکھی کے دوسرے لوگ اپنا اپنا مال شہر کی طرف لے کر جاتے تھے۔ ان کے مال میں ڈنگر ڈھور بھی تھے مگر ہمارے پاس اپنے گزارے کی صرف بھیڑیں ہی تھیں یا ان کے چھترے جو ہم عید قربان پر فروخت کرنے کیلئے پالتے تھے۔

میں جب پانی بھر کر نوری کے پاس آیا تو اس کے قریب سات آٹھ سالہ لڑکے کو بیٹھے پایا جو اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید وہ قبرستان میں فاتحہ پڑھنے والوں کے ساتھ ہو مگر دور دور تک کوئی بھی نظر نہ پڑا تو میں نے نوری کی طرف دیکھا میری آنکھوں میں اس بچے کے بارے سوال تھا۔



"بشیرا یہ اپنی ماں کی قبر پر آیا ہے گاؤں میں ہی رہتا ہے" نوری نے میرے چہرے پر اٹھنے والے سوال کو پڑھتے مجھے بتایا۔ پھر ہم کھانے میں لگ گئے۔ نوری نے اسے بھی روٹی اور چٹنی جو روٹی کیساتھ تھی دیتے ہوئے کھانے کیلئے کہا۔

ایک دو نوالے لیتے ہی تیز مرچ کے باعث اس کی زبان جل گئی اور اس نے مجھ سے پانی مانگا۔ میں نے ڈولنی سے پانی ڈال کر دیتے اس کا نام پوچھا نام تو اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لیتے اپنا نام بتایا کہ شہباز نام ہے سارے شمی کہتے ہیں۔

"گاؤں میں کس سائیڈ پر رہتے ہو؟" میرے سوال پر اس نے جواب کہ دیا مسجد والی گلی میں ہمارا گھر ہے۔ اتنا بتا کر وہ اٹھنے لگا تو نوری نے اسے روک لیا۔

"شمی بہت تیز دھوپ ہے تھوڑی دیر رک جاؤ ہم بھی واپسی کیلئے اٹھنے والے ہیں"۔

"نہیں، گھر والے پریشان ہو جائیں گے پہلے ہی کب کا نکلا ہوا ہوں" کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر قبرستان سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔

"نوری! اسے ڈر نہیں لگا یوں اکیلے قبرستان آتے"۔ میں نے اسے قبرستان سے نکل کر گاؤں کی طرف جاتے دیکھ کر پوچھا۔

"بچہ ہے، ابھی اسے ڈر ورکا کیا پتہ" نوری نے پانی والی ڈولنی اور برتن باندھتے میری بات کا جواب دیا۔

دن ڈھلنے سے پیشتر ہم دونوں بہن بھائی مال ہانکتے اپنی پکھیوں کی طرف چل پڑے تھے گاؤں سے باہر شام الاٹ والی پڑی خالی زمین پر ہمارا قبیلہ کئی سالوں سے رہتا آرہا تھا اور ہم لوگ سکھ پور کے ہی رہائشی اوڈ جانے جاتے تھے۔ اپنے مال کو باڑہ میں بند کر کے میں بھائی خلیل کی پکھی کیطرف آ گیا نوری کھانا وغیرہ بنانے کیلئے اماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

روز مرہ کی طرح ہماری پکھی کی سب سہیلیاں کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دور گپ شپ لگانے نکل جاتی تھیں۔ ہم مرد قبیلہ کے پنچ حاجی غفور کی پکھی کے سامنے اکٹھے ہو جاتے یوں رات گئے تک اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

یکدم لڑکیوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں سن کر ہم سب جو حاجی غفور کی پکھی کے آس پاس پڑی چارپائیوں پر بیٹھے تھے اٹھ کر ان کی طرف بھاگے۔ سامنے آتی لڑکیوں نے نوری کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا اور وہ بُری طرح مچل رہی تھی بار بار وہ سر گھما کر حلق سے بچوں جیسی آوازیں نکالتی اور "مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے" کی تکرار کر رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے لا کر اپنی پکھی کی چارپائی پر ڈال دیا۔

حاجی غفور اور دوسرے لوگ بھی میری پکھی پر جمع تھے، نوری کی آنکھیں اُلٹی ہوئی تھیں اور وہ بدستور وہی فقرہ بولے جا رہی تھی کہ "مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے۔"

حاجی غفور کچھ پڑھنے میں مصروف تھے وہ حافظ قرآن بھی تھے پھر انہوں نے پانی کا گلاس جو انہوں نے میری اماں سے منگوایا تھا نوری پر اُلٹ دیا۔

پانچ سات منٹ بعد نوری جیسے ہوش میں آ گئی اور جلدی جلدی اپنا آپ درست کرنے لگ گئی۔ اماں گھبرائی ہوئی حاجی صاحب سے پوچھ رہی تھی کہ کیا ہوا میری بیٹی کو؟ تو انہوں نے آہستہ آواز میں بتایا کہ اسے سایہ کی شکایت ہو گئی ہے فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائیگا میں پانی دم کر دیتا ہوں اسے وقفہ وقفہ بعد پلاتی رہنا۔

جب سب اپنی اپنی پکھی میں چلے گئے تو میں نے نوری کی چارپائی پر بیٹھتے پوچھا نوری یہ سب کیا تھا؟

اس نے میری طرف دیکھتے بڑی نقاہت بھری آواز میں بتایا کہ "وہ لڑکا جو قبرستان میں آج ملا تھا وہ درحقیقت جنات تھا اور اس کا خاندان بھی اسی قبرستان میں رہتا ہے۔ ہم جب واپس گھر لوٹ رہی تھیں تو وہ اچانک مجھے اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا اور پھر میرے کندھوں پر اِدھر اُدھر ٹانگیں رکھ کر سوار ہو گیا۔ میری گردن کو اس نے اپنے ہاتھوں میں اس طرح آہستگی سے پکڑ رکھا تھا کہ مجھے تکلیف بھی نہیں ہو رہی تھی مگر میں اپنی گردن گھما نہیں سکتی تھی جب حاجی صاحب پڑھ رہے تھے تو وہ مجھ سے یہی تکرار کر رہا تھا کہ میرے ساتھ چلو میرے گھر میں اپنے گھر والوں کو تم سے ملانا چاہتا ہوں" بتا کر نوری چپ ہو گئی۔

میرے لئے یہ سب سن کر پریشان ہونا ایک لازمی بات تھی میری اماں نوری کو ساتھ لگاتے اس کی چارپائی پر ساکت بیٹھی تھی۔ پوری رات تمام پکھیوں کے لوگ نوری کیلئے پریشان رہے۔

اماں نے نوری کو میرے ساتھ جانے سے روک لیا تھا اور میرے ساتھ خلیل کو بھیج دیا۔ ہم دونوں چچازاد تھے اور ایک دوسرے کے پکے دوست بھی۔ اماں نوری کو خلیل کیساتھ اور خلیل کی بہن شمو کو میرے ساتھ بیاہنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ خلیل بھی نوری کو چاہتا تھا اور خاصا پریشان تھا میں نے جان بوجھ کر اس سے شمی جن کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

شام کو ہم واپس آئے تو ہماری پکھی میں آس پڑوس کی پکھیوں کی عورتیں جمع تھیں اور نوری اپنی چارپائی پر بیٹھی سب سے بے نیاز عجیب عجیب حرکتیں کر رہی تھی جیسے وہ کسی کو پکڑتی اور کوئی اسے پکڑتا کبھی لیٹ کر اور کبھی بیٹھ کر اور کبھی چارپائی سے نیچے اُتر کر اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیتی۔ مجھے اور خلیل کو دیکھ کر وہ بھاگتی ہوئی پکھی کے اندر چلی گئی اور پیچھے بچھی چٹائی پر لیٹ کر اوپر چادر اوڑھ لی جیسے ہم سے چھپ گئی ہو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شمی اسے دکھائی دے رہا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو سب سے دور رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

میں نے اماں سے حاجی غفور کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کہہ رہا ہے میرے بس کی بات نہیں کسی عامل کو لانا پڑے گا اماں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو اپنے ڈوپٹے سے صاف کرتے مجھے بتایا۔

نوری کی حالت کل سے بھی بُری ہو رہی تھی۔

میں چلتا ہوا حاجی غفور کی پکھی میں آ گیا اور نوری کے بارے میں جو حالات بن چکے تھے کی بابت پوچھا تو حاجی صاحب نے کہا کہ میں مسجد کے امام کے پاس گیا تھا مگر اس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ کسی ایسے عامل کے پاس جاؤ جو جنات اور بدروحوں کو اتارنے کا ماہر ہو ہمارے بس کی بات نہیں، ابھی تو پانی سر سے اوپر نہیں گیا اور اس کا سدباب ہو جائیگا جوں جوں دن گزرتے رہے نوری اس کے قبضہ میں آتی جائیگی۔



اس کہانی کا حقیقی کردار 'نوری' جو آج بھی 'شمی' کی آمد کی منتظر ہے

حاجی صاحب کے لہجہ میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

”حاجی صاحب مجھے تو پتہ نہیں کہ عالم، عامل کہاں ملے گا؟“ میں نے تذبذب میں ہاتھ مسلتے اپنی بے بسی کا اظہار کیا ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میری حالت دیکھ کر حاجی غفور نے میری ڈھارس بندھائی اور مجھے شہر میں سائیں شیر علی کا پتہ بتایا کہ اس کے پاس جا کر ساری حقیقت بیان کرو شائد وہ کوئی مدد کرسکے۔

وہ رات تو ہم نے جوں توں کر کے کاٹی صبح میں مال خلیل کے سپرد کرتے ہوئے خود شہر جانے کیلئے ویگن شاپ پر آ گیا۔

سائیں شیر علی ریلوے پھاٹک کے پاس اسلام بلڈنگ میں کرایہ کی دکان میں اپنا آستانہ بنائے ہوئے تھا اور کافی سارے لوگ اردگرد موجود تھے میں نے ان کے قریب بیٹھتے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنی بہن کیساتھ گزرنے والے حالات سے انہیں آگاہ کیا۔

انہوں نے کہا کہ ”میں تو چل پھر نہیں سکتا میں تمہیں ایک عامل کا پتہ بتاتا ہوں تم اس کے پاس چلے جاؤ پھاٹک کے دوسری طرف شہزاد دواخانہ کے قریب وہ ملے گا۔ لیاقت عرف عامل شہباز نام ہے اس کا، سنا ہے وہ جادو ٹونہ اور جنات اُتارنے کا دھندا کرتا ہے“

میں سائیں شیر علی خان کا شکریہ ادا کرتے عامل شہباز کو تلاش کرتا اس کی جادو نگری میں پہنچ گیا۔ باہر دوکان کے چاروں جانب خوفناک شکلوں کے جنات کی تصاویر آویزاں تھیں۔ دوکان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا پہلے حصہ میں ایک نوعمر اٹھارہ سالہ عامل کرسی میز پر موجود تھا جس سے میں نے لیاقی عرف عامل شہباز کالے علم کی کاٹ، محبوب آپ کے قدموں میں، امتحان میں بغیر پڑھے کامیابی وغیرہ وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے آنے کا مقصد پوچھا تو میں نے سارے حالات اس کے گوش گزار ے۔ وہ اٹھ کر اندر گیا اور آ کر مجھے انتظار کرنے کا کہا۔ مجھ سے چائے پینے کا پوچھا میں نے پینے کیلئے ہاں کردی تو اس نے اُٹھ کر باہر کسی کو اشارہ کیا اور اندر آ کر پھر اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی اور میں کپ پکڑ کر پینے لگا۔

اسی دوران اندر سے ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نکلی جس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور کے بال اُلجھے ہوئے تھے جس کے ہاتھ میں پکڑی کتابیں دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی سٹوڈنٹ ہے اور بغیر پڑھائی کے لئے عامل شہباز لیاقو سے امتحان میں فسٹ کلاس نمبر لگوانے آئی تھی۔

میں نے جلدی جلدی چائے کا کپ ختم کیا اور لڑکے نے مجھے اندر جانے کا کہا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ناگوار سی بدبو کا احساس ہوا، میرے سامنے گاؤ تکیہ کا سہارا لئے ایک دو من وزنی پہلوان نما عامل بیٹھا تھا جس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

''آؤ بیٹا''، اس نے خمار آلود آواز میں میرا خیر مقدم کیا اور کارپٹ کے اوپر پڑی گدیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں بتاؤ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' عامل شہباز لیاقو نے میرے آنے کا مقصد پوچھا۔

میں نے سارا واقعہ پرانے قبرستان سے لیکر جو جو نوری کو پیش آیا اسے بتایا تو اس نے پچاس ہزار روپے کڑاہی کے نام پر اور آنے جانے کا خرچہ الگ مانگا۔

ٹیکسی اسٹینڈ ساتھ ہی تھا۔ اس نے لڑکے کو بھیج کر گاڑی کے مالک کو بلوایا اور سکھ پور کا کرایہ پوچھا۔ اس نے آنے جانے کے تین ہزار علاوہ پٹرول اور روٹی پانی مانگے۔ عامل لیاقت نے خود ہی بھاؤ تاؤ کیا اور پچیس سو روپے پر بات پکی کر لی۔

گھر سے چلتے وقت میں نے تھوڑے بہت پیسے پاس رکھ لئے تھے ان میں سے دو ہزار گاڑی والے کو دیئے اور باقی سکھ پور جا کر ادائیگی کرنے کا کہا۔

عامل شہباز آگے، میں اور لڑکا پیچھے بیٹھ گئے۔ گاڑی پٹرول پمپ پر آ رکی، دو ہزار کا پٹرول ڈلوانے کے بعد عامل صاحب نے لڑکے کو اور مجھے پٹرول پمپ کی شاپ سے کھانے پینے کی اشیاء لانے بھیج دیا۔ میرا سات آٹھ سو روپے کا خرچہ ہوا۔ پتہ نہیں اس کے جسم سے اتنی ناگوار بدبو کیوں اُٹھ رہی تھی۔ کھانے پینے کے بعد وہ خراٹے لینے لگا۔ اگر گاڑی کے اندر اے سی آن نہ ہوتا تو میں اس گندی بدبو جو عامل کے بھینسے نما جسم سے اُٹھ رہی تھی سے نجات پانے کیلئے گاڑی کا شیشہ نیچے کر دیتا۔

سکھ پور آتے نیم تاریکی پھیل چکی تھی اور ہم اپنی پکھیوں میں پہنچ گئے۔ اماں نے مجھے بتایا کہ نوری دن بھر اسی عالم میں رہی ہے اب تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی آنکھ لگی ہے۔ گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کروا کر میں نے خلیل کو چارپائی لانے کا کہا اور اماں کو چائے بنانے کا کہہ دیا۔

عامل لیاقی نے سب موجود لوگوں کو ہماری پکھی سے دور رہنا دیا اور ساتھ ہی بکس سے ایک بڑی سی چادر جس پر خوفناک تصویر بنی ہوئی تھی جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ شہنشاہ جنات کی تصویر ہے جو میں حاضر کرونگا اور اس کے ذریعہ سے نوری پر عاشق جن کو قابو کر کے ساتھ لے جاؤں گا تاکہ وہ پھر کبھی نوری کو تنگ نہ کرے۔ کچھ ایسا ہی لٹر پڑ اور بھی سامان تھا جو اس نے ہماری پکھی کے چاروں جانب پھیلا دیا اور خود اپنے جسم پر سیاہ رنگ کا ریشمی لبادہ پہن لیا۔

اس کیساتھ آیا لڑکا پکھی کے باہر چٹائی پر بیٹھ گیا اور کوئی عمل پڑھنے لگا جبکہ عامل شہباز لیاقی ہمیں پکھی سے دور رہنے کی تلقین کرتا میری پکھی کے اندر داخل ہو گیا اور اکٹھا کیا ہوا پردہ اس نے کھول کر پکھی کا داخلی حصہ کور کر دیا۔ نوری اُٹھ بیٹھی تھی اور سہمی نظروں سے عامل شہباز

لیاقت کی جانب دیکھ رہی تھی۔
میں نے اپنی بہن کو تسلی دیتے کہا کہ "یہ بہت بڑے عامل ہیں یہ اس جن کو پکڑنے آئے ہیں۔"
"بشیر، تم یہ سب کیوں کر رہے ہو وہ مجھے کچھ نہیں کہتا وہ تو سارا دن میرے ساتھ ہنستا کھیلتا پھرتا ہے مجھے آپی کہہ کر مخاطب کرتا ہے خود ہی چلا جائیگا۔ میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی"۔ اس سے پہلے کہ میں بولتا عامل شہباز لیاقت نے نوری کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔
"بد بخت چکمہ دیتے ہو میں بندوبست کرتا ہوں تمہارا" نوری کو یہ توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا وہ مارے ڈر کے سہم گئی۔
"بشیر تم کڑاہی کی رقم کا بندوبست کرو میں اس بد بخت کو قابو کرتا ہوں" اس نے ساتھ لائی مٹی کی ہنڈیا کا ڈھکن اُتارتے ہنڈیا زمین پر رکھتے جیب سے بڑا سارا چاقو نکالتے اسے کھولا۔
"اور ہاں تم بیٹھی سے دو سو قدم دور رہو گے اور جو حصار میں نے کھینچا ہے اس کے اندر کوئی نہ آنے پائے تمہیں سختی سے ہدایت ہے ورنہ اگر کسی کا نقصان ہو گیا تو وہ خود ذمہ دار ہوگا"۔
جی بہتر۔ میں نے اپنی بہن کی طرف دیکھتے کہا اور بیٹھی سے باہر آ گیا۔
باہر وہ لڑکا اوٹ پٹانگ کچھ اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا سارے قبیلہ کے لوگ ایک جگہ بیٹھے نوری کیلئے دعائیں مانگ رہے تھے بیٹھی کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ میرے سمیت ہر کسی کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا کہ دیکھیں اب کیا ہو؟
یکدم میری بیٹھی سے نوری کے گالی گلوچ اور مار پیٹ کی آوازیں آنے لگیں ہم سب نے سمجھا کہ اندر عامل شہباز لیاقت جنات کیساتھ ہاتھا پائی کر رہا ہے۔ اسی اثنا میں نوری درختوں سے لکڑیاں کاٹنے والا کاپا لہراتی عامل شہباز کے پیچھے بھاگتی بیٹھی سے باہر نکلی۔ عامل کی شلوار پیروں میں تھی اور وہ چیخ و پکار کر رہا تھا۔
نوری نے بتایا کہ "یہ مجھ سے بدتمیزی کرنے لگا تھا یہ کوئی عامل وامل نہیں یہ تو کوئی بدکار مسٹنڈا ہے" اُس کے منہ سے یہ سب کچھ سن کر ہم سب قبیلہ والوں نے دونوں استاد شاگرد کو جوتوں پر رکھ لیا۔ حاجی غفور نے بڑی مشکل سے ہم سب پر قابو پایا اور وہ اپنا سارا جادو ٹونہ چھوڑ کر گاڑی میں نو دو گیارہ ہو گئے۔
نوری نے مجھے بتایا کہ "بشیر، اس بچے سے مجھے کوئی خطرہ نہیں جتنا تم اس کے پیچھے پڑو گے وہ مجھے تنگ کرے گا"۔
میں اپنی بہن کی بات پر رضا مند ہو گیا اور زندگی آہستہ آہستہ پرانی ڈگر پر چل پڑی۔
اب نوری دوبارہ میرے ساتھ مال لے کر جانے لگ گئی تھی۔ قبیلہ کی دوسری لڑکیاں جو نوری کی ہم عمر تھیں اس سے ملتے کتراتی تھیں۔ میرا دھیان اپنی بہن پر رہتا، مجھے پتہ چل جاتا تھا جب شمی ہمارے درمیان آ جاتا اکثر اوقات وہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتا تھا کبھی کسی جانور کی شکل کبھی بڑے سے سانپ کی شکل، نوری ان سب کو پہچان لیتی تھی۔ میں اس دوران نوری سے دور جا کر مال کی نگرانی میں لگ جاتا۔
نوری اور شمی کی دوستی کو دوسرا سال جا رہا تھا میرے والد اور بھائی اس صورت حال سے خاصے پریشان تھے مگر میری اماں اور میں انہیں مطمئن کر دیتے کہ نوری کی جان کو کوئی خطرہ وغیرہ نہیں وہ جنات کا چھوٹا سا بچہ ہے اور نوری کو آپی کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ہماری باتوں کے باوجود میرے والد مطمئن نہیں ہو پاتے تھے۔
اب یہ ہونے لگا تھا کہ نوری راتوں کو بیٹھی سے نکل کر قریبی کھیتوں کی طرف چلی جاتی اور گھنٹوں شمی کے ساتھ گھومتی پھرتی۔ ہم ماں بیٹا بھی اس بات کے عادی ہو چکے تھے۔ جب بھی نوری کے پاس شمی آتا تو میری اماں کو اماں اور مجھے بشیر بھائی کہہ کر مخاطب کرتا نوری کی آواز اس وقت بچے کی آواز میں بدل جاتی تھی اور وہ اسی لب و لہجہ میں ہم سے باتیں کرتی رہتی۔ نوری نے بتایا کہ شمی سے چھوٹا اس کا بھائی شاہ زیب بھی ہے کل رات کو اسے بھی ساتھ لایا تھا وہ بھی مجھ سے بڑے پیار سے ملا اور ہم تینوں کھیلتے رہے تھے۔
اب یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ نوری مجھے مال کے پاس چھوڑ کر قبرستان کے آخری حصہ کی جانب چلی جاتی جہاں پہاڑی کیکروں کے گنجان جھنڈ تھے۔ نوری کی زبانی پتہ چلا کہ شمی اور اس کے گھر والے اس گنجان جھنڈ میں رہتے تھے اور وہ اس کے سارے گھر والوں کو مل چکی

تھی۔ اس نے مجھے یہاں تک بتایا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح زندگی بسر کرتے ہیں وہ باقاعدہ انسانوں میں رہ کر کام دھندہ کر کے اپنی روزی کماتے ہیں نماز قرآن کی پابندی کرتے اور سب انسان دوست ہیں۔

میں نے نوری سے اظہار کیا کہ وہ شاہ زیب کو میرا دوست بنا دے مگر اس نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کروا دیا کہ "شمی تم سے سخت ناراض ہے جو تم اس بدمعاش پاکھنڈی موٹے بھینسے کو لے آئے تھے جس نے مجھے بے آبرو کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ شمی اور شاہ زیب جا چکے تھے اگر ان کی موجودگی میں آ جاتا تو دونوں نے اسے جان سے مار دینا تھا۔"

جب سے نوری جنات میں رہ رہی تھی اس میں دن بہ دن بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں کم کم کھاتی تھی سوتی بھی بہت کم تھی الگ تھلگ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ پہلے ہم بہن بھائی جب مال نکالتے تھے تو وہ چلتے چلتے دنیا جہان کی باتیں کرتی جاتی مگر اب وہ خاموشی سے آگے چلتی رہتی۔ پہلے پہلے بوز و شمی پہ بھونکتا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بھی ان کا عادی ہو گیا نہ ان کے آنے کا کوئی نوٹس لیتا نہ جانے کا۔

میرے والد اور بھائی دو ماہ کی چھٹی پر آئے ہوئے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ نوری کی اور میری شادی کر کے جائیں مگر ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ نوری کی بات چلائیں۔ نوری پر شمی کا دبدبا پڑا ہوا تھا کہ میں نے ہمت کر کے شمی کو مخاطب کیا۔

"ہاں بولو بھائی" اس نے اپنی آواز میں جواب دیا۔

"ابو نوری کی اور میری شادی کرنا چاہتے ہیں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"۔ جواباً اس نے خاموشی اختیار کر لی اور تھوڑی دیر بعد نوری کو چھوڑ کر چلا گیا۔

نوری جب ہوش میں آتی تھی تو اسے بالکل بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ شمی سے کیا باتیں ہوئیں یا کیا چلتا رہا۔

میرے والد صاحب نے نوری پر سختی کر دی تھی کہ خبردار جو رات کو اٹھ کر اکیلی باہر گئی۔ اپنی اماں کو ساتھ لے کر جایا کرو۔ نوری حاجی صاحب سے بہت ڈرتی تھی۔

"جی اباجی"۔

نوری بے چینی کی حالت میں اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ شمی کہیں قریب ہی ہے۔ اباجی پکھی کے باہر پڑے سو رہے تھے اور اماں کی چارپائی میرے دوسری جانب تھی میں نے کروٹ لیتے اپنی ماں کا کندھا ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ نوری باہر جانا چاہتی ہے۔ اماں نے نوری کی جانب دیکھا جو اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اماں سر ہلاتی اٹھی اور دونوں ماں بیٹی پکھی سے باہر نکل گئیں۔

میں پڑا اپنی بہن کی زندگی میں اٹھنے والی اس صورتحال کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے لئے سوچتا رہا۔ کافی دیر ہو چکی تھی انہیں گئے ہوئے ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ جب سے نوری کی شادی کے بارے میں میں نے شمی سے بات کی تھی اس کے آنے کی روٹین ذرا کم ہو گئی تھی۔ آج بھی وہ تین دن کے بعد آیا تھا۔ نوری اس کے نہ آنے پر کافی پریشان تھی کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گیا۔ اماں اور نوری واپس پکھی میں آئیں تو اماں کے پاس کپڑے میں کچھ تھا میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شمی اور اس کے ماں باپ آئے تھے اور جاتے ہوئے یہ دے گئے ہیں۔ اماں نے کپڑے میں بندھے چاندی کے زیورات میرے سامنے رکھتے بتایا۔ وہ زیورات پرانے تھے مگر دیکھنے میں اچھے نظر آئے۔ یہ شمی نے نوری کی شادی کیلئے دیئے ہیں۔ شمی کی والدہ بتا رہی تھی کہ وہ زیورات اس کے ہیں اور اپنی بیٹی نوری کو اپنی خوشی سے دے رہی ہے۔

"اماں سن رکھا ہے کہ جنات جو کچھ دیتے ہیں بعد میں غائب ہو جاتا ہے" میں نے سنی سنائی بات دہرائی تو نوری بیچ میں بول اٹھی۔

"بشیر! وہ میرے ماں باپ کی جگہ ہیں بہت پیار کرتے ہیں تم نے شمی سے میری شادی کی بات کی تھی تو اس نے واپس جا کر اپنے گھر والوں کو بتایا تھا یہ جو اس کے آنے میں کئی دن لگ گئے وہ یہاں سے کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے" بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔

ہمارے لوگ سونا بہت کم استعمال کرتے ہیں زیادہ تر ہماری شادیوں پر ہماری عورتیں اور لڑکیاں چاندی کے ہی بھاری بھر کم زیورات پہنتی ہیں۔ جو دھڑکا میرے دل

میں لگا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا کہ شمی نوری کی شادی میں روڑے نہ اٹکائے۔ میرے سر پر سے بوجھ اتر گیا تھا۔ دو چار روز بعد نوری کا خلیل سے اور میرا خلیل کی بہن روشنی سے رشتہ پکا ہو گیا اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔

جوں جوں شادی کی تاریخ قریب آ رہی تھی ہم بہن بھائی جہاں اپنی اپنی شادی کیلئے خوش تھے وہاں خلیل کی طرف سے بھی پریشان ہو رہے تھے، جس نے دبی زبان میں اپنی برادری کے لوگوں کو نوری پر جن عاشق کا بھی شوشہ چھوڑا ہوا تھا جبکہ شمی نوری کو آپی کہہ کر پکارتا تھا۔ میں اور اماں شمی کے والدین کی طرف سے دیئے گئے گہنے جو خاصے سال خوردہ تھے کو لیکر سنار کے پاس آئے کہ ان کو دھو دے مگر سنار وہ خریدنے پر بضد تھا کہ میں ان کے بدلے جدید انداز کے زیورات آپ کو دوگنے وزن میں دے دیتا ہوں آپ انہیں مجھے دے دیں کیونکہ مجھے پرانی چیزیں اکٹھی کرنیکا شوق ہے مگر ہم نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور آخر کار اس نے ہمارے سامنے ان زیورات کو مختلف محلول میں ڈبو کر نکالا تو ان کے نکھار میں چمک آ گئی۔ زیورات لے کر ہم ماں بیٹا دوسری خریداری میں لگ گئے۔

آخر کار نوری خلیل کی بیوی بن گئی اور روشنی میری۔ وہ بارات لیکر ہماری پکھی میں آئے اور دوسرے روز میری بارات ان کی پکھی میں گئی۔ خوب خوشی منائی جا رہی تھی نوری کی شادی میں شمی سمیت اس کے گھر والوں نے بھی شرکت کی اور دعوت میں ہمارے ساتھ شریک رہے۔

نوری خلیل کے ساتھ بہت خوش تھی۔ جو مال پہلے روشنی اور خلیل لے کر جاتے تھے اب روشنی کی جگہ نوری اور میرے ساتھ روشنی تھی۔ روشنی کے آ جانے پر میری پکھی کے طور طریقے بدل گئے تھے نوری کا میل سب سے الگ تھا جبکہ روشنی کی عادتیں مختلف تھی۔ جب سے شادی ہوئی میری سات بھیڑیں معمولی اونچ نیچ کی بنا پر ذبح ہو چکی تھیں۔ کبھی اپھارہ ہو گیا کبھی چارہ لڑ گیا کبھی منہ خور ہو گیا میرے والد اس صورتحال سے بہت دلبرداشتہ ہو چکے تھے ان کا دھیان شب کی طرف تھا کہ یہ سب کچھ جنات کی کارستانیاں ہیں مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا لیکن اندر سے میں بھی پریشان تھا کہ صرف یہ سارا کچھ میرے مال کیساتھ کیوں؟ دوسرے لوگوں کے بھی تو

سینکڑوں بھیڑ چھترے تھے۔

گاؤں کے مولوی صاحب سے دم جھاڑا بھی کروایا حاجی غفور صاحب سے بھی تعویز لے کر بھیڑوں کے گلے میں ڈالے کوئی کہہ رہا تھا کہ روشنی کا پیر بھاری نکلا وغیرہ وغیرہ۔ جتنے منہ اتنی باتیں مگر میں کوئی نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ حاجی صاحب کے جانے کا وقت ہو گیا وہ مجھے کئی ہدایتیں دیتے واپس چلے گئے۔

اب میں اور روشنی اپنے مال کو سنبھالنے میں لگ گئے تھے۔ خلیل نوری کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا وہ اگر رات کو اٹھ کر پکھی سے نکل جاتی تو وہ بیٹھ کر انتظار کرتا رہتا مگر اس کے پیچھے ہرگز نہیں جاتا تھا۔ شمی نے دو چار بار خلیل سے بات بھی کی تھی جس کی وجہ سے اس کا ڈر قدرے کم ہو گیا تھا پھر ان کی خانگی زندگی میں شمی کی کوئی مداخلت نہیں تھی۔

رہنے سہنے کا ڈھب قدرے بدلتا جا رہا تھا۔ ہوس زر نے دونوں کو اپنا غلام بنا ڈالا تھا پے در پے بھیڑ چھترے بکنے لگے تھے قصابوں کے پاس۔ میں نے دبی زبان میں اس بات کا تذکرہ روشنی سے کیا تو اس نے یہ کہہ کر مجھے چپ کروا دیا کہ "بشیر تم نوری اور خلیل کو ان کے حال پر چھوڑ دو خلیل اپنی مرضی کا مالک ہے گھر پر اس کا ہی کنٹرول ہے ابا اماں اور دوسرے گھر کے لوگ اس کے معاملہ میں بالکل بھی دخل نہیں دیتے" روشنی نے مجھے سمجھایا۔ میں نے روشنی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

خلیل اور نوری نے اپنی پکھی ذرا دور ہٹ کر بنالی تھی۔ گو کہ وہ قبیلہ میں ہی تھے مگر سب سے الگ تھلگ ویسے بھی نوری پر جن کی وجہ سے سبھی ملنے جلنے سے کتراتے تھے۔

شمی کو نوری اور خلیل نے اپنے اشاروں پر چلانا شروع کر دیا تھا وہ دونوں اس سے سودا سلف منگوانے لگے تھے۔ پہلے پہل تو اسے پیسے دیکر بھیجتے پھر پیسوں کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب جو بھی کھانے پینے کی چیز مانگتے شمی پل بھر میں لا حاضر کرتا۔ شمی نے دونوں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ جب بھی شاہ زیب میرے ہمراہ آئے تو تم لوگ کوئی بھی ایسی بات یا فرمائش نہیں کرنا میرے والدین اس بات پر سخت ناراض ہونگے۔ وہ صوم والصلوۃ کے پابند ہیں اور ان کو یہ بات ناگوار لگے گی۔

دونوں نے مجھے جب بات بتائی تو میں نے نوری کو منع کر دیا کہ وہ تمہیں بہن کی طرح پیار کرتا ہے اور پھر وہ مافوق الفطرت مخلوق ہونے کے ناطے بھی ناراض ہو گیا تو تمہیں نقصان پہنچائے گا جیسا کہ مجھے پہنچا رہا ہے میرا مال پراسرار بیماری کا شکار ہے۔

''ارے نہیں بشیر، وہ بھلا بچہ تمہارے مال کا کیوں نقصان کریگا؟'' نوری نے میرے وسوسے کو مسترد کر تے شمی کی طرفداری کی۔

خدا کرے ایسا ہی ہو میں نے خاموشی اختیار کر لی کہ جو بھی ہو اس سے سمجھوتہ تو کرنا پڑیگا۔

خلیل کے ٹھاٹھ باٹھ بدل رہے تھے نوری بھی اس کے ساتھ شامل تھی اور اس نے دبی زبان میں یہ اظہار کر دیا تھا کہ بہت مال کی خدمت کر دیکھی اب ہم سکھ پور سے نقل مکانی کر کے شہر جانا چاہتے ہیں خلیل اب کوئی اور کام کریگا۔

اب نوری اپنے گھر والی تھی میں اس پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتا تھا اس لئے میں نے چپ سادھ لی کہ جو مرضی آئے کرو۔

خلیل تھوڑا بہت راج گیری کا کام جانتا تھا دونوں میاں بیوی سکھ پور سے شہر شفٹ ہو گئے۔ کوئی بڑی بلڈنگ بن رہی تھی دونوں کو کام مل گیا۔ نوری مزدوری کا اور خلیل کو مستریوں کا۔

اسی بلڈنگ میں انہوں نے مالک سے پوچھ کر رہائش اختیار کر لی۔ انہیں سکھ پور سے گئے تین ماہ سے اوپر ہو گئے تھے میں کبھی کبھار ان کو جا کر مل آتا تھا کئی بار میں نے خلیل کو واپسی کا کہا مگر وہ دونوں میری بات نہ مانتے اور میں مایوس ہو گیا۔

خلیل اور نوری شمی سے ایسے کام لینے لگے تھے جس میں خلیل کی چالاکی شامل تھی وہ خود کو بڑا عامل ماننے لگا تھا۔ سب سے پہلے بلڈنگ مالک حاجی نور احمد کو اس نے قائل کیا پھر یہ سلسلہ اس کے دوستوں رشتہ داروں تک پھیل گیا۔

شمی ان کے سامنے جو بھی کوئی ہوتا مختلف چیزیں ادھر ادھر کرتا تاکہ ان کو یقین آ جائے کہ خلیل کے ہاتھ میں جنات ہیں اور وہ ان سے کام لے سکتا ہے۔ کم عقیدہ کے لوگ تو دونوں میاں بیوی کو پوجنے تک جاتے۔ اگر کوئی بیمار ہوتا تو اس سے یہ کہا جاتا کہ تم پر کالے جادو کا وار کیا گیا ہے یہ ختم کرنے کیلئے جنات کو حاضر کرنا پڑے گا وہ اس کا توڑ کریں گے ان کو بلوانے کیلئے کچھ چیزیں درکار ہونگی اس پر یہ خرچ آئے گا۔

شمی کو بلایا جاتا اور طرح طرح کے ہتھکنڈے دکھا کر سائل کو قابو کیا جاتا تھا۔ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی چل رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی دھڑا دھڑ چاندی سمیٹ رہے تھے۔ جب لوگوں کے سامنے شمی کو بلایا جاتا تو خلیل اسے گالی گلوچ کرتا تاکہ وہاں موجود کام کروانے والوں پر اس کی دھاک جمے۔ نوری نے بھی وہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔

ایک دن شمی کو حاضر کرنے کیلئے آوازیں دیں تو وہ شاید کہیں دور تھا یا ویسے ہی وہ جان بوجھ کر سنی ان سنی کر رہا تھا۔ جب وہ نوری کے پاس آیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ شمی نے غصہ سے خلیل کو دھکا دیا جو اس سے بدتمیزی کر رہا تھا اور واپس چلا گیا۔

کئی دن تک شمی واپس نہ آیا دونوں کو تشویش ہوئی اور دونوں پریشان ہو گئے نوری دن رات شمی کو واپس بلانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ نہ آیا۔ اگر کوئی کام کے سلسلہ میں آتا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔

اب ان کی توجہ صرف بلڈنگ میں کام کی طرف تھی جب شمی کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ نوری کو ملنے آ گیا دونوں بلڈنگ کی چوتھی منزل پر فرنٹ کی طرف لگے بڑے بڑے لکڑی کے پھٹوں پر کام کر رہے تھے۔ خلیل کو اس کی آمد کا پتہ چل گیا تھا اس نے پھنکار کر اسے ڈانٹا کہ کہاں گئے تھے اتنے دن۔ نوری نے مداخلت کی تو اسے بھی اس نے جھڑک دیا۔

یکدم خلیل ہوا میں اچھلا اور بیچ سڑک پر گرتے تربوز کی طرح بکھر گیا۔ نوری سکتہ کی حالت میں اوپر کھڑی اس کی لاش کے گرد ہجوم کو دیکھ رہی تھی۔ نوری کے مطابق شمی کوئی بات کئے بغیر چلا گیا تھا۔ ہمیں پتہ چلا تو ڈیرہ کے دوسرے لوگوں سے مل کر ہم اس کی لاش اور نوری کو لے کر واپس سکھ پور آ گئے۔

نوری آج بھی شمی کو یاد کر کے دکھی ہو جاتی ہے اسے امید ہے کہ ایک دن شمی اچانک آ کر کہے گا۔

''آپی کیا حال ہے؟''۔

☆☆.....☆☆

جیسی کرنی ویسی بھرنی



کنول عمران خان



راہِ حق سے بھٹکی عورت کی پُر اسرار کہانی

آج خالد صاحب کی کوٹھی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی آج ان کی بڑی بیٹی کی شادی تھی، ان کے گھر کی پہلی خوشی انہوں نے دل کھول کر اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کیا تھا سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا بارات بھی آچکی تھی اور سب مہمان بھی تشریف لا چکے تھے پورا گھر روشنیوں میں نہایا ہوا تھا رات میں دن کا سماں لگ رہا تھا۔ بس نکاح ہونا باقی تھا۔

اُدھر حمنہ بھی دلہن کے روپ میں قیامت ڈھا رہی تھی وہ تو سادگی میں اتنی پیاری لگتی تھی اور کبھی کوئی میک اپ کا شوق بھی نہ تھا اس لیے آج اس پر خوب روپ آیا خوب صورت قیمتی بھاری سرخ لہنگے اور قیمتی زیورات میں سجی وہ کوئی آسمانی اپسرا لگ رہی تھی جس نے بھی دیکھا بس دیکھتا رہ گیا وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی وہ سب اسے چھیڑ رہی تھیں اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتیں اور وہ شرم سے گلنار ہوتی جا رہی تھی ابھی اسے اس کے کمرے میں بٹھایا ہوا تھا نکاح کے بعد اسے اسٹیج پر لایا جانا تھا سب کے چہروں پر خوشی ناچ رہی تھی کہ اتنے میں حمنہ کی چھوٹی پھوپھو آسیہ کمرے میں داخل ہوئیں اور سب کو کمرے سے باہر جانے کو کہا۔

''چلو چلو لڑکیو! سب باہر جاؤ قاری صاحب آرہے ہیں نکاح کے لیے اور ساتھ کچھ آدمی بھی ہونگے اس لیے تم سب اب باہر جاؤ۔'' سب لڑکیاں باہر جانے لگیں حمنہ بھی اپنا گھونگھٹ ٹھیک کر کے بیٹھ گئی۔

پھوپھو اسکے پاس آ کے کہنے لگیں بیٹا یہ پانی پی لو انہوں نے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ کیا ہے پھوپھو حمنہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''ارے بیٹا یہ دم کیا ہوا پانی ہے اللہ تمہاری قسمت اچھی کرے بری نظر سے بچائے اس لیے لائی ہوں چلو جلدی سے پی لو۔'' پھوپھو نے حمنہ کو سوچتے ہوئے دیکھا تو کہا ''چلو بیٹا جلدی کرو مولوی صاحب آرہے ہیں۔'' حمنہ کو سوچنے کا وقت ہی نہیں دیا حمنہ نے پانی پی کر گلاس پھوپھو کی طرف بڑھا دیا۔

''شاباش میری بچی ہمیشہ خوش رہو اچھا بیٹا اب تم بیٹھو میں آتی ہوں۔'' حمنہ کا گھونگھٹ ٹھیک کر کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ آسیہ پھوپھو اب بہت خوش تھیں کیوں کہ ان کا کام پورا ہو گیا تھا اب انہیں اور کچھ نہیں کرنا تھا صرف بیٹھ کر تماشا دیکھنا تھا اس لیے وہ سکون کا سانس لے کر نیچے چلی گئیں۔

☆......☆......☆

جس کمرے میں حمنہ تھی وہ اوپر کی منزل پر تھا نیچے سب مہمان موجود تھے حمنہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی اس کو یکدم اپنا بدن اور کندھے بھاری بھاری لگنے لگے وہ سمجھی شاید زیادہ دیر بیٹھنے کی وجہ سے ہو رہا ہے اس نے پلنگ کے ساتھ ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ''امی نکاح شروع کروائیں حمنہ تیار ہوگئی ہے۔'' حمنہ کی بہن حنا نے امی کے کان میں آ کر کہا ''اچھا بیٹا میں تمھارے پاپا سے کہتی ہوں۔'' زبیدہ بیگم یہ کہہ کر چلی گئیں۔ ''وہ میں یہ کہہ رہی تھی حمنہ تیار ہے آپ نکاح کے لیے کہہ دیں۔'' زبیدہ بیگم نے اپنے شوہر خالد کو کہا ''اچھا بیگم میں مولوی صاحب سے کہتا ہوں ویسے بھی دیر بہت ہوگئی ہے جلدی نکاح ہو پھر کھانا لگوا دیں'' یہ کہہ کر وہ آدمیوں کی طرف چلے گئے۔

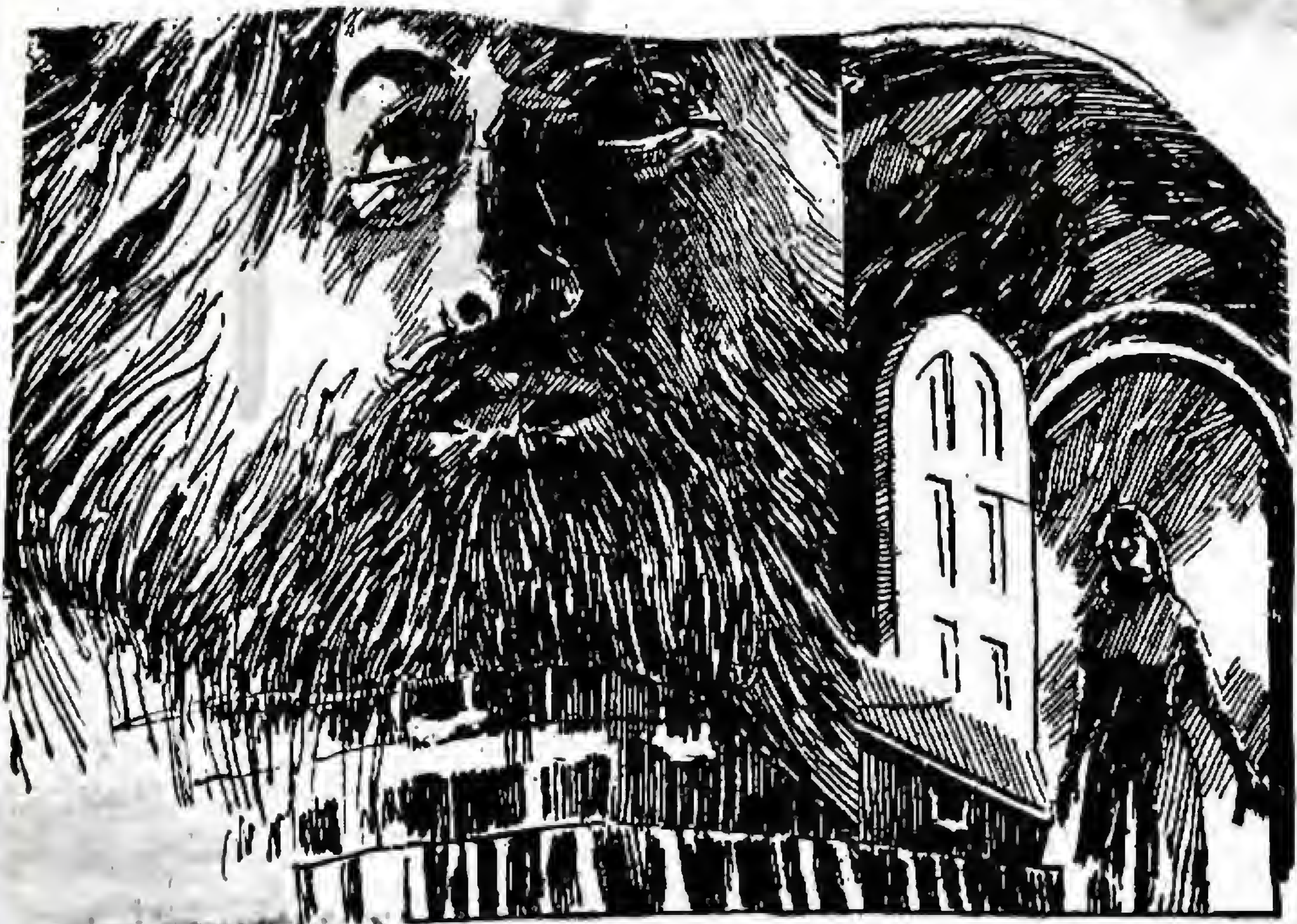
☆......☆......☆

اچانک ایک دل خراش چیخ سنائی دی۔ سب جہاں تھے وہیں رہ گئے سب کی نظریں اوپر کی طرف اٹھ گئیں کیوں کہ آواز اوپر سے آئی تھی جب وہاں دیکھا تو سب دم بخود رہ گئے حمنہ گیلری میں کھڑی تھی مگر اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی دوپٹہ غائب تھا سارے بال کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں لہرا رہے تھے، آنکھیں لال انگارہ بنی ہوئی تھیں اور وہ کانپ رہی تھی۔ زبیدہ بیگم اور حنا تو حیرت زدہ کھڑی تھیں سب مہمان دم بخود تھے آخر ہمت کر کے خالد صاحب اوپر گئے۔

''کیا.....کیا ہوا بیٹا؟'' انہوں نے حمنہ کو کندھوں سے پکڑا ''دور ہو جا۔ حمنہ نے انہیں اتنے زور کا دھکا دیا کہ وہ سیڑھیوں پر سے گر پڑے کچھ آدمیوں نے فوراً آگے بڑھ کے انہیں اٹھایا انہیں معمولی چوٹیں آئی تھیں۔

''خبردار جو کوئی میرے قریب آیا۔'' اب کی بار زبیدہ بیگم نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''بیٹا یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''

''ہاہاہا کیا ہوا ہے؟ کس کو کیا ہوا ہے؟ پتہ نہیں تمہیں پتہ ہے تو بتا دے بڑھیا ہاہاہا۔'' اس کی آواز بہت بھاری ہوگئی تھی، اور جس لہجے میں وہ بات کر رہی تھی وہ اسکا لہجہ نہیں تھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی نیچے کی طرف آ گئی تو سب پیچھے ہٹنے لگے وہ سیدھا دولہا کی طرف آئی اور اس کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بولی ''تجھے بڑا شوق چڑھا تھا نا شادی کرنے کا کر مجھ سے شادی بول کرے گا شادی مجھ سے؟



بول.....؟ بولتا کیوں نہیں؟'' سجاد کا تو مارے خوف سے برا حال تھا اس سے تو بولا نہیں جا رہا تھا وہ ایک دم سے اسے چھوڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگی اور پھر اپنا سر پکڑ کر گردن کو خوب زور زور سے ہلانے لگی تھی جیسے کہ کوئی کھلونا ہو یہ نظارہ دیکھ کر تو سب کی ہی چیخیں نکل گئیں کچھ کمزور دل خواتین تو بے ہوش ہو گئیں اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور وہ بھیانک لگ رہی تھی۔

زبیدہ بیگم تو مسلسل روئے جا رہی تھی ''کوئی تو روکو میری بچی کو کیا ہو گیا ہے؟'' مگر کوئی آگے بڑھنے کو تیار نہ تھا وہ گول گول گھومتے گھومتے آخر خود ہی ایکدم سے زمین پر گر گئی اور بے ہوش ہو گئی۔

اس کے گرتے ہی حنا، اور زبیدہ بیگم اور کچھ خواتین بھاگ کر اس کے پاس گئیں اور اسے اپنے کمرے میں لے گئیں سب مہمانوں میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں کہ یہ سب آخر کیا چکر ہے؟''

''تم لوگوں نے ہمیں دھوکے میں رکھا تھا، اور اس آسیب زدہ لڑکی کو ہمارے پلے باندھ رہے تھے وہ تو شکر ہے، وقت رہتے سب ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ چلو بھئی بارات واپس لے چلو۔ مجھے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے یہ لڑکی نہیں لے کر جانی۔'' سجاد کی والدہ صاعقہ بیگم نے اعلان کر دیا، تو سب مہمانوں میں ہل چل مچ گئی۔

''خدا کے لیے ایسا مت کریں میری بیٹی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ اُسے کوئی آسیب نہیں ہے۔'' خالد صاحب گڑ گڑائے۔

''اچھا تو پھر یہ سب کیا تھا؟ جو تماشہ ہوا ابھی وہ سب نے دیکھا ہے'' صاعقہ بیگم غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں ''پتہ نہیں بہن کیا ہوا ہے؟ ہم خود سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے؟'' خالد صاحب ہاتھ جوڑنے لگے تھے

''نا بابا! نا ہم تو آنکھوں دیکھی مکھی نگل نہیں سکتے۔ بھائی! ہمیں تو معاف ہی رکھو۔'' چلو بیٹا انہوں نے سجاد کی طرف اشارہ کیا تو وہ پہلے ہی ڈرا ہوا بیٹھا تھا فوراً کھڑا ہو گیا۔ ''بیٹا تم تو سمجھدار ہو اپنی امی کو سمجھاؤ'' خالد صاحب نے التجائی نظروں سے سجاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''بارات چلی جائے گی تو میری بیٹی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔''

''تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اس اثرات والی لڑکی کو ہم بیاہ کر لے جائیں تا کہ ہم سب کی موت اس کے ہاتھوں ہو جائے۔'' صاعقہ بیگم نے تنک کر کہا۔

انکل امی ٹھیک کہہ رہی ہیں سوری انکل۔'' سجاد نے سر جھکا لیا اتنے میں زبیدہ بیگم باہر آ گئیں۔

''صاعقہ بہن خدا کے واسطے اس طرح مت کرو ابھی میری بیٹی ٹھیک ہے ہم اسکا علاج کروائیں گے۔'' زبیدہ بیگم نے کہا ''تم لوگ کرواتے رہو اس کا علاج ہمیں تو معاف ہی رکھو'' انہوں نے کافی منت سماجت کی مگر سب بے سود رہا۔

آخر بارات واپس چلی گئی خالد صاحب تو ادھر ہی بیٹھ گئے اور زبیدہ بیگم بے ہوش ہو گئیں حنا دونوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ روئے جا رہی تھی خاندان کی عورتیں زبیدہ بیگم کو کمرے میں لے گئیں اور ہوش میں لانے لگیں چند لمحوں میں خوشیوں بھرا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ ہر شخص پریشان اور اداس تھا سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ اچانک حمنہ کو کیا ہو گیا؟ سب خالد صاحب کی فیملی کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی بیٹیوں کو بھی کبھی آج تک سننے میں بھی نہیں آیا تھا پھر ایک دم سے اتنا سب کچھ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر بعد حمنہ کو بھی ہوش آ گیا مگر اسے کچھ یاد نہ تھا کہ کیا قیامت گزر گئی۔ جب اسے سب حالات کا پتہ چلا تو وہ سکتے میں آ گئی وہ زندہ لاش کی طرح بیٹھی سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو گیا؟ پھر سب لوگ انہیں تسلیاں دے کر اور افسوس کر کے چلے گئے تو زبیدہ بیگم حنا کے گلے لگ کر خوب روئیں یا ''اللہ یہ سب کیا تھا؟ یہ کیسی آزمائش تھی؟ میری بیٹی کی زندگی میں خوشیاں آتے آتے رہ گئیں۔ کس نے ہماری خوشیوں کو نظر لگائی ہے؟ کیا قصور تھا میری بچی کا؟'' وہ ہچکیوں سے رونے لگیں۔

''امی بس کریں آپ کی طبیعت اور زیادہ بگڑ جائے گی۔'' حنا ماں کو چپ کرانے لگی۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہے جو کہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑے سے بڑے صدمے کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح وقت گزرنے لگا۔ اور پھر اس رات کے بعد حمنہ کے ساتھ کوئی بھی واقعہ نہ گزرا۔ خالد صاحب نے بہت علاج کروایا۔ کافی ٹیسٹ کروائے مگر سب رپورٹس کلیئر تھیں مگر زبیدہ بیگم کو تسلی نہ ہوئی کسی کو بتائے بغیر ایک عامل کے پاس گئیں ان سے فریاد کی انہوں نے بتایا کہ "ایسا کوئی عمل کروایا گیا تھا کہ شادی رک جائے اور بندہ آپکے خاندان کا ہے" مگر نام نہیں بتایا۔

زبیدہ بیگم پریشان تھیں کہ آخر کون ہمارا دشمن ہے؟ مگر جب کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو سب اللہ پہ چھوڑ کر بیٹھ گئیں کہ جس نے کیا ہے۔ اللہ ہی بدلہ لیں گے اور حمنہ تو بالکل گم صم ہوگئی اس نے کہیں آنا جانا سب چھوڑ دیا تھا کیوں کہ لوگوں کی نظروں سے اسے پیغام ملتا تھا کہ یہ وہ لڑکی ہے جس کی بارات واپس گئی تھی۔" اس لیے وہ اپنے گھر میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔

آج آسیہ پھوپھو کے گھر میں بہت ہلچل تھی ہر کوئی مصروف نظر آرہا تھا اور آسیہ بیگم بھی ادھر ادھر پھر رہی تھیں اور کیوں نہ ہوتیں آج ان کی بیٹی کا رشتہ جو پکا ہونے جا رہا تھا اور وہ بھی سجاد سے ہاں وہی سجاد جو بھی حمنہ کے گھر بارات لے کر گیا تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ آسیہ بیگم خالد صاحب کی اکلوتی اور منہ پھٹ بہن تھیں ان کی چار بیٹیاں تھیں اور وہ بھی بالکل اپنی ماں کی طرح منہ پھٹ بدلحاظ اور فیشن ایبل تھیں کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی تھیں ہر بات میں اپنی بڑائی ظاہر کرنا ان کی فطرت میں تھا یہی وجہ تھی کہ ابھی تک وہ چاروں غیر شادی شدہ تھیں اپنے خاندان والوں کو تو سب کو پتا تھا اس لیے کوئی نہ آتا تھا اگر باہر سے کوئی رشتہ آجاتا تو وہ ان کی زبان درازی اور طور طریقہ دیکھ کر واپس نہ پلٹتے باپ تو کب سے فوت ہو گیا تھا اور کافی پیسہ چھوڑ گیا تھا اس لیے گزر بسر میں کوئی تنگی نہ تھی ایک بار آسیہ بیگم کی بڑی بیٹی کا رشتہ آیا باہر سے اس دن آسیہ بیگم کی طبیعت پہلے سے خراب تھی تو حمنہ اچانک پھوپھو کی طرف ان کی طبیعت کا پوچھنے چلی گئی وہ رشتہ سجاد کا تھا وہ لوگ آئے تو حمیرا کو دیکھنے کے لیے تھے مگر حمنہ کو دیکھا تو اسے پسند کر لیا اور گھر جا کر حمنہ کے لیے ہاں کر دی۔

آسیہ بیگم کہاں چپ رہنے والی تھیں ان کو تو گویا پتنگے لگ گئے وہ حمنہ میں لاکھ برائیاں گنوانے لگیں یہ بھی نہ سوچا ان کی بھتیجی ہے جو منہ میں آیا بولتی گئیں مگر لڑکے والوں نے اپنے طور پر پتہ کروایا کیوں کہ سجاد کو حمنہ بہت پسند آگئی تھی اور اس طرح وہاں بات پکی ہوگئی جب آسیہ بیگم کو پتا چلا تو وہ بھائی بھابی سے خوب لڑیں کہ تمہاری بیٹی نے میری بیٹی کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے مگر انہوں نے کہا ہمیں تو کچھ نہیں پتا اگر ہمیں پتا ہوتا تو ہم کبھی ہاں نہیں کرتے۔

اصل میں سجاد کی فیملی بہت امیر اور پڑھی لکھی تھی اور وہ تھا بھی اکلوتا اور شادی کے بعد اس کو باہر چلے جانا تھا۔ یہ سب باتیں آسیہ بیگم سے ہضم نہیں ہو رہی تھیں پھر جب حمنہ کی تاریخ پکی ہوئی تو بھائی اور بھابی دونوں انھیں منانے آگئے۔

"دیکھو آسیہ یہ سب فیصلے تو آسمانوں پر ہوتے ہیں انہیں اگر حمنہ پسند آگئی تو کیا ہوا تمہاری بیٹیاں بھی میری ہی ہیں میں فوراً ان کے لیے اچھے رشتے تلاش کروں گا" خالد صاحب نے بہن کو اپنائیت سے سمجھایا

"دیکھیں آسیہ آپا یہ بھی آپ کی بیٹی ہے اور آپ ہی ناراض ہو گئیں تو کیسے ہوگا یہ سب؟" بھابی نے پیار سے اسے کہا اور پھر جانے کیا سوچ کر آسیہ بیگم راضی ہو گئیں اس وقت کسی کو شک بھی نہ گزرا تھا کہ آگے جا کر کیا ہونے والا ہے؟ آسیہ اتنی آسانی سے تو ہار نہیں ماننے والی تھی اور پھر جو بھی ہوا وہ سب ان کا ہی دھرا تھا اور پھر کچھ ہفتوں بعد نجانے آسیہ بیگم نے کیا چکر چلایا کہ وہ رشتہ پھر سے حمیرا کے لیے آگیا۔

"ارے میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے مگر آپ کو حمنہ کا بھوت سوار تھا اب ہوگئی تسلی؟" آسیہ بیگم نے سجاد کی ماں سے شکوہ کیا۔

"بس بہن کیا کریں اپنے بیٹے کی ضد کے آگے مجبور تھے مگر ہمیں کیا پتا تھا وہ آسیب زدہ ہے" سجاد کی ماں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"بس بہن چھوڑیں اور منہ میٹھا کریں۔" اور

یوں دونوں نے ایک دوسرے کو مٹھائی کھلا کر بات پکی کی شادی اگلے ماہ طے ہوئی جب سارے خاندان میں بات پھیلی تو بہت چہ مگوئیاں ہوئیں پھوپھو کو سب جانتے تھے کہ انہوں نے یہ رشتہ کس طرح اپنی طرف موڑ لیا ہے غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

آسیہ بیگم نے بھائی کے گھر شادی کا کارڈ بھجوایا اور خود گھر نہ آئیں اور شادی پر خالد صاحب کے گھر سے کوئی نہ گیا انہیں بہت دکھ تھا کہ آسیہ نے ذرا بھی خیال نہ کیا۔ ان لڑکے والوں نے ان کی کتنی بے عزتی کی بارات واپس لے کر گئے مگر بہن نے انہیں سے رشتہ جوڑا۔ ''آپ کن سوچوں میں گم ہیں؟'' زبیدہ بیگم نے کمرے میں آ کر انہیں سوچتے ہوئے دیکھ کر پوچھا'' کچھ نہیں بیگم بس''

''آپ بھی نا اپنی بہن کو سمجھ نہیں سکتے۔'' زبیدہ نے دکھ سے کہا'' آپ یقین کریں یا نہ کریں مجھے تو حسنہ کی حالت کی ذمہ دار آسیہ ہی لگتی ہے۔ اس دن جو بھی ہوا پھر کبھی نہ ہوا حسنہ بالکل ٹھیک ہے یہ سب میری بیٹی کی شادی رکوانے کے لیے تھا ورنہ آج پھر آسیہ اسی جگہ اپنی بیٹی نہ دیتی آپ کی بہن کچھ بھی کر سکتی ہے اور یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔'' زبیدہ پھر سسکنے لگی۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر کیا کریں اب؟'' خالد نے سوچتے ہوئے کہا'' بس میں تو دعا کروں گی اگر اس میں آسیہ کا ہاتھ ہے تو جس طرح اس نے ہمیں دکھ دیا ہے اسے بھی خدا کبھی خوش نہ رکھے اور میرا فیصلہ اللہ کرے گا۔'' یہ کہہ کر زبیدہ پھر سے رونے لگیں۔

بس پھر کیا تھا شادی ہونا تھی۔ ہو گئی۔ کچھ ٹائم سکون سے گزرا مگر حمیرا نے اپنے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے ظاہر ہے اس کی جو فطرت تھی کہاں بدل سکتی تھی وہ ہر بات میں اپنی من مانی اور ضد کرتی تھی ساس نندوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتی سب الگ پریشان تھے کہ اسے کیا ہو گیا؟ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ حمیرا کن کن عادات کی مالک ہے سجاد بھی اس کو اس کے رویے پر سرزنش کرتا تھا مگر اس کی عادتیں وہ بھلا کب چھٹنے والی تھیں، ساتھ ہی اس کو اپنی ماں کا سہارا تھا وہ بھی اس کی ان باتوں پر اس کو منع نہیں کرتی تھی بلکہ ادر شہ دیتی تھی اس طرح گھر میں ہر وقت جھگڑا رہنے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتی کہ سارا محلہ سنتا اور سجاد کی ماں اس دن کو کوستی جب وہ اسے بیاہ کر گھر لائی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو مجبوری تھی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

''امی اب میں اس قید خانے میں ان پاگلوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی کوئی ایسا چکر چلاؤ کہ سجاد مجھے الگ گھر لے دے ایک دن حمیرا نے موقع دیکھتے ہی فون پر ماں سے کہا'' ارے بیٹا یہ تو کوئی مسئلہ نہیں میں بابا جی سے بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں'' اس کی امی نے کہا اور حمیرا نے فون بند کر دیا صاعقہ بیگم کو آس پاس سے یہ بھی پتا چلنے لگا تھا کہ یہ لوگ ٹھیک نہیں جادو ٹونے کروانے کے ماہر ہیں ورنہ اس طرح کی بدتمیز اور منہ پھٹ لڑکی کو کون بیاہتا۔ جادو کا سن کر تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے وہ حمیرا کی ان حرکات کو سوچنے لگیں جو وہ کرتی تھی کبھی کبھی وہ اکیلے کمرے میں بیٹھے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی ہوتی تھی اور اس وقت وہ بہت ابر اسرار لگتی تھی مگر اس وقت ان کے دماغ میں یہ سب باتیں نہ تھیں مگر لوگوں کی زبانی یہ سن کر ان کو ہوش آ گیا اور اب انہوں نے حمیرا کی ہر حرکت پر نظر رکھنا شروع کر دی تھی اندر سے وہ بہت خوف زدہ تھیں کہ پتا نہیں یہ کیا ارادہ رکھتی ہے؟ مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ حمیرا بہت چالاک ہے اگر وہ ابھی اس کا پول کھولتی ہیں تو وہ ہنگامہ کھڑا کرے گی اور رو دھو کر خود کو سچا ثابت کر دے گی اس لیے وہ اس کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے کمربستہ ہو گئیں کیوں کہ حمیرا کی وجہ سے ان کے گھر کا سکون تباہ ہو گیا تھا اور وہ کسی طرح اس کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی تھیں اس لیے وہ اب اس کی تمام باتوں پر نظر رکھے ہوئے تھیں بیٹیوں کو انہوں نے کچھ نہ بتایا وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

''حمیرا تو سمجھ لے تیرا کام ہو گیا۔'' آسیہ بیگم نے فون پر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''سچ ماں'' حمیرا نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں میری جان۔ تو دیکھ تو سہی میں نے پکا کام

کیا ہے تیری ساس اور نندوں سے جان چھڑوانے کا پورا بندوبست کر کے آئی ہوں تو کیوں گھر سے نکلے وہ سب نکلیں اور میری بیٹی پورے گھر پہ راج کرے۔" آسیہ نے چہکتے ہوئے کہا۔

"سچ امی! یہ تو میرے دل کی بات کر دی۔ حمیرا نے خوش ہوتے ہوئے کہا مگر بیٹا اس کے لیے عمل تھوڑا مشکل ہے اگر کر سکو تو ساری عمر عیش کرو گی۔"

"نہیں امی میں کروں گی اس عذاب سے جان چھڑوانے کے لیے میں سب کروں گی آپ بتائیں تو۔" حمیرا نے راضی ہوتے ہوئے کہا "تو پھر سن" آسیہ نے بتاتے ہوئے کہا "کسی بھی طرح ان ماں بیٹیوں کے سر کے بال لے آؤ بابا نے کہا ہے ان پر سارا عمل کروں گا اور پھر بال رات کو قبرستان میں جا کر کسی قبر کے پاؤں کی طرف دبا دینا۔ پھر یہ تینوں بھی دیکھتے دیکھتے اس قبرستان کا حصہ بن جائیں گی۔"

"باقی سب تو ٹھیک ہے۔ مگر رات کو قبرستان جانا ذرا مشکل ہے۔" حمیرا نے انجانے خوف سے کہا "بس ڈر گئی" ماں نے کہا "چلو میں بھی ساتھ جاؤں گی۔" "اب ٹھیک ہے ہاں اماں اب ٹھیک ہے" حمیرا نے مطمئن ہو کر کہا۔ "بس اب میری بچی تو ذرا گھر والوں سے گھل مل کر رہ انہیں تجھ پر شک نہ ہو اور تو اپنا کام آسانی سے کرے۔ تو سمجھ رہی ہے نا میری بات کو" ماں نے پوچھا "ہاں اماں تو فکر ہی نا کر آخر بیٹی کس کی ہوں۔" سب سمجھ گئی حمیرا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور آسیہ بیگم بھی ہنسنے لگیں۔ صاعقہ بیگم کافی دنوں سے حمیرا کے بدلے ہوئے تیور دیکھ رہی تھیں سب سے گھل مل کر رہنا، ہنسنا بولنا وہ سمجھ گئیں دال میں کچھ کالا ہے یہ سب طوفان آنے سے پہلے کی خاموشی ہے کچھ نہ کچھ تو کرنے والی ہے ورنہ یہ تو سیدھے منہ کسی سے بات بھی نہیں کرتی اس لیے وہ اس کی ہر حرکت پر غیر محسوس طریقے سے نظر رکھے ہوئے تھیں۔

ایک دوپہر وہ اپنے کمرے میں تھیں کھانے کے بعد انہیں تھوڑا آرام کرنے کی عادت تھی وہ لیٹی تو سو گئیں کہ دروازہ کھلنے کی آہٹ سے ان کی آنکھ کھل گئی ان کی نیند کچی تھی وہ بیدار تو ہو گئیں مگر ظاہر نہ کیا اور آنکھیں بند ہی رکھیں کیوں کہ انہوں نے کمرے میں حمیرا کو آتے دیکھ لیا تھا اور انہیں یقین تھا کہ یہ کچھ نہ کچھ کرنے آئی ہے اس لیے وہ آنکھوں کی جھری بنا کر دیکھنے لگیں حمیرا دبے پاؤں اندر داخل ہوئی پہلے ساس کی طرف آئی انہیں سوتا پا کر وہ سیدھا ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی وہاں سے اس نے ہیئر برش اٹھایا اس میں تھوڑے سے بال تھے اس نے احتیاط سے وہ بال اٹھا کر مٹھی میں دبا لیے اور پھر ساس پر ایک نظر ڈال کر وہ باہر نکل گئی۔

صاعقہ بیگم سب دیکھ رہی تھی اس کے باہر جاتے ہی وہ ایک دم اٹھ بیٹھیں وہ اس کے پیچھے دبے قدموں سے باہر نکلیں۔ دیکھا حمیرا اپنی نندوں کے کمرے کی طرف جا رہی ہے وہ دونوں بھی اپنے کمروں میں سو رہی تھیں حمیرا ابھی وہاں سے بھی ایسے ہی دونوں کے بال حاصل کیے اور جب وہ پلٹی تو صاعقہ بیگم جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی تھیں اتنا تو وہ جانتی تھیں کہ سر کے بالوں پر جادو کیا جاتا ہے وہ یہ سوچ کر اندر سے کانپ گئی کہ یہ عورت ان پر جادو کروا رہی ہے ان کی نیند اور سکون سب ختم ہو گیا تھا وہ بے چین تھیں کہ کیا کروں؟ بیٹے کو بتاؤں یا بیٹیوں کو بتاؤں؟ مگر ان کی سمجھ میں ایک پلان آ گیا اور پھر وہ رات بھی آ گئی جب حمیرا کو قبرستان جانا تھا۔

☆......☆......☆

کسی طرح حمیرا نے وہ بال اپنی ماں کی طرف بھجوا دیے تھے اور ان پر پڑھا جانے والا عمل ہو گیا تھا اور پھر ماں، اس کے گھر آ کر، ملنے کے بہانے، وہ بال اس کو دے کر چلی گئی تھی۔ ان دونوں کا اگلی رات جانے کا پروگرام بھی بن گیا تھا رات 12 بجے انہیں قبرستان پہنچنا تھا یہاں سب جلدی سو جاتے تھے مگر صاعقہ بیگم آج حمیرا کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھیں آج وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھیں اور کام بھی جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی وہ سمجھ گئی آج کچھ ہونے والا ہے اس لیے جب سب سونے کے لیے چلے گئے تو صاعقہ بیگم بھی اپنے کمرے میں آ گئی مگر سوئی نہیں انہوں نے کمرے کی وہ کھڑکی کھول دی جس میں باہر کا مین گیٹ نظر آتا ہے ان کی چھٹی حس بتا رہی تھی آج کچھ

ہونے والا ہے وہ بیٹھی رہیں اور پھر انہوں نے دیکھا کہ۔
12 بجے کا وقت حمیرا کالی چادر میں لپٹی گیٹ کی طرف سے باہر جانے لگی گیٹ آرام سے کھول کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی اور پھر فون ملانے لگی، کسی سے بات کی اور پھر فون بند کر دیا صاعقہ بیگم دیکھنے لگی یہ آخر کس کو فون کر رہی تھی؟ مگر پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف سے اُس کی ماں آسیہ بیگم آ رہی ہے تو وہ سب کچھ سمجھ گئیں کہ یہ دونوں ماں بیٹی کی ملی بھگت ہے اب اور وہ بیٹھ کر تماشا نہیں دیکھ سکتی تھیں وہ فوراً اٹھیں حمیرا کا پیچھا کرنے کے ارادے سے وہ نکلیں اور اپنے بیٹے کے کمرے کی طرف بڑھیں اسے اٹھا کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا وہ پریشان ہو گیا۔
کیا بات ہے ماں؟ خیر تو ہے اور یہ حمیرا کہاں ہے؟'' اس نے حمیرا کو بستر پر نہ پا کر ماں سے پوچھا۔
''بیٹا سب بتاتی ہوں تم اب کوئی سوال نہ کرو بس میرے ساتھ چلو جلدی سب پتا چل جائے گا دیر نہ کرو ہمارے پاس ٹائم نہیں۔'' سجاد بھی ماں کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی بہت ہی گھمبیر مسئلہ ہے اس لیے سوال نہ کیے اور ماں کے ساتھ چل پڑا۔
قبرستان ان کے گھر سے دو گلیوں کے بعد آگے کھلے میدان کی طرف تھا اس لیے جب یہ ان کا پیچھا کرنے لگے تو وہ دونوں انہیں جاتی ہوئی نظر آ گئیں اب سجاد بھی کچھ سمجھنے لگا تھا وہ دونوں قبرستان میں داخل ہو کر قریب ہی ایک قبر کے پاؤں کی مٹی کھودنے لگیں آسیہ بیگم ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ کوئی آ نہ جائے اور حمیرا جلدی سے گڑھا کھودنے لگی اور پھر جب تھوڑا سا گڑھا بن گیا تو آسیہ بیگم نے حمیرا سے کہا ''بیٹا یہ سب دفن کر دے اس میں اور پھر گھر جا کر اپنی ساس اور نندوں کو بھی دفنانے کی تیاری کرنی ہے تجھے۔'' ہاہاہاہا دونوں اپنے کارنامے پر بہت خوش تھیں مگر سجاد اور صاعقہ بیگم یہ سب باتیں سن رہے تھے۔اس سے پہلے وہ یہ سب قبر میں دباتیں سجاد غصے سے کانپتا ہوا ان کے سامنے آ گیا۔
سجاد کو دیکھتے ہی حمیرا خوف زدہ ہو گئی ''تم ذلیل عورت تم اس حد تک گر جاؤ گی میں نے سوچا نہ تھا

''وہ......وہ......سجاد!'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے؟
چپ ہو جائے بے شرم عورت! اب کیا بولو گی اپنی صفائی میں؟'' ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر پڑا کہ وہ چکرا کر اسی قبر پر گر گئی ''تم دونوں جادوگرنیوں نے میری زندگی تباہ کر دی ہے اب میرے خاندان کو ختم کرنے کا سوچا؟''
آسیہ بیگم کا برا حال تھا۔'' اس سے پہلے تم میری ماں بہنوں کو مارو میں تمہیں ہی جان سے مار دوں گا۔'' یہ کہتے ہی سجاد نے اس کا گلا دبوچ لیا اور حمیرا کی آنکھیں باہر نکلنے لگیں۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھی آسیہ بیگم بھی ڈر گئی آسیہ بیگم فوراً آگے لپکی 'چھوڑ دو میری بیٹی کو معاف کر دو۔'' آسیہ بیگم رونے لگی۔
''معاف کر دوں اسے جو میری ماں بہنوں کو ختم کرنے کے لیے آئی تھی۔'' سجاد کے سر پر خون سوار تھا مگر صاعقہ بیگم آگے بڑھیں۔ چھوڑ دے بیٹا! اس کے خون سے اپنے ہاتھ مت رنگو۔ خدا کے واسطے چھوڑ دے۔'' مگر سجاد غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔
''نہیں ماں! نہیں آپ ہٹ جائیں۔'' تجھے میری قسم بیٹا چھوڑ دے اسے اس کو مارنے کے بعد تم جیل چلے جاؤ گے ہم تو ویسے ہی مر جائیں گے خدا کے لیے چھوڑ دے اسے۔'' اور سجاد نے ماں کے کہنے پر ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا وہ کھانستے ہوئے پیچھے گر گئی آسیہ فوراً بیٹی کی طرف لپکی۔'' ذلیل عورت! سن تو آج کے بعد میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔ میں تجھے ابھی اور اسی وقت طلاق دیتا ہوں سجاد اس کو غصے میں کہتا ہوا ماں کے ساتھ چلا گیا۔
حمیرا اور آسیہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان کی بازی عین وقت پر پلٹ جائے گی حمیرا دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور آسیہ کو تو سکتہ طاری ہو گیا آج اسے یاد آ رہا تھا کہ اپنی بیٹی کا گھر بنانے کے لیے اپنی بھتیجی کا گھر اجاڑا تھا مگر یہ بھی نہ سوچا تھا کہ یہ سب الٹا ہو سکتا ہے کسی نے سچ کہا ہے خدا کی لاٹھی بے آواز ہے وہ جب انصاف کرنے پر آتا ہے تو کوئی بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

☆☆......☆☆

عاشق جن

فرخندہ بتول

ایک عاشق جن کا قصہ، جس نے محبت میں جان کا نذرانہ دے دیا



آج میں جو واقعہ لکھ رہی ہوں وہ خود میری بہن کے ساتھ پیش آیا۔ یہ دسمبر 2010 کی بات ہے جب میری بڑی بہن کی شادی قریب تھی۔ سب لوگ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہماری بہن کچھ بدلی بدلی سی ہے، لیکن گھر کے بڑوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا، کہ شادی ہونے والی ہے، گھر سے چلے جانے کی وجہ سے اداس ہے۔ میں اپنی بہن زارا آپی کے ساتھ ہی سوئی تھی۔

ایک رات تین بجے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ زارا آپی رو رہی ہیں اور اپنے ہاتھ کو چوم رہی ہیں۔ اس کے بعد آپی نے بہت پیار سے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ جب میں نے ان کے چہرے کی طرف نظر کی تو میرے اندر کپکپی طاری ہوگئی میری آپی کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں جیسے ان کی آنکھوں میں خون بھر آیا ہو وہ رات اللہ اللہ کر کے ڈرتے ڈرتے گزار دی۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی سب سے پہلے میں نے رات والا واقعہ اپنی والدہ کے گوش گزار کیا میری اولدہ نے کہہ دیا تمہارا وہم ہوگا۔ تاکہ میں ڈر نہ جاؤں مگر بہن کی وجہ سے وہ فکر مند لگ رہی تھیں۔

ایک رات میری والدہ نے آپی کو دیکھا کہ وہ بال کھولے ہوئے ننگے پاؤں چلی جا رہی ہے اور ان کو آگے پیچھے کا کوئی ہوش نہیں ہے۔ والدہ صاحبہ ان کے پیچھے پیچھے چل دیں، آپی سیڑھیوں سے چلتی ہوئی چھت پر چلی گئی اور چاند کی روشنی میں آسمان کی طرف دیکھ کر خود ہی خود باتیں کرنے لگیں۔ آپی برو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں ''زارا تم میری ہو، صرف میری میں تمہیں کسی اور کا نہیں ہونے دوں گا'' یہ کہتے ہوئے ان کے منہ سے مردانہ آواز نکل رہی تھی، آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

☆......☆......☆

یہ دیکھتے ہی والدہ نے آیت الکرسی کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ ورد کے شروع ہوتے ہی آپی پیچھے کی طرف مڑیں اور خود ہی چل کر بستر پر جا کر سوگئی۔ میری والدہ نے رات والی بات کی خبر والد صاحب کو دی والد صاحب یہ بات سن کر پریشان ہو گئے، انھوں نے اپنے ایک دوست جو مولوی بھی تھے۔ پر آپی کے بارے میں بتایا انھوں نے آپی کو پلانے اور ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے تعویز دیے والدہ نے وہ تعویز آپی کے ہاتھ پر باندھ دیے اور ان کو بلا ناغہ تعویز پلانے بھی لگی ان سے یہ اثر ہوا کہ آپی ٹھیک ہوگئیں۔ لیکن جس دن آپی کی شادی کی تاریخ تھی۔ اس دن دولھا بھائی (آپی کے ہونے والے شوہر) جو کہ میری خالہ کے بیٹے بھی ہیں، ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا دولھا بھائی تین دن تک ICU میں رہے، دولھا بھائی کی جان تو بچ گئی، جو معجزہ سے کم نہیں تھی لیکن ان کو ٹھیک ہوتے ہوتے دو مہینے لگ گئے۔

والد صاحب ساری بات سمجھ گئے۔ انھوں نے دوبارہ مولوی صاحب کو فون کر کے ساری بات بتائی انھوں نے اگلے دن 4 بجے فون کرنے کو کہا۔ دوسرے دن والد صاحب نے فون کیا تو انھوں نے بتایا کہ آپ کی بیٹی پر ایک جن عاشق ہوگیا ہے۔ جب تم نے میرے دیے ہوئے تعویز اپنی بیٹی کے ہاتھ پر باندھے تو اس کے اثر سے وہ اس کے قریب بھی نہیں جا سکتا تھا اس کو غصہ آیا اور اس نے احمد علی (دولھا بھائی) کو نقصان پہنچایا ہے۔ میرے ہاتھوں سے تو یہ معاملہ نکل چکا ہے لیکن تم فکر نہ کرو میں تمہیں ایک عالم کا پتہ دے رہا ہوں تم ان سے مل لو۔

☆......☆......☆

مولوی صاحب نے میرے والد کو پتہ دے دیا جب میرے والد صاحب ان سے ملنے گئے تو پتا چلا کہ عامل صاحب سات دن کے لیے اپنے کسی مرید سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات سات دن بعد ہوگی ان ہی دنوں دولھا بھائی کا فون آیا کہ ہم چاہتے ہیں زارا کو سادگی سے نکاح کر کے لے جائیں۔

میرے والد صاحب اور پریشان ہوگئے۔ والدہ نے ان کو دلاسہ دیا کہ تعویز تو زارا نے باندھے ہی ہیں کچھ نہیں ہوگا، ہم بعد میں زارا کو عامل صاحب کے پاس لے جائیں گے۔ دولھا بھائی کا نکاح آپی سے بخیر و عافیت ہوگیا۔ زارا آپی ہم سب کو روتا ہوا چھوڑ کر پیا دیس سدھار گئی۔

ہمیں رات کے چار بجے دولھا بھائی کا فون آیا

کہ جلدی آ جائیں زارا کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ ہم لوگ پریشان ہو کر دولھا بھائی کے گھر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ دولھا بھائی کہ کپڑے گریبان سے پھٹے ہوئے ہیں اور چہرے پر جگہ جگہ خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ آپی اس دنیا سے بے نیاز بے ہوش پڑی تھیں۔

والد صاحب نے پوچھا یہ سب کیسے ہوا؟

دولھا بھائی نے بتایا کہ جب ہم زارا کو گھر لے کر آئے تو اس نے دولھا بھائی کو گریبان سے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا اور مارتی ہوئی بار بار مردانہ آواز میں کہہ رہی تھی کہ ''زارا صرف میری ہے صرف میری میں اس کو کسی کا نہیں ہونے دوں گا'' اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ وہ ہماری خالہ (دولھا بھائی کی والدہ) نے جب دیکھا تو قرآن پاک کی ہوا زارا آپی کو دینے لگیں اور باقی سب کو کہا وہ دعائیں پڑھیں۔ جیسے جیسے ہوا دی جا رہی تھی اور دعائیں پڑھی جا رہی تھیں زارا چیخنے لگی اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ گئیں اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

☆......☆......☆

والدہ صاحبہ سوچ میں پڑ گئی کہ جب آپی نے تعویز باندھا ہوا تھا تو ایسے کیسے ہوا؟ والدہ کو یاد آیا کہ ہو سکتا ہے جب وہ نہانے گئی ہو تو وہ تعویز اتار دیا ہو اور واپس باندھنا بھول گئی ہو۔ آخر تمام بات والد صاحب نے دولھا بھائی کو بتا دی۔ خالہ نے تمام بات سن کر برا نہیں منایا بلکہ یہ کہا کہ آپ نے ہمیں اعتماد میں نہیں لیا ہم کون سے غیر تھے۔ عامل بابا کو آنے میں دو دن رہ گئے تھے۔ دو دن تک آپی بے ہوش رہی۔ اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔

دو دن بعد دولھا بھائی اور والد صاحب آپی کو اس عامل کے پاس لے کر گئے۔ عامل بہت نورانی شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ایک گول دائرہ کھینچا اور ساتھ ہی کڑاہ میں تیل کو گرم کیا اس کے بعد دولھا بھائی اور والد صاحب کو اس دائرے میں بیٹھنے کے لیے کہا یہ ہدایت کی گئی کہ جب تک میں نہ کہوں اس دائرہ سے باہر نہ نکلنا چاہیے،

کچھ بھی ہو جائے انہوں نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا جیسے جیسے عامل بابا پڑھتے رہے آپی نے حرکت کی اور آنکھیں کھول دیں۔

☆......☆......☆

عامل صاحب نے اس سے پوچھا کون ہے'' تو اور کیوں اس لڑکی کے پیچھے پڑا ہے؟''

آپی نے مردانہ آواز میں کہا کہ ''میں جن ہوں اور زارا سے پیار کرتا ہوں'' عامل صاحب نے کہا اس کا پیچھا چھوڑ دے آپی نے کہا ''میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا اور اس چاند کی چودھویں کی رات لے جاؤں گا میں نے ان میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا لیکن پھر بھی انہوں نے میری زارا کو مجھ سے دور کر دیا اس کی شادی اس احمد علی (دولھا بھائی) سے طے کر دی۔ آپی نے دولھا بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''میں نے ہی اس دن اسے مارا تھا لیکن اس کی ماں نے جو منتر اسے گھر سے نکلنے سے پہلے پڑھوائے تھے ان کی وجہ سے یہ بچ گیا۔''

''اے عالم تو یہ علم روک دے ورنہ میں تجھے مار ڈالوں گا تجھے کچا چبا جاؤں گا'' عامل نے عمل پڑھنا بند نہیں کیا۔ اس کے بعد آپی زور زور سے رونے لگی۔ اور اپنے ہاتھ سے معافیاں مانگنے لگی۔ ''مجھے میری زارا سے جدا نہ کرو جو تم کہو گے میں کروں گا۔'' اس کے بعد آپی بے تحاشہ اپنے ہاتھ چومنے لگی ''تم مجھے کیا مارو گے جب میں زارا کے ساتھ رہ نہیں سکتا تو اس دنیا میں رہ کر کیا کروں گا۔'' اس کے بعد آپی کے اندر سے ایک ہیولہ نکلتا ہوا نظر آیا جس نے اس گرم گرم تیل میں عمل پورا ہونے سے پہلے چھلانگ لگا دی تھی۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ ایک جن زادہ نے آپی کی محبت میں اپنی جان دے دی۔

عامل صاحب نے کہا ''وہ جن مر چکا ہے۔'' انہوں نے عمل کو پورا کیا اور کہا کہ اب ''آپ کی بیٹی بالکل ٹھیک ہے۔'' آپی کو کچھ دیر بعد ہوش آ گیا اس کے بعد کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ آپی آج دولھا بھائی کے ساتھ بہت خوش ہے۔

☆☆......☆☆

چھلاوا گراؤنڈ

سید محمود حسن

تین دوستوں کی خبیث جنات سے مڈھ بھیڑ

یہ واقعہ آج سے تقریباً 20 سال پہلے ہمارے ساتھ پیش آیا۔ ہم لوگ کراچی شہر کے مضافاتی علاقے میں رہتے ہیں جو کہ گلشن حدید سے قریب ہے ہوا یوں کہ میں یعنی ارشد، عرفان اور ہمارا دوست شکیل جو کہ ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ ہمارا ایک اور گہرا دوست ہے جو کہ ہمارے علاقے سے تھوڑا دور موسیٰ کالونی میں رہتا تھا جس کا نام عزیز ہے۔ ہم چاروں بہت ہی گہرے دوست ہیں اور فٹبال کے شوقین ہیں۔

☆......☆......☆

ہمارے دوست عزیز کی شادی ہونے والی تھی اور ہم ہر تقریب میں مدعو ہوتے تھے شادی سے ایک دن پہلے اس نے پوری رات فنکشن کا پروگرام رکھا تھا اور ہم تینوں کو خاص طور پر آنے کا کہا گیا تھا اور تاکید کی تھی کہ جب تک تم لوگ نہیں آؤ گے پروگرام شروع نہیں ہوگا ایسے پروگرام عموماً رات 12 بجے تک شروع ہوتے ہیں تو اس رات ہم تینوں نے عزیز کے گھر جانے کا پروگرام بنایا عزیز کے گھر جانے کے لیے ہمیں مین روڈ سے جانا پڑتا تھا جس میں تقریباً ہمیں ایک گھنٹہ لگ سکتا تھا ہمارے پاس موٹر سائیکل وغیرہ بھی نہیں تھی اور ہم پیدل یا سائیکل پہ آتے جاتے تھے ہم رات تقریباً 8 بجے گھر سے روانہ ہوئے تو عرفان نے تجویز پیش کی کہ یار کیوں نا ہم شارٹ کٹ سے چلیں تو تقریباً ایک گھنٹے کے بجائے آدھے گھنٹے میں موسیٰ کالونی پہنچ جائیں گے لیکن یہ راستہ اس وقت جھاڑیوں اور درختوں سے پُر تھا راستے میں ایک گراونڈ بھی پڑتا تھا جس میں بھی جھاڑیاں اور گھاس پھوس لگی ہوئی تھی مناسب صفائی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی دن میں بھی اس میں نہیں کھیلتا تھا یہ گراونڈ کسی زمانے میں فٹبال کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اب یہ گراونڈ آسیب زدہ مشہور ہو گیا تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس میں چھلاوے رہتے ہیں۔

☆......☆......☆

ہم تینوں خاصے نڈر واقع ہوئے ہیں ہم نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور اب ہم جب گراونڈ کے قریب پہنچ چکے تھے گراونڈ میں اندھیرا تھا صرف چاند کی روشنی تھی۔ ہم گراونڈ میں داخل ہوئے تو ہمیں گراونڈ میں صرف تین افراد نظر آئے جو کہ فٹبال کھیل رہے تھے ان کے کپڑے سفید رنگ کے تھے وہ بڑے ہی پُراسرار نظر آ رہے تھے چونکہ فٹبال ہمارا پسندیدہ کھیل ہے اس لیے ہمیں دلچسپی پیدا ہوئی اور ہم غور سے دیکھنے لگے کہ اس وقت اندھیرے میں یہ کون لوگ ہیں جو فٹبال کھیل رہے ہیں اور اب انہوں نے ہمیں بھی دیکھ لیا تھا اور ان میں سے

ایک آدمی نے فٹبال کو زوردار کک ماری تو فٹبال دور چلی گئی اور باقی دونوں آدمی بھی اس فٹبال کے پیچھے بھاگے اور فٹبال لگتا تھا کہ بہت دور چلی گئی تھی وہ تینوں ایک درخت کے قریب پہنچے پھر ایک حیرت انگیز چیز ہوئی کہ وہ تینوں اچانک ہی ہماری نظروں سے غائب ہوگئے۔

ارے یہ تینوں کھلاڑی کہاں چلے گئے؟ ہم بے حد حیران ہوئے اور انہیں چاروں طرف تلاش کرنے لگے ہم اسی طرف پہنچے جہاں پر وہ تینوں غائب ہوئے تھے لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آئے بلکہ وہاں ایک بکری کا خوب صورت سا بچہ بیٹھا ہوا تھا جس کا رنگ سفید اور آنکھیں چمکدار اور نیلی تھیں عرفان کہنے لگا ''چھوڑ دیار! ان کھلاڑیوں کو دفع کرو ہمیں ان سے کیا لینا۔ یہ بکری کا بچہ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے اسے میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور پھر اس نے بکری کے بچے کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ آگے بھاگنے لگا ادھر شکیل کو بھی کچھ نظر آیا ارے یہ تو چھوٹا سا ہرن ہے کتنا پیارا ہے اور خوب صورت ہے شکیل بولا میں اسے لے لوں گا اور گھر لے جا کر پالوں گا اور وہ بھی ہرن کے پیچھے لپکا۔

میں ابھی ان دونوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے مور نظر آیا مور کے بڑے بڑے خوب صورت پر تھے اور اس کی آنکھیں نہایت حسین۔ میں نے کہا تم بکری کے بچہ اور ہرن کو پکڑو میں مور کو پکڑتا ہوں اور میں بھی مور کو پکڑنے کے لیے لپکا لیکن مور بھاگنے لگا اب ہوا یوں کہ ہم تینوں گراؤنڈ میں بکری کے بچے، ہرن اور مور کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور وہ ہاتھ نہیں آرہے تھے لیکن ہم تینوں نے ہمت نہیں ہاری اور جلد ہی انہیں پکڑنے میں کامیاب ہوگئے اور اب ہم تینوں بے حد خوش تھے کہ اتنے خوب صورت اور قیمتی جانور ہمارے ہاتھ لگ گئے ہیں میں نے مور کو نہایت پیار سے گود میں لیا ہوا تھا اور اسی طرح عرفان نے بکری کے بچے کو، اور شکیل نے ہرن کو۔

ہم ابھی دو چار قدم ہی چلے ہوں گے تو عرفان نے کہا کہ ''یار مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔ یہ بکری کا بچہ وزنی ہو رہا ہے''۔ جب ہم نے مڑ کر دیکھا تو بکری کے بچے کی ٹانگیں لمبی ہوتی جا رہی تھیں اور اس کی ٹانگیں تقریباً 10 فٹ لمبی ہو چکی تھیں۔ ادھر شکیل کو بھی ہرن وزنی محسوس ہو رہا تھا اور جب ہم نے شکیل کو دیکھا تو ہرن کی ٹانگیں بھی بہت لمبی ہو چکی تھیں ادھر مور جو کہ میری گود میں تھا اس کی پتلی ٹانگیں بہت موٹی اور لمبی ہونے لگی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مور کی ٹانگیں 10 فٹ سے بھی زیادہ لمبی ہو گئیں اور ان کی موٹائی بھی بڑھ چکی تھی پھر بکری کا بچہ انسانی آواز میں ہنسا اور بولا ''مجھے لے چلو! عرفان مجھے پال لینا اپنے گھر میں بڑا مزا آئے گا۔'' عرفان نے ایک بھیانک چیخ ماری اور بکری کے بچے کو پھینکنے کی کوشش کی۔ ادھر شکیل کی گود میں بھی ہرن کا بچہ ہنسا اور کہنے لگا ''شکیل میاں! لے چلو مجھے بھی ساتھ میں تو تمہیں بہت اچھا لگ رہا تھا نا۔''



☆......☆......☆

میں اس ساری صورتحال کو سمجھ چکا تھا اور ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ خوب صورت جانور نہیں غیر انسانی مخلوق یا چھلاوے ہیں کہ مور کی آواز نکلی ارشد یار مجھے گھر لے چلو مجھے پال لو ہم دونوں فٹبال بھی کھیلا کریں گے۔" میں نے چیخ کر کہا آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دو اور انہیں پھینک کر یہاں سے بھاگو جلدی۔ ہم نے ان جانوروں کو گود سے اتارنے کی کوشش کی لیکن وہ تو جیسے چپک گئے تھے ہم سے۔ پھر جیسے ہی میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کیا تیز آواز میں تو مور میری گود سے اتر گیا میں نے عرفان اور شکیل کو بھی قرآنی آیات پڑھنے کا کہا اور ہم تینوں مل کر قرآنی آیات کا تیز آواز میں ورد کرنے لگے تو ہرن اور بکری کا بچہ ہماری گود سے اتر گئے میں نے کہا کہ بھاگو یہاں سے اور پھر ہم تینوں سرپٹ دوڑنے لگے لیکن ہمیں پیچھے سے آوازیں آرہی تھیں۔ "ہمیں لے چلو، ہم بھی فٹبال کھیلیں گے، تمہارے ساتھ ہمیں پال لو ارشد، عرفان، شکیل تم تو ہمارے دوست ہو کہاں بھاگے جا رہے ہو ہمیں چھوڑ کر۔" لیکن ہم قرآنی آیات پڑھتے ہوئے تیز تیز دوڑ لگا رہے تھے۔

اور پھر آخر کار ہم آسیبی گراونڈ سے باہر آ ہی گئے اور اب ہم اس سڑک پر تھے جو موسیٰ کالونی کی طرف جا رہی تھی اور اس اسٹریٹ پر لائٹ جل رہی تھی۔ لیکن ہم نے اپنا دوڑنے کا سفر جاری رکھا اور عزیز کے گھر جا کر ہی دم لیا عزیز ہماری حالت دیکھ کر سخت پریشان ہو گیا ہم تینوں کی ہمتیں اب جواب دے چکی تھیں ہم تینوں بے ہوش ہو کر گر گئے۔ صبح جب ہمیں ہوش آیا تو ہم عزیز کے گھر مہمان خانے میں موجود تھے اور ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے ہم پر دم کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

عزیز ہمیں ہوش آتے ہی دیکھ کر خوش ہو گیا اور کہنے لگا یہ ہمارے علاقے کے مولانا جمیل الدین صاحب ہیں اور بڑے اللہ والے ہیں انہوں نے ہی تم لوگوں پر پوری رات قرآنی آیات کا دم کیا ہے دراصل یہ بات ہے کہ تم لوگ چھلاوے والی گراونڈ سے گزر رہے تھے تو تم پر وہ اپنی شکلیں بدل کر پیچھے لگ گئے۔" مولوی جمیل الدین

گیت

میں وندھیا چل کی آتما
مرے ماتھے چندن چندرما
مری مانگ سانجھ کی دھوپ
میں چتر کار کا اُتم چتر
کلا کا اُتم روپ
مری دھارا کے سب روپ جال
کہیں زبدیا کہیں کمل تال
میں بچھڑوں کا سنجوگ
تری روپ متی کا سکھ سپنا
ستی کمل پتی کا سوگ
مرے کیکر سب ترے گھاؤ سئیں
مرے پیپل دُکھ کی دھوپ سہیں
ترے گھائل من کو بچائیں
مرے مور پنکھ مرے مرگ نین
تری سونی سبھا سجائیں

انتخاب: علی شاہ میر۔ ٹھوٹھی

صاحب نے بتایا کہ "یہ چھلاوے دراصل بڑے جن یا خبیث جن ہوتے ہیں اور تنہاء لوگوں کا شکار کرتے ہیں جو ان کے علاقے سے گزرے خیر اللہ تعالیٰ نے اپنا رحم و کرم کیا۔

انہوں نے ہم تینوں کو ایک ایک تعویز دیا اور اسے اپنے گلے میں باندھنے کا کہا ہم لوگ تین دن تک عزیز کے گھر پر ہی رہے اور اسکے بعد جب اپنے اپنے گھروں کو واپس آئے تو گھر والوں کو سارا واقعہ سنایا اور پھر ہم تینوں نے کبھی بھی اس گراونڈ کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی آج اس واقعے کو تقریباً 20 سال گزر چکے ہیں اور وہ گراونڈ بھی موجود ہے اور وہاں دن میں اب بھی لوگ میچ کھیلتے ہیں لیکن ہم تینوں آج بھی وہاں سے نہیں گزرتے اور نہ ہی اس کی طرف جاتے ہیں کیوں کہ یہ وہی "چھلاوہ گراونڈ" تھی جس میں ہماری ملاقات ان چھلاووں سے ہوئی تھی اور ہم نے بمشکل اپنی جان بچائی تھی۔

☆☆......☆☆......☆☆

وہ کون تھے؟

رئیسہ خالد


اسراریت سے پُر ایک کہانی، اسلام آباد سے

گرمیوں کے دن تھے غالباً مئی یا جون کا مہینہ تھا جب یہ واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ ہندوستان کے ایک شہر کا ہے ڈاکٹر حامد اپنے کلینک میں بیٹھے مریضوں کا چیک اپ کر رہے تھے وہ شہر کے نامور ڈاکٹروں میں سے ایک تھے جن کے پاس بے شمار مریض آتے تھے ،اور شفا پاتے تھے ۔رات کافی ہو چکی تھی یوں بھی گرمیوں کی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اب غالباً یہ ان کا آخری مریض تھا جنہیں دیکھ کر وہ گھر جاتے کلینک بند کرنے کا وقت بھی ہو چکا تھا جب دو آدمی ہانپتے کانپتے کلینک پہنچے (یہ آج سے تقریباً چالیس سال پرانا واقعہ ہے)۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر تک پہنچنے کے لیے کمپاونڈر سے نمبر لینا پڑتا تھا اور مریض اپنی باری پر ہی اندر جا سکتا تھا لیکن ان دونوں نے کمپاونڈر کی ایک نہ سنی اور وہ زبردستی، اس کے روکنے کے باوجود اندر گھس گئے اور ڈاکٹر سے کہنے لگے ”میرے مریض کو بچا لیجیے اس کی حالت بہت بہتر نہیں ہے“ ڈاکٹر بھی آخری مریض کا معائنہ کر رہے

تھے انہیں غصہ تو بہت آیا مگر انہوں نے اطمینان سے بات کی اور پوچھا "مریض کہاں ہے اسے اندر لے آؤ؟" جواب میں انہوں نے کہا کہ "مریض کی حالت ایسی نہیں کہ اسے یہاں لایا جاسکتا۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں ہمارے پاس کوئی سواری بھی نہیں ہے اور رات بھی زیادہ ہو چکی ہے اس لیے واپسی کے لیے کوئی سواری بھی نہیں ملتی، آپ کو ہی مریضہ کے پاس جانا ہوگا آپ فیس کی فکر نہ کریں آپ جتنا کہیں گے ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔" ڈاکٹر صاحب جانا تو نہیں چاہتے تھے لیکن ان کی بسی اور اپنے پیشے کا لحاظ کرتے ہوئے وہ باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

وہ دونوں بھی ڈاکٹر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے گاڑی کافی دیر چلتی رہی تب ڈاکٹر صاحب نے ان سے پوچھا کہ "اب اور کتنی دور جانا ہے؟" جواب میں انہوں نے کہا "بس پہنچنے والے ہیں۔"

☆......☆......☆

کچھ دیر بعد وہ ایک چھوٹے سے محلے میں پہنچے جہاں بہت کم مکانات نظر آرہے تھے اور بہت دور دور بنے ہوئے تھے پورا محلہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا سڑک پر کوئی بھی چلتا پھرتا نظر نہیں آرہا تھا انہوں نے یہ کہہ کر ڈاکٹر کو تسلی دی کہ اس وقت لائٹ گئی ہوئی ہے ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گی اس لیے اندھیرا ہو رہا ہے۔"

☆......☆......☆

ایک گھر کے سامنے گاڑی روکنے کے لیے انہوں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ایک دو منزلہ مکان تھا جو اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا انہوں نے ماچس جلا کر باہر کے دروازے کا تالا کھولا اور ماچس کی روشنی میں ڈاکٹر کو اندر چلنے کے لیے کہا اندر بھی بالکل اندھیرا تھا وہ ماچس کی تیلی جلا جلا کر روشنی کرتے رہے اور اوپر کی منزل پر ڈاکٹر صاحب کو لے گئے اب وہ لوگ ایک بڑے کمرے میں تھے جہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا سوائے ایک بیڈ کے جس پر ایک مریضہ لیٹی ہوئی تھی کمرہ بالکل صاف ستھرا تھا مریضہ ایک جوان اور ایک خوبصورت عورت تھی جس کی عمر ڈاکٹر کے خیال میں بائیس تئیس سے زیادہ نہ تھی مگر چہرے سے کافی بیمار اور کمزور نظر آرہی تھی ڈاکٹر صاحب نے اس کا معائنہ بھی ماچس کی روشنی میں نسخہ لکھ کر انہیں پکڑا دیا اور کہا کہ ابھی دوا لے آئیں ڈاکٹر نے جو فیس مانگی وہ انہوں نے نکال کر دے دی اور ماچس کی روشنی میں ہی انہیں دروازے تک پہنچایا۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ چکے تو انہوں نے کہا کہ "اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم لوگ آپ کے ساتھ چلیں کیوں کہ دوا خانہ یہاں سے بہت دور ہے اور آپ کے راستے میں آئے گا ہمارے پاس اور کوئی سواری بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا لہذا وہ دونوں بھی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

کافی دیر بعد جب دوا خانہ نظر آیا تو ڈاکٹر نے پیچھے مڑے بغیر ان سے کہا کہ "آپ لوگ یہاں اتر جائیں دوا خانہ آچکا ہے" جواب نہ ملنے پر انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں آدمی غائب تھے۔ ڈاکٹر صاحب حیران تھے کہ میں نے اس سے پہلے نہ تو گاڑی روکی تو پھر یہ لوگ کہاں چلے گئے؟۔ ڈاکٹر حامد تو پہلے سے ہی خوف زدہ تھے اب تو خوف کے مارے ان کا برا حال ہو گیا۔ آدھی رات کا وقت تھا اور وہ اپنے شہر سے کافی دور تھے ان سے صحیح طور پر گاڑی بھی نہیں چلائی جا رہی تھی جیسے تیسے انہوں نے سفر مکمل کیا اور گھر پہنچے۔ گھر پہنچتے ہی انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور جب تک کوئی دروازہ کھولتا وہ بے ہوش ہو کر دروازے پر ہی گر پڑے گھر والے پہلے ہی بہت پریشان تھے کہ وہ بغیر بتائے اتنی رات کہاں ہے؟۔ وہ موبائل کا دور نہ تھا انہوں نے کلینک پر بھی جا کر دیکھا تو یہ بند پڑا تھا۔ جب دروازہ کھولا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بے ہوش پڑے تھے۔ نوکروں کی مدد سے انہیں اندر لایا گیا صبح وہ بولنے کے قابل ہوئے تو گھر والوں کو بتایا کہ رات ان پر کیا گزری......

☆......☆......☆

ڈاکٹر صاحب اس جگہ پر جا کر تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ وہ لوگ کون تھے کیا وہ انسان ہیں یا کوئی اور مخلوق؟ انہوں نے اپنے ساتھ چند لوگوں کو لیا اور اس گھر تک پہنچ گئے جو دن میں بھی بالکل ویران اور آسیب زدہ لگ رہا تھا دروازے پر بڑا سا تالا پڑا تھا جو بالکل زنگ آلود تھا آس پاس کوئی مکان بھی نہیں تھا جس سے پوچھ کچھ کی جاتی اس لیے جو پہلا مکان نظر آیا وہاں انہوں نے دستک دی ایک بزرگ باہر نکلے اپنا نام عبداللہ بتایا اور پوچھنے لگے کہ کس سے ملنا ہے؟ ڈاکٹر نے اس گھر کا پتہ بتاتے ہوئے پوچھا کہ ''گھر والے کہاں گئے ہوئے ہیں ان سے ملنا تھا۔'' عبداللہ صاحب کہنے لگے وہاں سالوں سے کوئی نہیں رہتا وہ گھر خالی پڑا ہے کیوں کہ وہ آسیب زدہ مشہور ہے وہاں کئی لوگ کرایہ پر رہنے کہ لیے آئے لیکن دو چار دن سے زیادہ وہاں کوئی نہ رہ سکا مالک مکان قریب ہی رہتے ہیں آپ ان سے مل لیں وہ آپ کو ساری تفصیل بتا دیں گے۔

☆......☆......☆

جب ڈاکٹر کی مالک مکان سے ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر نے رات والا پورا واقعہ ان کو سنایا اس پر مالک مکان انہیں اس گھر میں دوبارہ لے گئے اور تالا کھول کر انہیں دوسری منزل پر لے گئے لیکن وہاں کسی مریضہ کا نام ونشان نہ تھا اور نہ وہ بستر تھا جس پر اس کا معائنہ کیا تھا گھر گرد وغبار اٹا پڑا تھا ایسا لگتا تھا کہ برسوں سے وہاں کوئی نہیں رہتا مگر دروازے سے لے کر سیڑھیوں تک ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں بکھری پڑی تھیں جو اس بات کی گواہ تھیں کہ رات کو ڈاکٹر صاحب کو یہاں بلایا گیا تھا دیواروں پر بڑے بڑے جالے لٹک رہے تھے یوں کہ اس گھر میں برسوں سے کوئی نہیں رہتا پتہ نہیں وہ کون لوگ تھے جو رات کے اندھیرے میں ڈاکٹر کو وہاں لے کر گئے تھے یہ ایک ایسا معمہ تھا کہ جسے ڈاکٹر اور مالک مکان آج تک حل نہیں کر سکے۔

☆......☆......☆

جادُو



احسان عمرانی

شیطانی روش پر چلنے والے شخص کا قصۂ خاص

سلمان کو صبا سے خوب محبت تھی، لیکن صبا کو خالد سے اور خالد کو صبا سے محبت تھی۔ لیکن صبا کو خالد سے اور خالد کو صبا سے محبت تھی۔ دو پیار کرنے والوں میں بھلا تیسرے کی کہاں جگہ ہوتی ہے سو سلمان دیکھتا ہی رہ گیا اور صبا مسز خالد بن کر پیا گھر سدھار گئیں۔ کہانی یہاں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

سلمان جلتا رہا، صبا کو سوچ سوچ کر روتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس جلن کڑھن کی جگہ غصے اور نفرت نے لے لی۔ خالد سے نفرت اور یہ نفرت انتقام کا جذبہ لے کر آئی۔ محبت میں سب جائز ہے جیسے فضول سے مقولے پر عمل درآمد کرتے ہوئے سلمان نے خالد سے بدلہ لینے کی ٹھانی اور بدلہ لینے کے لیے اس نے سہارا لیا جادو کا۔

☆......☆......☆

جادوگر بننے کے لیے اس نے قابلِ وضاحت عمل کیے اور چلے کاٹے۔ قبلہ رُخ کے مخالف سمت میں الٹی نمازیں پڑھیں، شیطان کو پکارا اس کا ورد کیا، نتیجتاً اس نے خدا کو ناراض کیا اور جادوگر بننے کا شرف حاصل کیا۔ اور یہ اس کے جادو کا ہی اثر تھا کہ صبا اور خالد میں صبح لڑائی شروع ہوتی اور شام کو ختم ہوتی۔ بھری محفل میں صبا غلیظ غلیظ گالیاں بکنے لگ جاتی اور کبھی کبھار دس لوگوں میں بیٹھ کے اسے ایسے لگتا جیسے وہ اکیلی ہے اور وہ انجمن کو خلوت سمجھتے ہوئے کپڑے بدلنے کھڑی ہو جاتی۔ چوں کہ خالد کو صبا سے محبت تھی اسی لیے وہ خوب گھبرایا اور بھاگا بھاگا صبا کو سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گیا۔ سائیکاٹرسٹ کی دوائیں۔ سب بے کار ثابت ہوئیں۔ نتیجہ وہی حسب توقع، دو سال کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی جب صبا ٹھیک نہ ہوئی تو خالد نے ماں کے دباؤ میں اُسے طلاق دے دی۔

☆......☆......☆

طلاق یافتہ صبا سے سلمان نے شادی کی خواہش ظاہر کی، صبا کے والدین راضی تھے۔ سلمان بھی خوش تھا لیکن شیطان کا وہ چیلا خوش نہ تھا جس نے سلمان کو جادوگر بنایا تھا اور سلمان کی مدد کی تھی۔

چیلا صبا کا اسیر ہو چکا تھا، وہ صبا کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات سلمان کے لیے کہاں قابلِ برداشت تھی۔ وہ تو صبا اور خالد کی خلوت کو شرع کی وضاحت دیتا اور اپنے دل کو بہلاتا اور اب یہ چیلا......

نتیجہ وہی سلمان اور شیطان کے اس ہزاروں سال تمپیا کرنے والی چیلے کی لڑائی، زبردست نے زیردست کو

برباد کیا۔ سلمان کا سیکھا ہوا جادو بے کار گیا، چیلے نے ایسی تدبیریں چلیں کہ سلمان جو بستر پر گرا تو پھر اُٹھ نہ سکا۔ دنیا حیران کہ ایسی کون سی بیماری ہے جو سلمان جیسے نوجوان لڑکے کو قبر تک لے آئی ہے۔ صبا کو شیطان کے چیلے نے زیرِ اثر رکھا اور جب دل چاہتا صبا کو استعمال کر لیتا۔ خالد نے دو چار سال سوگ منانے کے بعد دوسری شادی کر لی اور زندگی گزارنے لگا۔

جادو اور شیطان کی پیروی نے کسی کا کچھ نہ سنوارا بلکہ سب بگاڑا ہی بگاڑا یوں ہی سال پر سال گزرتے گئے اور جب شیطان کا چیلا صبا سے اوب گیا تو اس نے صبا کو چھوڑ دیا اور کہیں دور نئے لوگوں کی زندگی برباد کرنے چلا گیا۔

☆......☆......☆

ادھیڑ عمر صبا جسے اب ساری دنیا پاگل سمجھتی تھی، جادو کی مدت ختم ہونے کے بعد اچانک ٹھیک ہوگئی۔ ماں، باپ تو گزر چکے تھے لیکن بہن بھائی خوب خوش ہوئے اپنی بساط سے بڑھ کر خیراتیں کیں نذرانے بانٹے اور صبا جب سے فرزانہ ہوئی تھی یہی سوچتی تھی کہ بھلا وہ کیسے پاگل ہوسکتی تھی۔ لیکن اسے اس کا جواب نہ ملا اور نہ ہی ملنا ہے۔ کیوں کہ اس سوال کا جواب دینے والا، خود غرض محبت رکھنے والا مرد جادوگر اپنے ہی جادو کے ہاتھوں سالوں پہلے مر چکا تھا۔

☆☆......☆☆

باتوں سے خوشبو آئے

☆ کسی بھی کام میں یکسوئی کامیابی کا راز ہے۔

☆ بہادر وہ ہے جو کمزور کے ساتھ عاجزی سے پیش آئے۔

☆ سکوت غصے کا بہترین علاج ہے۔

☆ جاہلوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا علم کی زکوٰۃ ہے۔

☆ سکون مانگا یا چرایا نہیں جاسکتا۔

مرسلہ: ثناء گل۔ کراچی



طلسمی محبت



عظمیٰ شکور

انسان اور جن کی محبت بھری داستان

میرے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے وہ میرے جسم میں داخل ہوا کرتا، اور پھر ٹانگوں سے ہوتا ہوا پورے جسم کو اپنے قبضے میں کر لیتا اور میں بے بسی سے ساکت کھڑی رہ جاتی جانے کب کہاں سے یہ آیا تھا اور میرے جسم کو جاگیر بنا ڈالا تھا، اور دعویٰ عشق کا کرتا تھا۔

وہ بار بار کہتا کہ اسے مجھ سے محبت ہے پر میں سوچا کرتی یہ کیسی محبت ہے جو اپنوں سے جدا کرتی ہے جو نفرتیں پھیلاتی ہے جو دلوں کو دور کرتی ہے اور کیا ''اسکا'' مجھ سے محبت کرنا جائز تھا وہ تو کوئی الگ ہی مخلوق تھا۔

☆......☆......☆

کبھی کبھی میں حیران ہو جاتی اس کی عنایتوں پر محبتوں پر میری یوں حفاظت کرتا جیسے میں کوئی موم کی گڑیا ہوں ہر طرح سے میرا خیال رکھتا۔ سو کر اٹھتی تو ڈھیروں گلاب تکیے کے پاس پڑے ملتے، جو کپڑے پہنتی وہ خوشبوؤں میں نہائے ہوتے، میں جانتی تھی کہ وہ ان سب عنایات کے پیچھے وہ ہے پھر بھی انجان تھی۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ آخر وہ کیا چاہتا تھا اور کیوں چپک گیا ہے میری ذات کے ساتھ ان سب باتوں کے جواب نہ تھے میرے پاس ایک گہرا سناٹا چھا جاتا جب ایسے سوال ذہن میں ابھرتے۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے کہ جب کالج کے ایک فنکشن میں، میں ریڈ سوٹ پہن کر گئی تھی میرا رنگ صاف تھا اس لیے یہ سرخ سوٹ مجھ پر جچ رہا تھا، میں کالج کے گراؤنڈ میں ایک درخت کے سامنے اپنی فرینڈ کا انتظار کر رہی تھی نہ جانتی تھی کے میرے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے گہرے بادل چھائے تھے میں نے پرفیوم لگا رکھا تھا اور جانے وہ کب مجھ پر فدا ہو چکا تھا ایک لمحے کو مجھے خود پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوا تھا اور وہ دن اور آج کا دن یہ مجھ سے الگ نہ ہوا۔

☆......☆......☆

میں اسے بار بار دیکھ چکی تھی وہ دھویں جیسا تھا اگر اندھیرے میں دیکھو تو ایک ہیولہ سا، عجیب سی بات تھی مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا تھا جانتی تھی کہ یہ میرے وساتھ ہر لمحے رہتا ہے۔

میرے والدین نے بہت علاج کروائے یہ نہیں گیا، کبھی کبھی سوچتی تھی کہ میری زندگی یہ جی رہا ہے میں کتنی بے بس ہوں۔

☆......☆......☆



''اس جن'' نے میری پڑھائی چھڑوا دی تھی میں ایف۔اے بھی نہ کر پائی جب کہ مجھے انتہائی شوق تھا پڑھنے کا مگر نصیبوں سے کون لڑا ہے۔

☆......☆......☆

وہ کوئی آدھی رات کا وقت ہوگا اچانک ایسے محسوس ہوا کہ جیسے مجھے کسی نے ہلا کر اٹھایا ہے میں نے موندی موندی آنکھوں سے دیکھا تو وہ میری بیڈ کی سائیڈ کے پاس کھڑا تھا۔

ایک لمحے کو جیسے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور میں تھر تھر کانپ رہی تھی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو خون نہیں حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی کانپتے ہاتھوں سے میں نے منہ کو چھپا لیا تھا اچانک سے ایک چیخ میرے گلے سے برآمد ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

کافی لمحات گزرنے کے بعد میں دیکھا کے وہ جا چکا تھا اور پھر میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی اپنی بے بسی پر اور کافی دیر رونے کے بعد اذان کی آواز جب کانوں سے ٹکرائی تو ڈولتے وجود کو سنبھالتے میں وضو کی غرض سے اٹھی تا کہ اپنے اللہ کو یاد کروں۔

جب میرا جسم اس کی دسترس میں ہے تو پھر کیوں میرے سامنے آ کر مجھے ستاتا ہے کیا یہ محبت ہے؟ محبت اسے کہتے ہیں؟ وہ جھوٹا ہے جھوٹا ہے بالکل میں جذباتی انداز میں چلائی۔

☆......☆......☆

میں جو چاہتی میرے سامنے حاضر کر رہا تھا حیران ہو جاتی مگر نہیں میں اسے چاہ نہیں سکتی یہ بات میرے بس میں نہیں ہاں جب وہ میرے بدن میں میرے پاس نہیں ہوتا تھا تو مجھے اس کا انتظار ہوتا تھا کہ جانے کہاں گیا اور اپنے اردگرد اسے تلاش کرتی اور جب وہ نہ ملتا تو اسے ڈھونڈا کرتی سوچوں کے تانے بانے بنتا ذہن ہر بار اس حقیقت کو جھٹلا دیا کرتا کہ میں اسے چاہنے لگی ہوں۔

☆......☆......☆

وہ آج بھی میرے ساتھ ہر لمحہ میرے سنگ جانے کس کس دیس کی سیر کروا چکا اب تک خوابوں میرے سانسوں کی ڈوری کے ساتھ بندھا ہے اس کا کہنا ہے کہ میں اس کا عاشق ہوں اور اس کی اس بے پناہ چاہتوں کے سامنے بے بس ہوں کہ میں انسان ہوں اور وہ ایک ''جن''

☆......☆......☆

کالا جادو



غلام رسول گل



حسد میں ڈوبے شخص کی کہانی، جس نے شیطانی عمل اختیار کیا

گھنٹہ گھر فیصل آباد فرنگیوں کی ایک خوب صورت تخلیق ہے۔ گھنٹہ گھر کو گھیرے ہوئے آٹھ منظم بازار، کس قدر بھلے لگتے ہیں۔ انہی آٹھ بازاروں میں سے دو بازار چنیوٹ بازار اور کچہری بازار کو جامعہ گلی ملاتی ہے۔ کھلی سی جامعہ گلی میں مردوں کے کپڑوں کی تنگ دکانیں کثرت سے ہیں۔ دکان دار مردانہ ہر قسم کی ورائٹی سستے داموں میں دیتے ہیں، اسی لیے تو اس گلی میں مردوں کا رش دیکھنے کو ملتا ہے۔

جامعہ گلی میں ہی اکرم اور زاہد کی قریب قریب دکانیں تھیں۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی۔ بظاہر تو دونوں دوست تھے لیکن درحقیقت اکرم دل و دماغ کا ایک کینہ آدمی تھا۔ زاہد کے کاروبار میں خدا نے خاص قسم کی برکت دی تھی۔ گاہکوں کا تانتا لگا رہتا۔ شادی بیاہ والے گھروں سے مرد آتے اور درجنوں سوٹ اپنے من پسند کے تھان سے کٹواتے جب کہ اکرم سارا دن تکتا ہی رہتا تب کہیں جا کر کوئی گاہک نصیب ہوتا۔ زیادہ تر گاہک بس یونہی تھان کھلواتے رہتے اور لیتے کچھ نہ۔ اکرم کو تاؤ تو خوب آتا لیکن وہ زیرِ لب گالی دینے کے سوا کچھ نہ کرسکتا تھا۔ اپنے اور پڑوسی زاہد کے کاروبار کے فرق نے اکرم کے دل میں حسد کا بیج بو دیا اور اس بیج نے بڑی جلدی نمو پائی۔ اسی حسد کے جذبے کے زیرِ اثر اکرم نے وہ کام کیا جو خدا کو سخت ناپسند ہے، جو شرک کے برابر ہے۔ جادو۔

ایک دن کی بات ہے زاہد کی دکان پر صبح دس بجے ہی ایک گاہک آ گیا۔ بیس سوٹ منتخب کرنے کے بعد ابھی بھی وہ مزید سوٹ لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گاہک فیصل آباد کے قریب کسی گاؤں کا تھا بیسیوں سوٹ لینے کا مقصد اپنے بیٹے کی شادی پر بھائیوں، بہنوئیوں، بھانجوں، بھتیجوں الغرض سب کو سوٹ بطور سوغات دینا تھا۔ چنے ہوئے کپڑوں کی ڈھیری سی بن گئی اور اکرم اپنی دکان پر بیٹھا بظاہر تو اخبار پڑھنے میں مصروف تھا لیکن دھیان اس کا زاہد اور اس کے گاہک کی طرف تھا اور خوب جل رہا تھا جب اس کی نظر اخبار کے ساتھ مفت آنے والے بے تکے سنڈے میگزین پر پڑی جو آدھے سے زیادہ اشتہاروں سے بھرا ہوا تھا اور انہیں اشتہاروں میں سے ایک اشتہار سائیں بابا کرامت کا تھا۔

کالے جادو کے ماہر...... محبوب آپ کے قدموں میں جیسی سرخیوں کے ساتھ، اکرم نے ایک نظر نفرت سے زاہد پر ڈالی جو اپنے گاہک کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور چپکے سے سائیں بابا کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرلیا۔

☆......☆......☆



رات کو اس نے سائیں بابا سے بات کی اور صبح ان کی خدمت میں حاضر تھا، سرخ آنکھوں والا بابا جس کی مونچھوں کو ہمیشہ تراشنے سے محروم رکھا تھا، اسی بنا پر اس کی مونچھیں اس کے اوپری ہونٹ کو چھپائے ہوئے تھیں۔ نے اکرم کا مدعا خاموشی سے سنا، بعد میں چیدہ چیدہ سوالات کیے اور کہا۔

"منہ مانگے داموں یہ تمہارا کام کر سکتا ہوں۔" یوں تو اکرم پیسوں کی کمی کا شکار تھا لیکن جذبۂ حسد نے اسے حامی بھرنے پر مجبور کر دیا۔ بابا نے جو عمل اکرم کو کرنے کو بتائے وہ سن کر اکرم کو جھر جھری سی آ گئی۔ یہ سب نہ کرنے کا تہیہ کر کے اکرم اُٹھ آیا لیکن اگلے دن جب دوبارہ زاہد کی دکان پر گاہکوں کا رش رہا اور وہ شام تک خالی بیٹھا رہا تو رات کو وہ ناپاک عمل کرنے بیٹھ گیا جو واضح قرآن مجید کی بے حرمتی تھیں۔

ناپاک عمل مسلسل جاری رہے، بابا کرامت کے پاس چکر لگتے رہے، پیسے لٹتے رہے اور زاہد کی دکان شٹر بند رہنے لگی۔ خبر آئی کہ زاہد سخت بیمار ہے، دن مہینے بنتے گئے اور چند مہینوں بعد خبر آئی۔ "زاہد مر گیا ہے۔"

سب لوگوں کو افسوس ہوا بشمول اکرم، لیکن دل کا شیطانی گوشہ خوش بھی تھا، کچھ دنوں بعد زاہد کا بڑا بھائی زاہد کی دکان کے سامان کی نیلامی کی نیت سے آیا۔ سامان نیلام کر کے دکان اس نے کرائے پر چڑھا دی۔ اب وہ ہی اپنے مرحوم بھائی کے بچوں کا سرپرست تھا۔ آنے والے کرائے دار سے بھی اکرم کی دوستی ہو گئی لیکن حسد کی نوبت نہ آئی، نیا کرائے دار بھی اکرم کی طرح خالی بیٹھا رہتا اور ہر وقت مہنگائی کا رونا روتا رہتا کہ مہنگائی اس قدر ہو گئی ہے کہ لوگوں نے خریداری کرنا چھوڑ دی ہے۔

وقت کی گردش جاری رہی اور وقت کے ساتھ اکرم بوڑھا ہوتا گیا۔ اب بوڑھے اکرم کے ہاتھوں میں رعشہ اُتر آیا ہے، پچھلے سال سے وہ باقاعدگی سے جامع مسجد میں باجماعت نماز پڑھ رہا ہے۔ ہر وقت استغفار کا ورد کرتا رہتا ہے۔ جوانی کے دنوں کا ساتھی زاہد، کالا جادو اور بابا کرامت وہ ہر چیز بھول چکا ہے، لیکن خدا نہیں بھولا۔

☆☆......☆☆



ڈاکٹر غضنفر عباس اسدی

شیطانیت اور روحانیت لیے ایک خاص قصہ

میں جس گھر میں رہتا ہوں وہاں سے چند منٹ کے فاصلے پر ایک بہت قدیم اور بڑا قبرستان واقع ہے ہمارے گھر کو جانے والا راستہ قبرستان سے ہی گزرتا ہے راستے کے دونوں طرف بڑے بڑے درخت پھیلے ہوئے ہیں دور دور تک پھیلے ہوئے یہ درخت ایک عجیب وغریب اور بڑا خوفناک منظر پیش کرتے ہیں یہ قبرستان جنوں اور بھوت پریت کی وجہ سے بہت مشہور ہے آج بھی اس قبرستان کے عین وسط میں سفید مٹی کا صاف میدان موجود ہے جہاں کوئی قبر نہیں کہا جاتا ہے یہ جنوں کی رہائش گاہ ہے دن کے وقت بھی اس میدان کو دیکھ کر خوف آتا ہے رات کا سناٹا تو پھر اس کے خوف میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

☆......☆......☆

یہ میرے بچپن کے دن تھے میں اور میری خالہ کی بیٹی اکثر اکھٹے کھیلا کرتے تھے اس روزانہ کے کھیل کود سے ہم دونوں بے حد مانوس ہو گئے تھے سودا سلف لینے کے لیے ہم بازار بھی اکھٹے جاتے۔ میں ان دنوں ساتویں جماعت میں تھا میری کزن عمر میں مجھ سے بڑی تھی امی کہا کرتی تھیں کہ جب بھی گوشت لینے کے لیے جاؤ تو تھیلے میں چھری یا چاقو رکھ کر گوشت لے کر قبرستان سے گزرنا اچھا نہیں ہوتا لیکن میں ایسی باتوں پر غور نہیں کرتا۔

☆......☆......☆

ایک دن میں اور کزن بازار سے گوشت لے کر لوٹ رہے تھے کہ میری کزن ڈر گئی اور اسے گردن توڑ بخار کا بہانہ بن گیا تھوڑے ہی دنوں میں دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملی اس کی موت کا مجھے بے حد صدمہ ہوا اس کے بعد جب میں قبرستان سے گزرتا تو یوں لگتا کہ جیسے کوئی دوسرا بھی میرے ساتھ چل رہا ہے قدموں کی آہٹ صاف مجھے سنائی دیتی لیکن نانا جی کی ہدایت کے مطابق میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا تاہم خوف کے مارے سردی میں بھی پسینے چھوٹتے تھے چونکہ میرے گھر کا کوئی دیگر راستہ نہیں تھا اس لیے قبرستان سے گزرنا میری مجبوری تھی۔

☆......☆......☆

پھر ایک نیا سلسلہ چل نکلا کہ اگر میں دن کو گزرتا تو یوں لگتا کہ کوئی مجھے آواز دے رہا ہے کبھی میں اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنتا کبھی کانوں میں پھونک کی آواز یا کتے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی۔



☆......☆......☆

ایک رات عجیب معاملہ ہوا میری وہی کزن میرے خواب میں آ کر مجھ سے کھیلتی رہی پھر عالم خواب میں وہ مجھ سے بولی آؤ میں تمہیں اپنا گھر دکھاتی ہوں وہ مجھے اپنی قبر پر لے گئی ہمارے پہنچتے ہی قبر کھل گئی اور ہم سیدھے اندر چلے گئے ہمارے اندر جانے کے بعد قبر بند ہو گئی اور ہم گپ شپ کرنے لگے پھر میری کزن نے کہا تم بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں وہ تھوڑی دیر بعد میرے لیے چائے لے آئی جب میں نے چائے پکڑنا چاہی اور اُس کے منہ کی طرف دیکھا تو اس کا خوب صورت چہرہ بھیانک شکل اختیار کر چکا تھا دانت بہت لمبے تھے اور بڑے بڑے بال تھے اور خوفناک ہنسی ہنستی ہوئی میری طرف بڑھنے لگی اسی اثنا میں خوف کے مارے میری آنکھ کھل گئی اور جب میں بیدار ہوا تو میرے جسم میں لرزہ طاری تھا۔

☆......☆......☆

پھر یہ سلسلہ تسلسل اختیار کر گیا جب میری آنکھ لگتی وہ خواب میں آ جاتی اور مجھے اپنا گھر دکھانے کے بہانے اپنی قبر میں لے جاتی پھر خوفناک شکلیں بنا کر مجھے ڈراتی تھی اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ دن کو بھی ڈر لگنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

آخر کار میں نے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کے ایسے ڈر کر زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ میں مر جاؤں یا پھر مار ڈالوں ایک دن میں اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے دوپہر کے وقت قبرستان میں موجود دو جڑواں درختوں کے پاس کلہاڑی لے کر پہنچ گیا جن کے ساتھ زیارتوں والا ایک کمرہ بھی تھا اس کمرے کے قریب پہنچ کر اللہ سے دعا کی ''اے اللہ سچا مسلمان ہونے کے ناطے میں تجھ سے یہ سوال کرتا ہوا کہ آج اس ڈراؤنی بلا کو میرے سامنے لا کر کھڑا کر میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں یا پھر یہ مجھے مار ڈالے گھٹ گھٹ کر جینے سے بہتر ہے ایک ہی بار مر جاؤں پھر میں نے نعرہ لگاتے ہوئے اس بلا کو للکارا اس کو آپ میری بے وقوفی سمجھیں یا پھر زندگی سے اکتاہٹ لیکن سچ یہی ہے کہ میں نے بار بار یہی الفاظ دہرائے لیکن کوئی شے میرے سامنے نہ آئی میں

چل خسرو گھر اپنے ......

حضرت امیر خسروؒ بنگال میں فراق کی گھڑیاں جھیل رہے تھے کہ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا وصال ہوا۔ وصال کے وقت حضرتؒ نے فرمایا۔

''کہ میرا ترک آئے تو اسے میری قبر کے قریب نہ آنے دینا ورنہ میری قبر شق ہو جائے گی۔''

جب حضرت نظام الدین اولیاؒ کے انتقال کی خبر بنگال میں حضرت امیر خسروؒ نے سنی تو بے حال ہو گئے۔ فوراً دہلی کا رخ کیا اور منزلیں مارتے ہوئے درگاہ پہنچے۔ محبوب کے مزار کے سامنے آئے تو لوگوں نے روک کر کہا۔

''حضرت کا حکم ہے کہ آپ کو یہیں روک دیا جائے۔''

یہ قرب اور یہ فاصلہ۔ یہ وصال اور یہ فراق۔ حضرت وہیں رخ گئے۔ دل کا خون آنکھوں میں اُتر آیا۔ روتے روتے یہ دوہا کہا۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چوندیس

اس کے چہرے پر اس کے کالے کالے بکھر گئے۔ چل خسرو! اب تو بھی اپنے گھر کی راہ لے۔

یہ دوہا کہا اور تیورا کر گرے۔ جہاں گرے تھے، وہیں لوگوں نے سپرد خاک کر دیا۔

انتخاب: فرحان شاہ۔ بدین

اپنے گھر واپس چلا آیا۔

☆......☆......☆

اس غور وفکر میں رات ہوگئی میں اپنے نانا نان جی میاں اللہ بخش درویش سے سبق لے رہا تھا کہ اچانک مجھے باہر سے کسی عورت نے میرے نام سے پکارا میں نے صحن میں نکل کر محسوس کیا کہ یہ میری بڑی خالہ کی آواز ہے میں نے پوچھا کہ خالہ جان آپ ہیں ؟ جواب ہاں میں ملا پھر میں تھوڑا آگے بڑھا تو دوسری خالہ کی آواز سنائی دی میں نے پھر ان کے نام سے پوچھا جواب پھر ہاں میں ملا پھر مجھے ایک تیسری آواز سنائی دی تو میں نے اپنی تیسری خالہ سمجھتے ہوئے کزن کا پوچھا کیا وہ بھی ساتھ ہے تو جواب پھر بھی ہاں میں ملا۔

☆......☆......☆

میں بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا چند قدموں پر تھا کسی نے میرے کان میں آ کر کہا درود شریف پڑھو اور آگے مت جاؤ میرے قدم وہیں رک گئے اور سانسیں تھم سی گئیں اور جسم میں کپکپی ہونے لگی میں درود شریف پڑھتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا اتنے میں ایک عورت جو کہ خوبصورت تھی لیکن اس کا قد اتنا طویل تھا کہ میرے گھر کی دیوار سے کافی اونچی نظر آ رہی تھی اور اتنے ہی لمبے بال تھے لباس بالکل سیاہ تھا وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی اگر تم مجھ تک پہنچ جاتے تو میں تمہاری دلیری کا وہ مزہ چکھاتی کہ تم بھی نہ بھولتے مر کر بھی نہیں میں تمہیں بتاتی کے کس طرح تم نے قبرستان میں جا کر مجھے للکارنے کی جرائت کی اس نے کچھ اور بھی کہا اور ہنسنے لگی ۔گھر میں الٹے پاؤں چلتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا میں بہت گھبرایا ہوا تھا جب نانا جی نے پوچھا تو میں نے سارا ماجرا انہیں سنایا انھوں نے مجھے دم کیا اور آئندہ ایسی حرکت کرنے سے منع کیا اس واقعے کے بعد آج بھی میں قبرستان سے گزرتے وقت درود شریف کا سہارا لیتا ہوں۔

☆......☆......☆

نرالی چاہت

فوزیہ نور

آدم زاد اور جن زادی کی محبت کہانی

اس کہانی کا حرف بہ حرف سچا ہے، میں بھی آپ لوگوں کی طرح بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا تھا، حالاں کہ قرآن میں بار بار یہ بتایا گیا ہے کہ جنوں کا وجود ہے۔ سورۂ رحمن میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میری آپ بیتی پڑھیں پھر فیصلہ کریں۔

میرا نام حفیظ ہے اور میرا تعلق ایک ایسے گاؤں سے ہے جہاں ہریالی اور سبزہ آنکھوں کو ہمیشہ تر رکھتا ہے، ہم کل گیارہ بہن بھائی ہیں۔ میرے ابا نے دو شادیاں کی تھیں۔ میری امی ان کی دوسری بیوی ہیں، میری امی سے تین بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ مجھ سے بڑا عباس جو کہ شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے اور سب سے چھوٹا رضا ہے۔ میری دو بہنوں کی شادیاں ہوگئی ہیں، تیسری ابھی چھوٹی ہے، جبکہ بڑی اماں سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں، تینوں بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ دو بیٹے شہزاد اور لطیف ابھی کنوارے تھے، شہزاد ہم بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں اور ان کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر ہیں۔ ہمارا گھر کہنے کو الگ تھا مگر ہمارے گھر کا صحن ختم ہوتے ہی بڑی اماں کا گھر شروع ہو جاتا تھا گھر کے بائیں جانب مویشیوں کا باڑا اور دائیں جانب ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔ ہم سب بہن بھائیوں میں بے حد پیار اور محبت ہے۔ دونوں ماؤں کے درمیان بھی جھگڑا نہیں ہوا۔ سارا گاؤں ہمارے گھر کی مثال دیا کرتا۔ میں اور عباس بھائی دونوں بیروزگار ہیں۔ عباس بھائی کی بیوی ٹیچر ہے، اس لیے ان کا تو خرچ نکل آتا ہے مگر مجھے امی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ میں نے انٹر کے بعد پڑھائی چھوڑ دی اور آرمی میں اپلائی کیا، لیکن وہاں سے بھی مجھے ریجیکٹ کر دیا گیا اور میری فوجی بننے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ میں سارا سارا دن خالی پھرتا تھا۔ شہزاد بھائی سے میرا یوں بیکار پھرنا دیکھا نہ گیا اور انہوں نے مجھے میل نرسنگ میں داخلہ دلوا دیا۔ بھائی صبح کو شہر میں سرکاری اسپتال میں ڈیوٹی دیتے اور شام کو گاؤں میں ہی کلینک کھول رکھا تھا۔ میں نے بھی کورس پورا کر کے کلینک پہ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ بھائی کی غیر موجودگی میں لوگوں کو دوائیں دیتا، کسی کا بی پی چیک کرتا، کسی کا بخار، بھائی نے تھوڑا بہت مجھے سمجھا دیا تھا۔ انہی دنوں ملیریا کا بخار کسی وبا کی طرح گاؤں میں پھیلا ہوا تھا۔ بارشیں زیادہ ہونے سے گندا پانی جگہ جگہ جمع ہو گیا تھا اور مچھر بھی بڑھ گئے تھے۔ میں سارا سارا دن معروف رہتا تھا۔

☆.....☆

گھر میں سودا سلف ختم ہو گیا تھا۔ عباس بھائی کسی

کام کے سلسلے میں دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ رضا بہت چھوٹا تھا۔ ویسے بھی سودا لانے کی ذمے داری میری تھی، مگر میں مصروفیت کی وجہ سے گھر نہ جاسکا تھا۔ گھر پہنچا تو ابا کہنے لگے۔ "ذرا بھی احساس ذمے داری نہیں ہے، تم میں، سارا سارا دن آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو۔ ابا نے حسب عادت غصے سے کہا۔ میں اس وقت تھکا ہوا گھر پہنچا تھا کہ یہ افتاد آن پڑی۔ ابا کے اس انداز پر مجھے بھی غصہ آ گیا۔

"میں سارا دن کلینک پہ کام کرتا ہوں۔ شام کو تھک جاتا ہوں ایک میں ہی رہ گیا ہوں اس گھر میں، آخر میں بھی انسان ہوں کوئی مشین نہیں۔ ٹھیک ہے برسر روزگار نہیں ہوں، لیکن اپنا خرچ میں نکال ہی لیتا ہوں۔" میں غصے میں نجانے کیا کچھ بکتا گیا۔ ابا بھی برداشت نہ کرنے والے تھے، سو ہمارے درمیان اچھی خاصی لڑائی ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ جھگڑا مزید بڑھتا، امی نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ میں غصے سے باہر نکل گیا۔ مجھے جب بھی غصہ آتا میں کمرہ بند ہوجاتا اور کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔ شہزاد بھائی کو پتا چلا تو وہ منانے کے لیے آگئے۔

"میں ہرگز گھر نہیں جاؤں گا، ابا مجھے نکما سمجھتے ہیں۔" میں نے ناراض ہوکر کہا۔

"اوہو حفیظ تم بھی بچوں کی طرح ہو۔ ابا میاں کے مزاج سے تم اچھی طرح سے واقف ہو، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ جھگڑنے لگتے ہیں۔ ارے میں چار بچوں کا باپ ہوں، کبھی انہوں نے مجھے بخشا ہے، ذرا ذرا سی بات پہ ڈانٹتے ہیں۔ دیکھو حفیظ ماں باپ جب بوڑھے ہوجائیں تو انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ ان کے بچے انہیں اکیلا چھوڑ نہ دیں، اس لیے وہ ذرا سی بات پہ غصہ کرتے ہیں پھر چھوٹی امی کے بارے میں تو سوچو۔ انہیں تمہاری کتنی فکر ہوتی ہے، تم نے کھانا نہیں کھایا تو انہوں نے بھی نہیں کھایا۔"

بھائی کے کہنے پر میں نے چند نوالے زہر مار کیے، لیکن گھر جاکر سونے کے لیے میں نے صاف انکار کردیا، بھائی نے کلینک میں ہی میرا بستر سیٹ کردیا۔ یوں زندگی معمول کے مطابق چلتی رہی۔ میں گھر جاتا، جو کام میرے ذمے ہوتا اسے پورا کرکے کھانا کھا کر واپس آجاتا، کھانا بھی میں امی اور بھائیوں کے اصرار پر کھاتا تھا۔ اس دن کے بعد ابا سے بات چیت کرنا بند کردی تھی۔

میرا معمول تھا کہ روز صبح کو نہانے کے لیے بڑی نہر پر جاتا تھا، حالاں کہ ایک چھوٹی سی نہر تو ہماری کلینک کے بہت نزدیک بہتی تھی، مگر مجھے سوئمنگ کا شوق تھا۔ اس دن بھی میں حسب عادت نہا کر آرہا تھا کہ اچانک کسی



نے مجھے کنکر مارا، میں چونک کر پیچھے مڑا تو کوئی بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ میں نے سمجھا کہ شاید کسی نے شرارت کی ہوگی اور چھپ گیا ہوگا مجھے ڈرانے کے لیے، کیوں کہ نہر پہ کسی کو اگر جانا ہوتا تو وہ قبرستان سے گزر کر جاتا تھا۔ نہر کے پاس ہی ایک بزرگ درویش کا مزار تھا، برسی کے دنوں میں خیرات کی جاتی تھی۔ بہت لوگ آتے تھے، ورنہ تو یہ جگہ ویران اور سنسان تھی اور کسی کو بھی با آسانی ڈرایا جاسکتا تھا، مگر میں ڈرنے والوں میں سے نہیں تھا، کیوں کہ مجھے جنوں بھوتوں پہ یقین نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے چھم چھم کی آواز سنائی دی۔ آواز بہت قریب سے آرہی تھی، مگر میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر سر کو ایک طرف جھٹک دیا، لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔ نہر سے کلینک کا یہ راستہ میں نے کیسے طے کیا، یہ میں ہی جانتا ہوں، سارا دن پاگلوں کی طرح ادھر سے اُدھر پھرتا رہا، لیکن میں نے اس واقعے کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا۔ سب میرا مذاق اڑاتے مگر اس دن تو پانی سر کے اوپر سے گزر گیا۔

سورج غروب ہونے والا تھا اور میں تالاب کے کنارے کھڑا خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک کسی کی ہنسی کی مترنم آواز آئی اور میرا سحر ٹوٹ گیا۔ ہنسی کے ساتھ ساتھ پائل کی جھنکار کی آواز بھی شامل تھی۔ ہنسی اور پائل کی چھم چھم کی آوازیں میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں اور میں چکرا کر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔

☆......☆......☆

جب آنکھ کھلی تو خود کو بستر پہ لیٹے ہوئے دیکھا، سب لوگ متفکر نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھ پہ نقاہت طاری تھی، میں کوشش کے باوجود بھی کچھ بول نہ پایا۔ شہزاد بھائی نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور نیند کا انجکشن لگا کر سلا دیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ہشاش بشاش محسوس کیا۔ تینوں بھائی میرے پاس ہی سوئے تھے، کتنی محبت کرتے ہیں یہ سب مجھ سے، میں نے سوچتے ہوئے ان تینوں پہ نظر ڈالی تو میرے اندر بھی بے انتہا پیار اُمڈ آیا۔ باہر نکلا تو امی جو ابا کو چائے دے کر آرہی تھیں، مجھے دیکھ کر خوش ہوئیں۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری'' امی نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے مسکرا کر امی سے کہا اور ہاتھ منہ دھونے کے لیے نہر پہ چلا گیا۔ واپس آیا تو اماں میرے لیے چائے لے آئی۔ اب بڑی نہر پر جانے کے بجائے میں گھر پر ہی نہانے لگا تھا۔ میں نہا کر واپس آیا تو سب اُٹھ گئے تھے، آج چھٹی کا دن تھا اس لیے سب آرام سے سو رہے تھے۔ ہم سب نے مل کر ناشتا کیا، شہزاد بھائی اور میں کلینک پر چلے گئے سب نے منع کیا مگر میں نہیں مانا، میں تو کسی طرح سے بھی ان واقعات کو بھولنا چاہتا تھا، دن بھر مصروف رہا۔ رات کو بھائی واپس جا رہے تھے۔ جاتے جاتے رک گئے اور انہوں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بات ہے کیوں اتنے اُداس اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہو، ذرا سی بات پر چونک جاتے ہو۔''

ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی میں تو ٹھیک ہوں، میں نے جبراً مسکرا کر کہا۔ دل تو چاہتا تھا کہ سب کچھ سچ بتا دوں مگر بھائی یقین نہیں کریں گے، یہ سوچ کر میں خاموش رہا۔

''دیکھو مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم شدید ڈپریشن کی وجہ سے بے ہوش ہوئے تھے۔'' بھائی نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔

''وہ بھائی آپ کو تو معلوم ہے کہ میری ابا سے لڑائی ہوگئی ہے اس لیے میں تھوڑا پریشان رہتا ہوں دوسری تو کوئی بات نہیں۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ بھائی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہا مگر میں نظریں چرا گیا۔

بھائی خاموشی سے چلے گئے، لیکن میں ساری رات نہ سو سکا، اتنے مہربان اور شفیق بھائی سے جھوٹ بول کر میں خود کو بہت ہی چھوٹا انسان محسوس کر رہا تھا۔ اگلے دو دن خیریت سے گزر گئے، نہ میں باہر نکلا، نہ ہی کوئی واقعہ رونما ہوا۔ تیسرے دن اچانک بھائی کے بہت پرانے دوست عابد علی ان سے ملنے کے لیے آگئے، ان کا کچھ دن ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ بھائی نے مجھے گھر جا کر سونے کو کہا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ بھائی مہمان کو کہیں اور

سلائیں، مگر بھائی نے میرا ایک نہ سنی۔ میں نے اس بے وقت آئے مہمان کو کوسا، جن کی وجہ سے میری خودداری پہ حرف آنے والا تھا۔ گھر پہنچا تو میرے سونے کے لیے پلاننگ چل رہی تھی، شاید بھائی نے انہیں آگاہ کر دیا تھا۔ میرے سونے کو لے کر اچھا خاصا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ہمارا گھر صرف تین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے آپس میں جڑے ہوئے تھے، جبکہ تیسرا ان سے علیحدہ بنایا گیا تھا، جس میں امی اور بچے سوتے تھے۔ دو کمروں میں سے ایک کمرا ابا کی کسٹڈی میں تھا۔ دوسرا بھائی اور بھابی کے حوالے تھا۔ بھابی اس میں شاذو نادر ہی سوتیں، چند ڈراؤنے خوابوں کی وجہ سے بھابی نے اس کمرے میں سونا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے اس کمرے میں ہمارا رشتے دار صابر سوتا تھا جو کہ میری طرح گھر والوں سے لڑ کر آیا تھا، بہر حال یہ فیصلہ طے پایا کہ صابر شیر کے منہ میں یعنی ابا کے کمرے میں سوئے گا اور میں ان کی جگہ پر، عباس بھائی بھابی اور بچے باہر برآمدے میں سو گئے، اپنے نئے بستر پہ مجھے کافی دیر کے بعد ہی نیند آئی۔

☆......☆......☆

کچھ بدشکل لوگ آگ کے چاروں طرف ناچ رہے تھے اور میں زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، ایک آدمی موٹی سی چھری لیے میری طرف آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری گردن کٹتی میں چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا۔

اُف میرے خدایا کتنا بھیانک خواب تھا، باہر کسی نے زور سے دروازہ پیٹا، مگر مجھ میں چلنے کی سکت نہیں تھی۔

''کون ہے؟'' میں نے اپنی ساری ہمت جتا کر بمشکل پوچھا۔

''میں ہوں عباس۔'' کیا ہوا؟ اتنی زور سے کیوں چیخے؟'' عباس بھائی کی آواز سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔

''کچھ نہیں بھائی خواب میں ڈر گیا تھا۔ آپ جا کر سو جائیں۔'' میں نے عباس بھائی کو مطمئن کرنے کے لیے کہا، میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ یہ شکر تھا کہ سونے سے پہلے امی نے پانی کا جگ میرے سرہانے پڑی میز پر رکھ دیا تھا، میں نے اُٹھ کر پانی پیا، اب نیند کس کافر کو آنی تھی، سو باقی رات میں نے آنکھوں میں ہی کاٹ دی، صبح کو جاگنے کے باوجود اُٹھ نہ سکا، جسم کسی بھٹی کی مانند جل رہا تھا اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ امی جب چائے دینے کے لیے آئیں تو میری حالت دیکھ کر گھبرا گئیں، انہوں نے فوراً رضا کو بھیج کر شہزاد بھائی کو بلوالیا۔ وہ سو رہے تھے، مگر میری خراب طبیعت کا سن کر فوراً آ گئے۔

''کیا ہوا ہے حفیظ کو؟'' شہزاد بھائی نے اندر آنے سے پہلے پوچھا۔ امی نے انہیں بتایا کہ مجھے بہت تیز بخار ہے، بھائی نے تھرمامیٹر ڈال کر چیک کیا تو بخار نہیں تھا۔ بھائی حیران ہو گئے۔ بھائی کب آئے، کب گئے، مجھے کچھ پتا نہیں چلا، کیوں کہ مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے رضا نے بتائیں۔ میرے ہوش میں آنے کے بعد بھابی آئیں۔ انہوں نے اسکول سے چھٹی کی تھی۔

''عباس بتا رہے تھے کہ تو نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔'' بھابی نے آہستہ اور ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں خواب تو اتنا ڈرانے والا نہیں تھا بس میں ہی کچھ زیادہ ڈر گیا تھا۔'' میں نے زبردستی ہنس کر ان کو ٹالنے کی کوشش کی۔ بھابی سمجھ گئیں کہ میں بتانا نہیں چاہتا۔

''ٹھیک ہے بھائی تم نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی مگر میں سمجھی کہ تم نے بھی وہی خواب دیکھا ہوگا جو میں مسلسل چار سالوں تک دیکھتی رہی ہوں۔'' بھابی کے لہجے میں خوف واضح طور پر نمایاں تھا۔

''کیا خواب؟'' میں چونک گیا۔ بھابی نے جو خواب مجھے سنایا، اسے سن کر میرے پسینے چھوٹنے لگے، کیوں کہ میرا اور بھابی کا خواب مشترکہ تھا۔

''بھائی کوئی مانے نہ مانے یہ کمرا آسیب زدہ ہے۔'' بھابی نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ کمرا واقعی میں آسیب زدہ ہے تو پھر صابر اور عباس بھائی کو یہ خواب وغیرہ کیوں نہیں نظر آتے۔'' میں نے بھابی کو مطمئن کرنا چاہا۔

''وہ سب میں نہیں جانتی۔ ہو سکتا ہے ان کو بھی نظر آتا ہو یہ خواب مگر وہ بتانا نہ چاہتے ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''ہاں کچھ ہے ضرور۔'' بھابی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

''اوہو بھابی تم عورتوں کو تو ذرا سی بات پر وہم ہونے

لگتا ہے۔'' مجھے بھابی کی باتوں سے کوفت ہونے لگی تھی، میرا تو پہلے ہی بہت برا حال تھا اوپر سے بھابی کی باتوں نے مجھے مزید خوف زدہ کر دیا۔ بھابی خفا ہو کر چلی گئیں، مگر میں ان واقعات کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

وہ چودھویں کی رات تھی، چاندنی اپنے عروج پر تھی، پیاس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی، پانی پینے کے لیے دیکھا تو جگ خالی پڑا ہوا تھا، امی شاید رکھنا بھول گئی ہوں گی، مجھے امی پہ بے حد غصہ آیا، لیکن دوسرے ہی پل اپنے خیال پر نادم ہونے لگا، امی دن بھر کام کرتی ہیں، رات کو تھک جاتی ہیں۔

''گھڑے سے جا کر پانی پی آؤں گا تو کون سا دبلا ہو جاؤں گا۔'' یہ سوچ کر ہی میں باہر نکل آیا۔ چاند کی مستی نے مجھے ایک خوب صورت احساس سے روشناس کرایا۔ میں گھڑے میں سے پانی نکال کر مڑا تو جیسے ساکت ہو کر رہ گیا۔ ایک خوب رو دوشیزہ سرخ جوڑے میں ملبوس کھڑی تھی، میں نے بہت سی خوب صورت لڑکیاں دیکھی تھیں، مگر اس کا حسن تو چاند کو بھی شرمانے لگا تھا۔ میں اسے بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ بڑی اماں کے گھر کے قریب مسجد کی جھاڑیوں کی طرف جانے لگی۔

''ارے بھائی کہاں جا رہے ہو؟'' کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ اس آواز سے میرا سحر جیسے ٹوٹ گیا۔ میں چونک کر پیچھے مڑا۔

''کہاں جا رہے تھے؟'' بھابی نے اپنا سوال دہرایا۔ میں نے آگے دیکھا تو وہ نہیں تھی۔ اتنی جلدی وہ کہاں جا سکتی ہے۔

''بھابی وہ لڑکی کون تھی؟'' میں ہڑبڑا سا گیا۔

''کون سی لڑکی، تم کس کی بات کر رہے ہو'' بھابی نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔

''آپ اتنی رات کو کیا کر رہی تھیں۔'' میں نے انہیں ٹالنے کے لیے پوچھا۔

''پیاس لگی تھی، سو آنکھ کھل گئی۔ پانی پی کر سونے جا رہی تھی کہ آپ کو جھاڑیوں کی طرف جاتے دیکھا اس لیے آواز دے کو روک لیا۔'' بھابی نے یوں تو سادگی سے وضاحت کی تھی، مگر الفاظ اور ان کا انداز کافی معنی خیز تھے۔ میں نے ان سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور پانی پی کر سو گیا۔

☆......☆......☆

صبح کو اٹھا تو کلینک پر لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بھائی کی مدد سے ہلکے پھلکے مریضوں کو میں خود ہی دوائی دے دیتا، دن بھر مصروف رہا، رات کو کھانا کے لیے بھی بہ مشکل فراغت ملی۔ گھر آیا تو میری پسندیدہ ڈش مرغ پلاؤ بنایا گیا تھا۔ پلاؤ میں بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ بھابی نے پلیٹ بھر کر میرے سامنے رکھی اور خود پانی لینے کے لیے چلی گئیں، بھابی کے جاتے ہی جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس واقعے نے میرے اعصاب شل کر دیے۔ پلیٹ میں سے چاول غائب ہو گئے، مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا، بھابی آئیں تو خالی پلیٹ دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

''واہ بھئی اتنی جلدی پلیٹ چٹ کر گئے کہو تو اور لا دوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد بھابی دوسری پلیٹ لے آئیں، اس بار مجھے چاولوں کو صرف چھونا نصیب ہوا تھا۔ اب تیسری بار مانگتے ہوئے مجھے شرم آ رہی تھی، مگر پاپی پیٹ ساری خودداری ساری شرم نیست و نابود کر کے رکھ دیتا ہے، سو میں خالی پلیٹ اٹھائے باورچی خانے میں چلا گیا۔ عباس بھائی، بھابی، امی اور بچے وغیرہ چٹائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ میں کافی دیر تک کشمکش و پیچ میں کھڑا سوچتا رہا کہ کیسے مانگوں۔ کہتے ہیں کہ ماں سے کچھ نہیں چھپتا، سو امی نے پوچھ لیا۔

''حفیظ بیٹے اور چاول چاہئیں کیا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ امی چاول نکالنے لگیں۔

''حفیظ بھائی تم کب سے اتنے پیٹو ہو گئے ہو۔'' بھابی نے مذاق کیا۔

''اب تم ہمارے کھانے پہ بھی نظر رکھنے لگی ہو۔'' عباس بھائی نے خفیف سے ہو کر بھابھی کو ڈانٹ دیا۔ میرا جی بھی اُچاٹ ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بھیا اور بھابی میں ذرا بھی اَن بن ہو۔ بھابی ناراض ہو کر کھانے پر سے اُٹھ گئیں، میں بھی کمرے میں آ کر سو گیا، مگر نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میری وجہ سے خوامخواہ بھیا اور بھابی میں ناراضگی ہو گئی اور گھر میں بھی اچھی خاصی

بدمزگی پیدا ہوگئی تھی۔
صبح کو جب اٹھا تو بے خوابی اور ڈپریشن کی وجہ سے طبیعت بوجھل سی محسوس ہوئی، میں کلینک پہ بھی نہیں گیا۔ بھابی، ڈیوٹی پر چلی گئیں۔ میں ان سے معافی بھی نہیں مانگ سکا، تب ہی امی اندر آ گئیں اور بولیں۔
''آج تم کلینک نہیں جا رہے ہے تو میرا ایک کام کردو۔''
''جی امی کہیے۔'' رضا کو مدرسے داخل کروادو۔'' امی نے عاجزی سے کہا۔
میں حیران ہوگیا۔
''پر کیوں؟''
''امی رضا کی پڑھائی کا کیا ہوگا۔'' مجھ سے رہا نہ گیا۔
''تم نے اور عباس نے پڑھ کر کون سے تیر مار دیے ہیں، نہ دین کے رہے نہ دنیا کے، کم از کم رضا کو حافظ بنا کر اپنی عاقبت سنوار لوں، تم اور عباس تو دین سے غافل ہو مگر رضا کو اپنے جیسا نہ بناؤ۔'' امی نے مجھے اور عباس بھائی کو غافل کہہ کر چپ کرادیا۔ اب اگر میں مزید بولتا تو امی ہم پر کفر کا دعویٰ کر دیتیں، میں رضا کو لے کر شہر چلا گیا۔ وہ بہت ہی خوش تھا۔ میں اسے چھوڑ کر واپس آیا تو بہت تھک گیا۔ فریش ہونے کے لیے بڑی نہر پہ نہانے کے لیے چلا گیا۔ نہر پہ اکا دکا لوگ تھے، میں نے خوب تیراکی کی۔ واپسی پر سوچا کیوں نہ ایک چکر باغ کا لگالوں، یہ سوچ کر میں باغ کی طرف چل پڑا، قبرستان کے پاس ہی ہمارا باغ تھا۔ میں باغ میں گھوم رہا تھا کہ اچانک میری نظر امرود کے پیڑ پر پڑی، جس سے کوئی لڑکی ٹیک لگائے کھڑی تھی۔
''کون ہے؟'' میں نے کئی بار پوچھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں بھی مارے تجسس کے اس کی طرف جانے لگا، اندھیرا ہونے والا تھا، مگر جب تک یہ نہ جان لیتا کہ کون ہے، گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیسے جیسے میں اس کے قریب پہنچا، ایک جانی پہچانی خوشبو نے میرا دل و دماغ معطر کردیا، یہ خوشبو میں نے پہلے بھی محسوس کی تھی۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ ایسی ہی خوشبو میں نے قبرستان میں محسوس کی تھی، ایسی ہی خوشبو اس لڑکی نے بھی لگائی تھی، مجھے وہ خوب صورت لڑکی یاد آ گئی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا تا کہ وہ میری طرف متوجہ ہو، مگر وہ نہیں پلٹی۔ تب میں مجبوراً اس کے سامنے آ گیا۔
''ارے آپ تو وہی ہیں'' مارے حیرت کے میرے منہ سے نکل گیا۔ وہ معصومیت سے ہنسی کتنی خوب صورت ہنسی تھی اس کی، قدرت کا ایک شاہکار تھی۔ وہ ہنستی ہوئی چلی گئی میں گنگ کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ میں ہنستا مسکراتا گھر لوٹا، گھر میں خاموشی تھی، شاید بھیا اور بھابی میں صلح نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بڑی کوششوں کے بعد بھیا اور بھابی کو منالیا۔ ہم سب مل کر کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ خلاف دستور لطیف بھائی بھی آ گئے۔ ہم سب ان کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ کھانے کے بعد ہم بھائی کے کمرے میں آ کر بیٹھے۔
''آج کل تم کہاں رہتے ہو نظر ہی نہیں آتے ہو۔'' عباس بھائی نے لطیف بھائی سے شکوہ کیا۔ ''کیا کروں دوست کی شادی تھی، انتظام بھی مجھ ہی کو کرنا تھا، گھر میں قدم رکھتے ہی یہاں آ گیا ہوں'' لطیف بھائی نے وضاحت کی۔
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن کم از کم بتا کر تو جاتے۔'' عباس بھائی پر شکوہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔
''ارے حفیظ سے کہا تھا کہ سب کو بتا دے اس نے نہیں بتایا۔'' لطیف بھائی نے حیرانی سے کہا تو عباس بھائی نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''حفیظ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔'' عباس بھائی نے خفگی سے پوچھا۔ مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔
''وہ بھائی میں بھول گیا تھا ویسے بھی کچھ دنوں سے میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔'' میں نے مزید شرمندہ ہونے سے بچنے کے لیے بہانہ بنایا۔ عباس بھائی تو خاموش ہو گئے لیکن لطیف بھائی کے سوالات نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا۔
''کیا ہوا تھا تمہیں کسی ڈاکٹر کو دکھایا کہ نہیں۔'' میں کام کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔

☆......☆......☆

دوسرے روز میں نے سب کام جلدی سے نپٹائے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر باغ میں چلا آیا، وہ مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھی، میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ

مجھے دیکھ کر گھبرائی نہیں بلکہ ہنسنے لگی۔ اس کی سریلی ہنسی میرے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

''آپ مجھے دیکھ کر ہنس کیوں رہی ہیں۔'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ نہیں بولی بس ہنستی رہی۔ مجھے خود پہ بے حد غصہ آنے لگا۔ خوامخواہ اس کے ساتھ فری ہو رہا ہوں، جبکہ وہ میرا مذاق اڑا رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں واپسی کے لیے مڑا۔

''شہزادے'' اس نے میٹھی آواز میں مجھے پکارا۔

''محترمہ میرا نام حفیظ ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے سامنے آ گیا۔

''اچھا تمہارا نام کیا ہے۔''

''چاندنی'' اس نے کس قدر خوب صورت نام بتایا تھا، پھر ہم دونوں شام تک باتیں کرتے رہے، اس نے کہا کہ وہ شہر کے اس پار رہتی ہے، میں ہنستا مسکراتا گھر کو لوٹا، مارے خوشی کے کھانا بھی کم کھایا اب ہم ہر روز شام کو ملتے باتیں کرتے اور چلے جاتے، اب وہ پر اسرار واقعات بھی بند ہو گئے تھے جیسے کہ ان کے مویشی خود بخود کھل جاتے یا گھر کی چیزیں غائب ہو جاتیں۔ نہ ہی وہ ڈراؤنا خواب آتا میں پرسکون ہو گیا۔ گھر والوں سے میری خوشی چھپی نہ رہ سکی سب نے کوشش بھی کی لیکن میں نے سوائے شہزاد بھائی کے کسی کو نہ بتایا، بھائی نے سختی سے ہدایت کی کہ اس سے اس کے گھر کا پتا پوچھ کر بتاؤں تاکہ رشتہ لے جائیں، میں نے بھائی سے کہا کہ وہ فی الحال کسی سے ذکر نہ کریں، انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ کسی کو نہیں بتائیں گے۔

☆......☆......☆

''چاندنی'' میں نے اسے آواز دی، پر وہ کہیں نہیں تھی، میں اندھیرا ہونے تک اس کا انتظار کرتا رہا پھر تھک کر گھر لوٹ آیا۔ میں ہر روز باغ میں جاتا، اس کا انتظار کرتا۔ ایک دن جب میں تھک ہار کر جانے والا تھا کہ تبھی وہ آ گئی۔

''کہاں تھی اتنے دن'' میں نے ناراضگی سے پوچھا۔

''معاف کر دو شہزادے'' اس نے اپنے کان پکڑ لیے، وہ مجھے شہزادہ کہہ کر بلاتی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے معاف کیا، مگر یہ بتاؤ اتنے دن کیوں نہیں آئیں۔'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''میری مجبوری تھی شہزادے'' اس نے اداسی سے جواب دیا۔

''کیسی مجبوری'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''سن شہزادے اگر تجھے میری حقیقت کا علم ہو جائے تو کیا تو پھر بھی مجھ سے شادی کرے گا۔'' اس نے آس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیسی حقیقت، کیا مجبوری، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''وہ سب چھوڑو پہلے وعدہ کرو مجھ سے ہر حال میں شادی کرو گے۔''

''اچھا وعدہ۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''اب بتاؤ تمہاری کون سی مجبوری تھی اور وہ حقیقت وغیرہ کا چکر کیا ہے۔''

''میری مجبوری یہ ہے کہ میں صرف چاند کی انہیں تاریخوں تک ہی آ سکتی ہوں۔''

''کیوں؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر ترش لہجے میں پوچھا۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولی۔

''میں انسان نہیں جننی ہوں'' یہ الفاظ تھے یا دھماکہ میرا سر چکرانے لگا۔

''ہم انسانوں کی طرح آ جا نہیں سکتے، ہماری حد مقرر ہوتی ہے۔'' وہ مسلسل بولے جا رہی تھی، مگر میں تو جیسے سننے سمجھنے کی صلاحیت کھو سا بیٹھا تھا۔ میں کیسے چل کر آیا یہ تو میں ہی جانتا ہوں، وہ آوازیں دیتی رہ گئی، گھر پہنچتے ہی میں چارپائی پر ڈھے گیا۔

رات کو کھانے کے وقت سب دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، مگر میں نے نہیں کھولا۔ سب نے شہزاد بھائی کو پیغام بھیجا کہ حفیظ دروازہ نہیں کھول رہا۔ بھائی آئے تو انہوں نے بھی دروازہ کھولنے کو کہا، مگر میں نے کہہ دیا کہ میرے سر میں درد ہے اور دروازہ نہیں کھولا۔ شہزاد بھائی میری طبیعت سے واقف تھے، اس لیے سب کو ڈسٹرب کرنے سے منع کر دیا۔ دو تین دن میں گھر سے باہر نہیں گیا۔ کلینک بھی جانا چھوڑ دیا۔ بھائی کو میرے نہ آنے سے بہت تکلیف ہو رہی تھی، کام کا بوجھ ان پر بڑھ گیا تھا۔ کچھ مریض تو ایسے ہوتے کہ جن کو دیکھنے کے لیے گاؤں سے باہر جانا پڑتا تھا۔

☆......☆......☆

"کیا بات ہے حفیظ تین دن سے کلینک پہ نہیں آ رہے ہو؟" شہزاد بھائی نے نرمی سے پوچھا۔

"بس بھائی ایسے ہی" مجھ سے کوئی جواز نہ بن پڑا۔

"کیا ہوا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے تمہارا۔" بظاہر تو انہوں نے سادگی سے پوچھا، مگر میں سمجھ گیا کہ بھائی کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں۔

"کچھ نہیں بھائی بس روٹین کی زندگی سے تھک گیا تھا، سو سوچا کچھ دن آرام کر لوں۔" میں نے بات گول مول کر دی۔

صبح میں کلینک پہ گیا، تقریباً بارہ بجے کے قریب مجھے فرصت ملی۔ چائے پینے کو دل چاہا تو میں نے قدم ہوٹل کی جانب بڑھا دیے۔ مجھے لگا کہ کوئی میرے پیچھے ہے، مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا، میں ہوٹل میں داخل ہو گیا، ہوٹل پہ سوائے چائے کے کچھ نہیں ملتا تھا۔ عام لفظوں میں اسے ڈھابہ کہا جا سکتا ہے، چائے پی کر میں کلینک لوٹ آیا۔ ڈھابے اور کلینک کے بیچ میں چھوٹی سی نہر تھی، تھوڑی دیر بعد میری بھتیجی انمول مجھے لینے کے لیے آ گئی۔

"چاچا گھر چلو بڑی امی نے بلایا ہے۔" میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ امی کو کوئی خاص کام نہ تھا سودا ختم ہو گیا تھا، میں نے پیسے لیے اور سودا لینے کے لیے چلا گیا، گھر سے نکلا تو محسوس کیا کہ میرے پیچھے کوئی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو چاندنی میرے پیچھے چلی آ رہی تھی، میں نے حواس باختہ ہو کر بھاگنا شروع کر دیا۔ پانچ منٹوں کا فاصلہ میں نے ایک منٹ میں طے کر لیا، وہ دکان میرے دوست سلیمان کی تھی۔ اس نے مجھے ہانپتا دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوا یار حفیظ محلے کا کوئی کتا پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"نہیں وہ میرے پیچھے ہے، وہ مجھے نہیں چھوڑے گی۔" میں نے بوکھلاہٹ سے کہا۔

"اچھا تو تمہارے پیچھے کوئی کتیا ہے۔" اس نے مجھے چھیڑا، جانے مجھے کیا ہوا کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھا اور میں نے اس کا گلا دبانا چاہا تو اس نے جان چھڑانے کے لیے مجھے دھکا دیا، میں دیوار سے جا ٹکرایا اور بے ہوش ہو گیا، جب ہوش آیا تو چارپائی پر پڑا تھا اور سر پر مجھے معمولی سی چوٹ آئی تھی، پھر بھی نہ جانے کیوں میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، میں درد کی شدت سے چلانے لگا، بھائی نے مجھے زبردستی نیند کا انجکشن لگا کر سلا دیا۔

☆......☆......☆

"دیکھو شہزاد مجھے حفیظ کی حرکتیں کچھ ٹھیک نہیں لگتیں" امی نے فکرمندی سے شہزاد بھائی کو آگاہ کیا، شہزاد بھائی چپ رہے۔

"امی آپ کو تو بس ذرا سی بات پہ وہم ہو جاتا ہے۔" عباس بھائی نے خفگی سے کہا۔

"تو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ شہزاد جانتے ہو حفیظ نے کل چھوٹی سی بات پہ انمول کو تھپڑ مار دیا اور آج سلیمان سے جھگڑا کیا۔ آدھی آدھی رات کو اُٹھ کر باہر چلا جاتا ہے پہلے تو ایسا نہیں کرتا تھا۔" امی نے لمبی چوڑی تمہید باندھی۔

"امی آپ فکر نہ کریں میں اس سے پوچھوں گا۔" شہزاد بھائی نے انہیں یقین دلایا تو وہ مطمئن ہو کر چلی گئیں۔

صبح کو بھائی آ گئے۔

"آج تم مجھے سچ سچ بتاؤ کیا ہوا ہے۔" شہزاد بھائی نے بظاہر نرمی سے پوچھا، مگر وہ خفا ضرور تھے۔ اپنی اس حرکت کی تفصیل اپنی چھوٹی بہن صبیحہ نے مجھے دی تھی، میں خود حیران تھا میں نے ایسا کیوں کیا تھا، جبکہ مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ میں کل والے واقعے پر غور کر رہا تھا کہ شہزاد بھائی نے یہ سوال پوچھ کر مجھے مزید پریشان کر دیا۔ میں نے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔ بھائی نے کریدنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام ہو کر لوٹ گئے، جاتے وقت وہ خفا لگ رہے تھے۔ میں پہلے ہی پریشان تھا، بھائی کی ناراضگی نے مجھے مزید ڈسٹرب کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔ دو تین دن میں بستر پہ پڑا رہا۔ بالآخر مجھے سلیمان سے معافی بھی تو مانگنی تھی۔ میں نے جب سلیمان سے معافی مانگی، وہ مجھ سے بہت ناراض تھا، مگر میرے ماضی کے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اس نے مجھے معاف کر دیا۔ مجھے بہت ہی سکون محسوس ہوا۔ میں واپس گھر آ رہا تھا کہ مجھے راستے میں ہمارا مزارع نورا مل گیا اور کہا کہ مجھے باغ میں عباس بھائی بلا رہے ہیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی چلا گیا، باغ میں آیا تو کوئی نہیں تھا، دیکھا کہ کوئی امرود کے درخت سے

ٹھک لگائے کھڑا ہے۔ میرا دل کسی انجانے خدشے کی وجہ سے دھڑکنے لگا۔

"کون ہے۔" میں اسے آوازیں دینے لگا۔ جو منظر مجھے نظر آیا اسے دیکھ کر مجھ پہ سکتہ طاری ہوگیا، چاندنی اپنا مخصوص لباس پہنے میرے قریب آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے بھاگنا چاہا، مگر کسی پُر اسرار قوت نے میرے پاؤں جکڑ لیے، اس نے مسکرا کر ایک نگاہ میری جانب ڈالی اور چل پڑی، میں بے اختیار اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میرے بس میں کچھ نہیں تھا، جدھر جدھر وہ لے گئی میں چلتا گیا، وہ راستے تھے یا بھول بھلیاں۔ ہمارے گاؤں میں تو ایسا کوئی بھی راستہ نہ تھا۔ وہ ایک جگہ مجھے لے گئی۔

"یہ میرا گھر ہے۔" چاندنی نے مجھے بتایا۔ میں کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا مگر ہونٹ ہلتے ہی نہیں تھے، اچانک ایک خوفناک شکل والا جن میرے قریب آیا، میں ڈر گیا، چاندنی اور وہ جھگڑنے لگے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، پھر اچانک وہ غائب ہوگیا۔ چاندنی میرے قریب آئی اور کہنے لگی۔

"شہزادے تمہاری وجہ سے میں نے اپنے گھر والوں سے جھگڑا کیا اور برادری والوں کی ناراضگی مول لی، اب مجھے مایوس نہ کرنا پھر ایک دم ہی یہ کیفیت ختم ہوگئی اور جیسے میں آزاد ہوگیا، میں نے بھاگنا شروع کیا پیچھے مڑے بنا، جیسے پیچھے مڑوں گا تو پتھر کا ہو جاؤں گا، سورج غروب ہوگیا تھا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ جانے کتنی دیر تک میں دوڑتا رہا۔ کیسے گھر پہنچا اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہوگا۔ گھر پہنچ کر میں چارپائی پر دھڑام کر کے گرا اپنے آپ کو پھینک دیا۔ میری سانسیں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔

میں کافی دیر دم سادھے پڑا رہا۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اُٹھ کر پانی پیتا، کافی دیر بعد بھابی منے کی فیڈر لینے کے لیے کمرے میں آئیں۔ مجھے اس حال میں پڑا دیکھ کر فکر مند ہوگئیں۔

"کیا ہوا ہے بھائی ایسے کیوں پڑے ہو۔" بھابی کے لہجے میں فکر عیاں تھی۔ میں نے انہیں جواب نہیں دیا، میرا جواب نہ پا کر بھابی چلی گئیں، تھوڑی دیر بعد امی کے ساتھ واپس آئیں۔ "کیا ہوا ہے حفیظ؟" امی نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

"دوپہر کے کھانے پر بھی نہیں آئے۔ سارا دن عباس اور لطیف تمہیں ڈھونڈتے رہے اب بھی دوسرے گاؤں گئے ہوئے ہیں، کہیں تم وہاں نہ چلے گئے ہو۔ بیٹا تم اب بچے نہیں رہے ہو اور کسی کا نہیں تو کم سے کم میرا ہی خیال کر لیا کرو، نجانے کیسے کیسے ہول دل میں اُٹھ رہے تھے۔ امی روہانسی ہوگئیں، لیکن میں خاموش پڑا رہا۔ باری باری سب نے مجھے ڈانٹا، پیار سے سمجھا کر پوچھا، مگر میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ایک شہزاد بھائی نہیں آئے تھے، کیوں نہیں آئے تھے یہ اس وقت میں سوچنے کے قابل نہ تھا۔ وہ رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ ذرا ذرا سی بات پہ چونک جاتا، ہلکی سی آہٹ پہ ڈر جاتا۔ ایک تو محبت میں ناکامی دوسرے خوف ناک واقعات نے میرے اعصاب شل کر دیے تھے۔

☆......☆......☆

صبح صادق کا اجالا نمودار ہونے کو تھا۔ امی نماز پڑھ کر اُٹھ چکی تھیں۔ میں بلا ارادہ باورچی خانے میں چلا آیا۔ دروازے پر رک کر میں امی کو دیکھتا رہا۔

"ارے حفیظ بیٹا، اتنی جلدی اُٹھ گئے، اچھا چلو اندر آ کر بیٹھو۔" امی نے پیار سے کہا۔ میں خاموشی سے چارپائی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

"چائے پیو گے۔" امی کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا میرے لیے، میں خود کو ان کا مجرم سمجھنے لگا تھا۔ ان کو میری ذات سے کبھی کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اوپر سے میں ان کے لیے اور پریشانیاں کھڑی کر رہا ہوں، میں آہستگی سے اُٹھا اور ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

"کیا ہوا حفیظ" امی نے پیار سے میرا سر سہلایا۔ میں نے امی کا ہاتھ چوما اور پھر کسی بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا اور ان سے معافیاں مانگنے لگا۔

"چل اُٹھ میرے بچے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" امی مجھے سہارا دے کر اندر لے آئیں۔

"تم یہاں آرام کرو میں تمہارے لیے ناشتا لے کر آتی ہوں۔" امی ماتھے پر بوسہ دے کر چلی گئیں، میرے دل کا غبار کافی حد تک چھٹ چکا تھا۔ میں آہستہ سے چارپائی پر لیٹ گیا۔ ان سے معافی مانگنے کے بعد خود کو

بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا، امی ناشتا دے کر چلی گئیں۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا پھر بھی بھوک نہیں تھی، میں نے دو چار نوالے زہر مار کر لیے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور پھر میں کچھ سوچ کر کھیتوں پر چلا گیا۔

☆......☆......☆

نورا جانوروں کے لیے گھاس کاٹ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے پوچھوں۔ کافی دیر تک تذبذب کا شکار ہو کر دیکھتا رہا۔

''سلام حفیظ بھائی۔'' نورے نے دور سے چلا کر سلام کیا، میں اس کے قریب چلا آیا۔

''کیسے ہو نورے۔'' میں نے بے مقصد بات شروع کرنے کے لیے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' نورے نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اچھا نورے یہ تو بتاؤ تم کل باغ کی طرف گئے تھے'' میں نے اسے کریدا۔''

لو جی آپ کو نہیں پتا میری بیوی امید سے تھی اس لیے اس کو لے کر سسرال جانا پڑا۔ آپ کو تو پتا ہے آنے جانے میں ٹائم لگتا ہے، میں تو جی رات کو ہی پہنچا ہوں۔'' نورے نے وضاحت کے ساتھ کہا۔

نورے کی باتوں سے مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس نے مجھے یہ جھوٹا پیغام نہیں دیا تھا، اگر یہ پیغام نورے نے نہیں دیا تھا تو پھر وہ کون تھا۔ میں جتنا سوچتا مزید الجھ گیا، میں تھکے قدموں چلتا ہوا گھر پہنچا۔ کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا، دل بہلانے کے لیے میوزک سننے لگا۔ روپ کمار کی غزل چل رہی تھی۔

''تیرے بنا جینے کا ارادہ تو نہیں تھا۔
ایسا کوئی زندگی سے وعدہ تو نہیں تھا۔''

اس غزل نے جیسے جلتی پہ تیل چھڑکنے کا کام کیا اور میں نے غصے میں آ کر ٹیپ توڑ دیا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح چھٹی کا دن تھا، شہزاد بھائی مجھے لینے کے لیے آ گئے، مجبوراً مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔ بھائی کی جانب سے مجھ پہ کام کا بوجھ زیادہ نہیں پڑا۔ اچانک میرے سر

غزل

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے
خطا وار سمجھے گی دنیا تجھے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے

ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں
صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے

غلامی کی برکت سمجھنے لگیں
اسیروں کو ایسی رہائی نہ دے
خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

انتخاب: بشیر بدر

میں درد اٹھا اور گھٹن سی ہونے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا سر پھٹ جائے گا، بھائی سمجھے کہ چوٹ کی وجہ سے مجھے درد ہو رہا ہے۔ حالاں کہ زخم کافی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا، بس نشان باقی تھا، بھائی نے مجھے پین کلر گولی دی اور نیند کا انجکشن بھی لگایا، مگر سب بے سود ثابت ہو گئے۔ بھائی نے اپنے طور پر اس درد کو قابو کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام ہو گئے، اس لیے وہ مجھے شہر کے اسپتال لے گئے۔ تعجب کی بات ہے کہ اسپتال پہنچتے ہی میرا درد ختم ہو گیا۔ بھائی نے کچھ ٹیسٹ کروائے اور ہم واپس آ گئے، گھر واپس آیا تو پورا خاندان جمع ہو گیا تھا۔ یار، دوست، ہمدرد جس کسی نے بھی میری بیماری کا سنا، فوراً عیادت کرنے کے لیے آ گیا۔ یہ سلسلہ دوسرے دن بھی جاری رہا۔ دوسرے دن بھائی میری رپورٹس لے آیا سب رپورٹس کلیئر تھیں یعنی مجھے کوئی بیماری نہیں تھی۔ شہزاد بھائی نے اسے ڈپریشن کا نام دیا اور میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے کہ آخر معاملہ کیا ہے، میں خاموش رہا۔ سب نے اپنے اپنے طریقے سے اگلوانا چاہا مگر ان کا کوئی حربہ کارگر نہ ہو سکا۔ کچھ دن آرام سے گزر گئے، کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ لیکن میرا دل پھر



بھی بے چین رہا۔

☆......☆......☆

وہ جمعے کا دن تھا۔ میں نماز پڑھ کر لوٹ رہا تھا کہ میری طبیعت پھر سے بگڑ گئی۔ میرا سر پھٹنے لگا میں درد کے مارے چیخنے لگا۔ میری اس حالت کو دیکھتے ہوئے کچھ نمازی مجھے سہارا دے کر گھر تک لائے۔ شہزاد بھائی ڈیوٹی پر تھے، لطیف بھائی کو تھوڑی بہت معلومات تھی، اس نے نیند کا انجکشن لگا کر مجھے سلانے کی کوشش کی۔ شام تک میری یہ حالت برقرار رہی، شہزاد بھائی جب ڈیوٹی سے واپس آئے تو انہیں میری اس حالت کا پتا چلا تو وہ بھی دوڑے چلے آئے۔ عجلت میں وہ اپنا اسٹیتھو اسکوپ بھول آئے۔ اپنے منجھلے بیٹے فہد کو بھیجا، فہد لے آیا، صبح کو جب مجھے ہوش آیا تو شہزاد بھائی وہاں موجود تھے۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' شہزاد بھائی نے فکر مندی سے پوچھا۔

''بالکل فٹ'' میں نے مسکرا کر جواب دیا، شہزاد بھائی باہر چلے گئے۔

☆......☆......☆

''دیکھا میں نے کہا تھا نا تم سے کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور'' اماں کی آواز آئی۔

''بارہ سال ہو گئے ہیں مجھے ڈاکٹر بنے، میں نے ہزاروں مریض دیکھے ہیں، مگر کسی کی بھی آنکھیں سو واٹ کے بلب جیسی نہیں چمکتی دیکھیں۔'' شہزاد بھائی نے امی کی باتوں کی تائید کی ''مگر یہ مسئلہ حل کیسے ہوگا'' عباس بھائی نے سوال کیا۔ وہ لوگ بہت آہستہ سے باتیں کر رہے تھے، مگر ان کی آوازیں میرے کانوں تک بخوبی پہنچ رہی تھیں۔

''تو گویا ان لوگوں کو اس بات کا علم ہو گیا ہے'' میں نے سرد آہ بھر کر سوچا۔

''شہزاد بھائی آپ کا دوست عابد علی آیا ہے'' لطیف بھائی نے انہیں اطلاع دی، بھائی چلے گئے۔

''کیا حال ہیں، کیسے ہو؟'' شہزاد بھائی نے مصافحہ کیا۔ ''شکر الحمد للہ'' عابد علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا بات ہے کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' عابد علی نے بھائی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''عابد علی اور بھائی کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ لہٰذا بھائی نے انہیں سب کچھ سچ بتا دیا۔

''یار عابد اب تم ہی بتاؤ کہ کیا کریں۔'' بھائی نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ تمہارا یہ مسئلہ سمجھو حل ہو گیا۔ ایک حافظ صاحب ہیں ہمارے شہر میں ایسے کاموں کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔''

''لیکن پتا نہیں حفیظ مانے گا یا نہیں۔'' بھائی نے تشویش کا اظہار کیا۔

''کوئی بات نہیں تم ایسا کرو اس کی اتاری ہوئی قمیص لے آؤ۔''

''مگر کیوں؟'' بھائی نے حیرانی سے پوچھا۔

''حافظ صاحب اس قمیص کو ناپتے ہیں پھر اس پر پڑھائی کرتے ہیں، پھر دوبارہ سے ناپتے ہیں، اگر قمیص کا ناپ چھوٹا ہو تو سمجھو کہ اس کو جن ہے۔'' عابد علی نے وضاحت کی، بھائی گھر واپس آئے اور عباس بھائی سے مشورہ کیا، ان سب کی مشترکہ رائے تھی کہ میں خود جاؤں، میں خود بھی اس صورتحال سے عاجز آ چکا تھا اس لیے میں نے ہامی بھر لی، میں اور شہزاد بھائی، عابد علی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

میرے ذہن میں حافظ صاحب کا جو نقشہ تھا وہ اس کے برعکس تھے۔ چوڑی پیشانی، لمبی اور پتلی ناک، کالی سیاہ آنکھیں بڑھی ہوئی کالی داڑھی، ان کے نورانی چہرے کو دیکھ کر خود بخود ان کی عزت کرنے کو دل چاہتا، انہوں نے مجھے پاس بٹھالیا۔

''مسئلہ کیا ہے؟'' لہجہ انتہائی نرم تھا۔ شہزاد بھائی کو جتنا علم تھا، وہ سب حافظ صاحب کو بتایا۔ اصل معاملے کا پتا تو صرف مجھے تھا۔ حافظ صاحب جن کا نام امان اللہ تھا بھائی اور عابد علی کو باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ باہر چلے گئے میں اکیلا رہ گیا، شہزاد بھائی کی عدم موجودگی میں، میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ میری بوکھلاہٹ کا اندازہ حافظ صاحب کو ہو گیا، اس لیے آہستہ سے میرا ہاتھ دبا کر کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میرے دل کو تھوڑی سی تسلی ہوئی، انہوں نے ایک نقش میرے سامنے رکھا۔ میں

صرف لفظ "کلمہ اشہد" پہچان سکا، کیوں کہ میں نے قرآن شریف نہیں پڑھا تھا۔ میں اس نقش میں غور سے دیکھنے لگا۔ حافظ صاحب زیر لب جانے کیا پڑھنے لگے۔ جیسے ہی انہوں نے پڑھنا شروع کیا میرے پورے بدن میں کپکپی سی ہونے لگی، مجھ پر رعشہ سا طاری ہونے لگا۔ میری حالت غیر ہوتی دیکھ کر انہوں نے پڑھنا بند کر دیا جیسے ہی انہوں نے پڑھائی بند کی، میں واپس نارمل حالت میں آ گیا، مگر جیسے ہی انہوں نے یہ عمل دوبارہ شروع کیا، میری حالت پہلے جیسی ہو گئی، تین بار حافظ صاحب نے یہ عمل کیا، عمل بند کرتے ہی وہ میری طرف گویا ہوئے۔

"کوئی وعدہ تو نہیں کیا اس سے۔"

"جی ہاں کیا ہے۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"کیا؟" انہوں نے نرمی سے پوچھتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"یہی کہ میں اس سے شادی کروں گا، تب مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ انسان نہیں جنّنی ہے۔" میں نے آہستہ سے وضاحت کی۔

"ہوں۔" انہوں نے ہنکارا بھرا، مجھے خود پہ حیرانی ہونے لگی، کیسے میں نے انہیں سچ سچ بتا دیا۔ انہوں نے میری حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"جس طرح ایک مریض اگر ڈاکٹر سے چھپائے تو اس کی صحت کو نقصان پہنچتا ہے اگر کوئی اپنے وکیل سے بھی رازداری کرے گا تو اسی کا کیس خراب ہوگا۔ بالکل اسی طرح اگر تم مجھ سے کوئی بات پوشیدہ رکھو گے، تو تم کبھی بھی اس بھنور سے نکل نہیں سکو گے۔" ان کی تمہید کا مجھ پر اچھا خاصا اثر ہوا، میں نے ساری تفصیل انہیں دی۔ حافظ صاحب نے باہر بیٹھے شہزاد اور عابد علی کو بلایا۔

"ابھی وہ اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بہت ہی ضدی اور خود سر جنّنی ہے۔ وہ آسانی سے نہیں مانے گی۔" حافظ صاحب نے ذرا دیر توقف کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

"یہ تعویذ دے رہا ہوں گلے میں باندھنے کے لیے اور ساتھ میں یہ پانی بھی ہے۔ پورے اکیس دن پلانا جو پانی بچ جائے اس سے یہ اکیسویں دن نہالے۔" ہم نے حافظ صاحب سے اجازت لی اور چلے آئے، گھر میں سب بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔ حافظ صاحب کے کہنے کے مطابق وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گی، رات کو ہمارے کمروں کے دروازے پر دستک ہوتی اور دروازے کھل جاتے، ابھی ہم بند کر کے لیٹتے کہ پھر سے کوئی زور سے دروازہ پیٹتا، وہ پہلی رات تھی کہ میں نے اکیلے نہیں بلکہ پورے گھر والوں نے یہ عذاب سہا۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی یہ ڈراما بند ہوگیا۔ اس تعویذ کے پہننے کے باوجود وہ مجھ سے ملتی اور تعویذ اُتارنے کے لیے اکساتی، مگر میں اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا۔ اس نے میرے گھر والوں کو ستانا شروع کر دیا تھا، خصوصاً بھابی کو، بھابی منے کو دودھ پلا کر خالی بوتل رکھ جاتی تو وہ بوتل غائب ہو جاتی، کچھ دیر بعد وہ بوتل کسی دوسری جگہ پہ دھلی ہوئی ملتی، کبھی کوئی چیز خود بخود ٹوٹ جاتی، شکر کی بوتل جو بھابی الماری میں رکھتیں۔ رات کو شکر ڈال کر رکھتیں صبح کو خالی ملتی۔ دوسرے دن دیکھتیں کہ چمچ بوتل کے آر پار ہو گیا ہے۔ جس نے بھی دیکھا تو اس کی عقل حیران ہو گئی، کچھ دنوں میں یہ خبر علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب گھر والے ان واقعات سے عاجز آ گئے تھے اس لیے شہزاد بھائی کو دوبارہ حافظ صاحب کے ہاں بھیجا۔ حافظ صاحب نے کہا کہ انہیں اتوار کو لینے آئیں، پھر وہ یہاں پہنچ کر اس کے آستانے کو نذر آتش کریں گے اور انہیں ہجرت کرنے پر مجبور کریں گے۔

☆......☆......☆

ہفتے کی رات کو پیاس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ عجب اتفاق تھا کہ جگ خالی تھا، مجبوراً مجھے پانی پینے کے لیے باہر جانا پڑا۔ پانی پی کر میں واپس مڑا تھا کہ میرے قدم وہیں پر جم گئے۔ سامنے چاندنی اُداس و پریشان کھڑی تھی۔ اس کی ہنسی غائب تھی۔

"شہزادے" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"میں نے تو تم سے محبت کی ہے، اپنے گھر والوں سے بغاوت کر کے تمہیں اپنانے کا فیصلہ کیا تھا، مگر تم نے یہ کیا کیا؟ وہ کل آئے گا تمہیں مجھ سے جدا کرنے کے لیے۔ اگر اس میں تمہاری مرضی شامل ہے تو ٹھیک ہے میں تم سے نہیں ملوں گی، مگر تم میرے گھر کا پتا اس ظالم کو

مت بتانا۔

''مم...... میں تمہاری بات کا یقین کیسے کروں۔''

میری زبان لڑکھڑانے لگی۔

''میں اپنی مقدس کتاب کی قسم کھاتی ہوں کہ میں تمہیں آئندہ پریشان نہیں کروں گی، تمہیں تمہاری مقدس کتاب کی قسم تو اس حافظ کو میرے آستانے کے بارے میں مت بتانا، اچھا خدا حافظ جانے سے پہلے میں تم سے ملنے کے لیے آؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی، صبح کو میں نے سارا واقعہ شہزاد بھائی کو سنا کر جانے سے منع کر دیا۔ مگر بھائی نہیں مانے انہوں نے کہا کہ وہ حافظ صاحب کو اس بات سے آگاہ کریں گے پھر آگے جیسا وہ مناسب سمجھیں۔

''ایسی جنّوں کا کوئی بھروسا نہیں پھر بھی اگر وہ نہیں چاہتا تو ٹھیک ہے جیسی اس کی مرضی۔'' حافظ صاحب نے تشویش تو ظاہر کی، مگر فیصلہ میری مرضی پر چھوڑ دیا، باقی سارا دن خیریت سے گزر گیا کوئی واقعہ اس دوران نہیں ہوا۔

☆......☆......☆

بیسواں دن تھا، اس روز کے بعد مجھے ان پریشانیوں سے نجات مل جانی تھی، مگر ساتھ میں اس کے بچھڑ جانے کا دکھ بھی تھا۔ میں اور صابر رات کا کھانا کھانے کے بعد کلینک جانے لگے۔ صابر ہمیشہ ریڈیو ساتھ رکھتا تھا، اس رات بھی حسب دستور ریڈیو اس کے ہاتھ میں تھا۔ ریڈیو پاکستان حیدرآباد پر عابدہ پروین کا کلام ''تیڈے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا'' چل رہا تھا۔ اس نے سوئی پھیر کر بی بی سی پہ رکھی اور خبریں سننے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ واپس رکھو مگر وہ نہیں مانا، اس پر جانے مجھے کیا ہوا میں نے صابر کا گریبان پکڑ لیا۔ صابر کوئی کمزور تو نہیں تھا مگر اس وقت میری طاقت اور دباؤ کے آگے وہ بے بس ہوگیا۔ اس نے مدد کے لیے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ اس کی چیخ پکار پر کافی تعداد میں لوگ جمع ہوگئے۔ مجھے صابر سے الگ کیا اور گھر لے آئے۔ مجھے گھر چھوڑ کر سب چلے گئے۔ میں اچانک عورتوں کی طرح سسک کر رونے لگا۔ میری سسکیاں عورتوں کی طرح تھیں، آنکھیں شعلے اگل رہی تھی۔

''بھابی میرے پاس آ بیٹھی اور پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے۔''

''چاندنی'' میری سسکیاں رک گئیں۔

''تم مجھے تنگ کیوں کرتی تھیں؟'' بھابی نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''تم مجھے اچھی لگتی ہو، تمہارے بچے بھی پیارے ہیں، میں تم سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔''

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' بھابی نے بے خوفی سے پوچھا۔

''مجھے آزادی دے دو، مجھے چھوڑ دو۔'' میری سسکیاں پھر سے گونجنے لگیں، پھر میری آنکھیں بند ہوگئیں، کافی دیر کے بعد مجھے ہوش آیا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں تھا یہ ساری باتیں مجھے بھابی نے بتائیں۔ ''مگر بھابی تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

''وہ عورتوں کی طرح رو رہی تھی'' بھابی نے جواب دیا۔ میں ڈر گیا کیوں کہ بقول امی کے وہ میرے اندر داخل ہوگئی ہے، صبح کو اُٹھ کر میں نے بچے ہوئے پانی سے غسل کیا اور شہزاد بھائی کے ساتھ حافظ صاحب سے ملنے کے لیے چلا گیا، بھائی نے رات والا واقعہ حافظ صاحب کو سنایا، انہوں نے وہی نقش میرے سامنے رکھ کر پڑھائی شروع کی مگر اس بار مجھے کچھ نہیں ہوا۔

''وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے'' حافظ صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''مگر پھر وہ رات والا واقعہ'' شہزاد بھائی نے سوال کیا۔

''وہ حفیظ سے رخصت ہونے کے لیے آئی تھی، اسے آخری بار دیکھنا چاہتی تھی۔''

حافظ صاحب نے شہزاد بھائی کو جواب دیا، شہزاد بھائی نے حیثیت کے مطابق حافظ صاحب کو نذرانہ دیا، حافظ صاحب لینا تو نہیں چاہتے تھے مگر بھائی کے بے حد اصرار پر لے لیا۔ گھر جا کر بھائی نے سب کو یہ خوش خبری سنائی، سب بے حد خوش تھے مگر میرا دل اُداس تھا۔ میں سوچتا ہوں کاش وہ انسان ہوتی، مگر یہ صرف خود کو تسلی دینے کے لیے، حقیقت تو یہ ہے کہ میں وفا کے قابل نہیں تھا۔ اس نے جنّی ہو کر وفا کی، مگر میں اشرف المخلوقات ہو کر بھی اپنا عہد نہ نبھا سکا۔

☆☆......☆☆

خوف

کشور وسیم

ایک شخص کا قصہ، جس کا خوف عمر بھر اس کے ساتھ رہا

یہ آج سے کئی سال پرانا واقعہ ہے جو کہ میری والدہ نے مجھے سنایا تھا۔ یہ واقعہ میری والدہ کے خالہ زاد بھائی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ پُراسرار واقعہ مشرقی پاکستان کے بننے سے پہلے کا ہے۔ یہ پُراسرار واقعہ انہی کی زبانی سنیے۔

''مشرقی پاکستان سے پہلے ہم اور ہماری خالہ کا خاندان سید پور میں رہائش پذیر تھا۔ میرا خالہ زاد جس کا نام نعیم تھا۔'' اُس وقت جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے قریب تھی اور وہ ڈھاکہ شہر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ چھٹیوں میں اپنے گھر سید پور آئے تو



اُن کے ساتھ اُن کے کچھ دوست بھی تھے۔ جو بصد شوق اُن کا گاؤں دیکھنے ان کے ساتھ آئے تھے۔ چھٹیوں کی فراغت تھی وہ روزانہ کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتے کبھی مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ تو کبھی تالاب میں نہا رہے ہیں۔ کبھی باغوں سے پھل توڑ کر کھا رہے ہیں۔

اسی گھومنے پھرنے میں ایک روز وہ کسی ویران جگہ پر نکل گئے۔ سبزہ اور ہریالی دیکھتے دیکھتے وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ یہاں تک کہ شام ہونے لگی۔ اچانک انہیں دور ویرانے میں ایک جھگی نظر آئی۔ کچھ سوچ کر وہ اُس جھگی کی طرف بڑھ گئے۔ جھگی کی طرف جاتے ہوئے اُن کے دوستوں نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑا آگے بڑھے تو اُن کو جھگی میں ایک کھڑکی نظر آئی۔ جھگی کی کھڑکی سے انہوں نے ذرا سا جھانک کر دیکھا تو اُن کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔

کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ڈراؤنی شکل کی بڑھیا وہاں موجود ہے اور وہ کچھ کھا رہی ہے نعیم بھائی نے جب غور سے دیکھا تو وہ انسانی دل تھا اور وہ بڑھیا اُسے چبا چبا کر کھا رہی تھی۔ یہ دیکھنا تھا کہ اُن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور ان کو زور سے ابکائی آ گئی الٹی کی آواز سن کر بڑھیا اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

ابھی وہ وہاں سے بھاگنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک انہیں اپنی پیٹھ پر دباؤ محسوس ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی ڈراؤنی بڑھیا تھی۔ جس نے اپنے خون سے بھرے ہاتھ کا پنجہ اُن کی پیٹھ پر چھاپ دیا۔

اور اُن کے دل کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور غراتی ہوئی آواز میں کہا کہ ”یہ دل میرا ہو گیا“ یہ سُنتا تھا کہ وہ آیتیں اور دعائیں پڑھتے ہوئے سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ گرتے پڑتے جانے کیسے گھر پہنچے کچھ دیر کے بعد اُن کے دوست بھی اُن کو تلاش کرتے کرتے اُن کے گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچ کر بھی اُن کی حالت نہ سنبھلی۔ اُن کی الٹیاں بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ اُن کے دوست بھی اُن کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اُن کے گھر والے اُن کے دوستوں سے اس بارے میں پوچھنے لگے لیکن انہیں کچھ پتا ہوتا تو وہ بتاتے۔

یہ سب دیکھ کر خالہ خالو اور ان کے بھائی بہن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نعیم بھائی سے بھی پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ بے ربط گفتگو کرتے۔ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ علاج چلتا رہا لیکن درد بڑھتا رہا جوں جوں دوا کے مصداق چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ اُن کے دوست واپس ہوسٹل چلے گئے۔

نعیم بھائی کے ایک بھائی حافظ قرآن تھے۔ قرآنی آیتیں پڑھ کر پانی پہ دم کر کے اُن کو پلایا تو اُن کو کچھ افاقہ ہوا۔ پھر اُنہیں ایک بزرگ کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے نعیم بھائی کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہا کہ اب وہ اُن کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ جتنی جلدی ہو سکے انہیں یہاں سے دُور لے جاؤ۔ وہ عورت ڈائن تھی۔ اب اُس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ ڈائن اس لڑکے کی جان لے کر رہے گی۔ وہ اس لڑکے کا دل کھانا چاہتی ہے۔ اِن حالات کی وجہ سے سارے گھر والے سخت پریشان تھے۔

اُسی دوران مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آ گیا۔ خالہ خالو اور اُن کے گھر والے نعیم بھائی کو لے کر انڈیا چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد پاکستان آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد نعیم بھائی کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اور وہ کچھ ٹھیک بھی ہو گئے۔ پاکستان آنے کے کچھ سالوں بعد خالہ نے نعیم بھائی کی شادی کر دی۔ آہستہ آہستہ اُن کی حالت بہتر ہوتی گئی۔

اُن کے بچے بھی ہو گئے۔ اب ماشاءاللہ نانا دادا بن چکے ہیں۔ نعیم بھائی اب بالکل ٹھیک ہیں۔

لیکن اب بھی جس مہینے اُن کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ پورا مہینہ اُن کے لیے بڑا مشکل گزرتا ہے۔ وہ گھر میں بند ہو جاتے ہیں اور بالکل بھی باہر نہیں نکلتے اُن کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔ چہرے کے نقوش بگڑ جاتے ہیں۔ جب وہ مہینہ گزر جاتا ہے تو وہ پھر سے نارمل ہو جاتے ہیں گھر والوں کے پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ وہ واقعہ جوان کے ساتھ کئی سالوں پہلے پیش آیا تھا۔ وہ پوری جزئیات کے ساتھ اُن کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور خوف سے اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

☆☆......☆☆

وہ رات

جہانگیر



میرا نام جہانگیر ہے۔ میں لانڈھی کا رہائشی ہوں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے، جب میں موومی میکر ہوا کرتا تھا۔ میں اپنے دوست، جس کا نام نوید ہے، وہ کورنگی میں رہتا ہے اور وہیں پر اس کی موومی میکنگ کی شاپ بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ مل کر یہ کام کیا کرتا تھا۔ آنے جانے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میں کبھی بس سے اور کبھی نوید کی موٹر سائیکل سے آیا جایا کرتا تھا۔ اُس وقت مجھے موٹر سائیکل کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ میں اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح اپنی موٹر

سائیکل خریدلوں۔ اس کے لیے میں ایک پارٹ ٹائم جاب بھی کررہا تھا اوراس سے ملنے والی رقم بھی جمع کررہا تھا۔

یہ دسمبر 2000ء کی بات ہے۔ ایک شام ایک صاحب ہماری شاپ پر تشریف لائے اور اپنی بیٹی کی شادی کی مووی بنانے کے سلسلے میں بات کی، معمولی سی بحث کے بعد معاملہ طے پاگیا۔ ہمیں مووی بنانے کے لیے کورنگی جانا تھا۔

مقررہ دن پر ہم لوگ ان صاحب کے گھر پہنچ گئے، آج ان کے یہاں مایوں کی رسم تھی۔ سب لوگ تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، ساڑھے 10 بجے کے قریب تک مایوں کی رسم کا آغاز ہوا اور جب دولہے والے آئے تو پھر یہ سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد پھر کھانا شروع ہوگیا۔ ان تمام کاموں کی مووی بناتے بناتے جب ہم فارغ ہوئے تو قریباً رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ہم لوگوں نے ان سے اجازت لی اوراپنے گھروں کو ہولیے۔

بارات والے دن ہم لوگ ہال میں پہنچے تو سردی اپنے عروج پر تھی۔ موٹے کپڑے پہننے کے باوجود ہمیں سردی محسوس ہورہی تھی۔ بارات ابھی نہیں آئی تھی۔ ہم نے فوٹوسیشن کے لیے دلہن کی والدہ سے اجازت لی اوراس کام کو مکمل کرلیا، پھر بارات آئی اوراس کے بعد نکاح ہوا اور پھر کھانے کا دور چلا، اس کے بعد رخصتی کا شور اٹھا۔ اس سے پہلے بھی رسومات کی ادائیگی کی گئی تھی۔ رخصتی کا وقت ہوا تو میں نے خدا کا شکرادا کیا۔ ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور دلہن کے والد کو بتا کر گھر جانے کی اجازت چاہی۔ ان سے اجازت لے کر ہم ہال سے باہر آئے تو نوید نے مجھے ڈراپ کرنے کی پیش کش کی۔ رات زیادہ ہوگئی تھی، نوید کو بھی پریشانی ہوتی، اس خیال سے میں نے سہولت سے نوید کو انکار کردیا۔ وہ کہنے لگا پیدل کس طرح جاؤ گے، رات بھی زیادہ ہوگئی ہے، لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ چند اسٹاپ کا ہی تو فاصلہ ہے، تم بے فکر ہوجاؤ، میں چلا جاؤں گا تو نوید مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنے گھر چلا گیا۔

میرا گھر پانچ اسٹاپ کے فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ چاروں طرف خاموشی کا راج تھا۔ سرد تیز ہوائیں ماحول کو ڈراؤنا بنارہی تھیں۔ ماحول میں رچی ہولناکی کو کم کرنے کے لیے میں نے سیٹی پر ایک شوخ سی دھن بجانی شروع کردی۔

میں سڑک کے کنارے چلا جارہا تھا۔ میرے سامنے کھمبوں کا سلسلہ دور تک گیا ہوا تھا اور ان پر جلنے والی لائٹ اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی، دفعتاً مجھے کچھ اندھیرا سا محسوس ہوا۔ میں نے یونہی مڑ کر دیکھا تو پچھلے کھمبوں کی لائٹ چلی گئی تھی، پھر میں نے جو سامنے دیکھا تو ایک کے بعد ایک تمام کھمبوں کی لائٹ بند ہوتی چلی گئی۔ اب میں مکمل اندھیرے میں کھڑا ہوا تھا۔ ابھی میں یہ سمجھنے کی کوشش ہی کررہا تھا کہ لائٹ دوبارہ آگئی۔ لائٹ کے آنے جانے کا یہ سلسلہ بتدریج جاری تھا کہ میرے دل میں کسی انہونی کا خیال آیا۔ میں نے اسی وقت جتنی بھی آیات یاد تھیں، ان کا ورد کرنا شروع کردیا اور تیز رفتار میں چلنا شروع کردیا۔ کیوں کہ اب گھر آنے والا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو لائٹ اب مسلسل جل رہی تھی، آنے جانے کا سلسلہ ختم ہوچکا تھا۔

دوسرے دن یہ واقعہ میرے ذہن سے محو ہوچکا تھا۔ میں دکان پر پہنچا تو نوید نے بتایا کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ شکر تھا کہ اس روز ولیمہ نہ تھا۔ اگلے دن ولیمے کی تقریب تھی۔ جب میں شاپ پر پہنچا تو نوید کو شدید فلو ہورہا تھا جس کی وجہ سے اسے حرارت بھی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے نوید سے کہا، تم گھر جا کر آرام کرو میں سب سنبھال لوں گا، مگر وہ نہ مانا۔ خدا خدا کرکے تقریب کا اختتام ہوا تو ہم نے سکون کا سانس لیا۔ ہم نے ان لوگوں سے اجازت لی اور میرج لان سے باہر آگئے۔ اس وقت رات کے سوا تین بج رہے تھے۔ میں نے نوید سے کہا تم گھر جاؤ میں پیدل چلا جاؤں گا۔ نوید نے بہت اصرار کیا کہ میں موٹر سائیکل پر اس کے ساتھ چلوں مگر میں نے نوید کی طبیعت کی وجہ سے اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا، دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ماحول کو اور بھی خوف ناک بنارہی تھیں۔ کہنے کو تو میں نے نوید سے کہہ دیا تھا کہ اکیلے جانا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں، لیکن اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ یہ اتنا آسان بھی نہ تھا۔

سردیوں کی اس برفیلی رات میں جہاں لوگ اپنے گرم بستروں میں گھسے نیند کے مزے لے رہے تھے، ایسے میں اگر کوئی مجھے یوں سڑکیں ناپتا دیکھ لیتا تو مجھے پاگل ہی سمجھتا، بہرحال میں نے اپنے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے اور تیز تیز آگے قدم بڑھانے لگا،

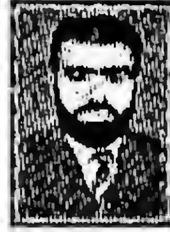
معا مجھے گزشتہ رات اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا، خوف کی ایک تیز لہر میرے بدن میں سرایت کر گئی، کچھ دور جا کر پھر وہی علاقہ شروع ہو گیا تھا جہاں سے گزرتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کورنگی 5 نمبر سے آگے چھ نمبر کے شروع میں دائیں ہاتھ پر ایک قبرستان پڑتا ہے، اس سے آگے سیدھ میں ایک روڈ جا رہا ہے، میں نے اسی روڈ سے جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔ قبرستان سے ہو کر میں اس سڑک پر آ گیا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، یہاں سے بائیں جانب ایک گلی تھی۔ میں اسی گلی میں مڑ گیا اور آگے چلنے لگا، کچھ آگے جا کر سوشل گراؤنڈ آتا تھا، اس گراؤنڈ کے متعلق عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے اس گراؤنڈ سے ملحق بلدیہ اسکول ہے، اس اسکول سے کسی شخص کی لاش برآمد ہوئی تھی، تبھی سے یہاں پُر اسرار واقعات کی شروعات ہوئی ہے۔ دن میں اس گراؤنڈ میں بچے کرکٹ کھیلتے اور پتنگ اڑاتے ہیں، مگر رات کے وقت یہ بڑا ہی خوف ناک لگ رہا تھا۔ میں نے اس گراؤنڈ پر ایک نظر ڈالی اور پھر دوبارہ اس طرف دیکھنے سے گریز کیا اور سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ مجھے واضح خوف محسوس ہو رہا تھا، اس خوف پر قابو پانے کے لیے میں نے گنگنانا شروع کر دیا۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے کچھ آہٹ محسوس ہوئی، میں پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتا رہا، آہٹ دوبارہ محسوس ہوئی تو میں نے ہمت کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا، بس کا ٹائر ہلکی رفتار سے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر چلا آ رہا تھا۔ میں رُک کر اس ٹائر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹائر میرے پاس سے گزر کر کچھ آگے جا کر گر گیا۔ میں نے اس ٹائر کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

ابھی میں کچھ ہی دور چلا تھا کہ مجھے کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں سرایت کر گئی۔ وہی ٹائر جو کچھ منٹ پہلے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا، پھر معمولی رفتار سے میری جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی کہ شاید کوئی میرے ساتھ شرارت کر رہا ہو، مگر وہاں تو دور تک سنسان پڑا تھا۔ یہ منظر میرے لیے انتہائی دہشت ناک تھا۔ میں نے وہاں سے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ میں پوری قوت سے بھاگ رہا تھا۔ میری سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ ایک جگہ میں سانس بحال کرنے کے لیے رُک گیا، ابھی میں ٹھیک طرح سے سانس بھی بحال نہ کر پایا تھا کہ مجھے اپنے سر کے اوپر سائیں سائیں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جو اوپر کی طرف دیکھا تو دھک سے رہ گیا، وہی ٹائر اب میرے سر سے کچھ فاصلے پر پوری قوت سے پنکھے کی طرح گھوم رہا تھا۔ یہ منظر اتنا ہولناک تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہ رہا اور میرے ذہن پر تاریکی چھاتی چلی گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری امی فوراً میرے پاس آئیں اور جذبات کی شدت سے رونے لگیں۔ میرے بھائی اور بہن بھی پریشان حال میرے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ بیٹا آپ کیوں بے ہوش ہو گئے تھے؟ میں اور تمہاری امی تمہارا انتظار کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے بتایا کہ آپ کا بیٹا فلاں جگہ بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ ہم لوگ تمہیں اٹھا کر گھر لائے اتنا تو مجھے معلوم ہو گیا ہے یقیناً تمہارے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا، تبھی تم یوں ہوش سے بیگانہ ہوئے تھے۔ میں نے اپنے ابو سے کہا۔ ابو آپ بالکل ٹھیک سمجھے اور پھر میں نے انہیں گزشتہ رات سے لے کر پچھلا واقعہ بھی سنا دیا۔ میری امی کہنے لگیں، بھاڑ میں جائے ایسا کام جس میں جان کے لالے پڑ جائیں، میں اب تمہیں اس کام کو کرنے نہیں دوں گی۔ ابو کہنے لگے کہ اس بات کا فیصلہ تو جہانگیر کو کرنا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب موبائل اتنے عام نہ تھے اور پھر میرے گھر پر بھی فون کی سہولت موجود نہ تھی کہ دیر ہو جانے کی صورت ان کو مطلع کر سکتا۔ ایسی صورت میں، میں اپنے کسی دوست کے گھر ٹھہر جاتا تو گھر والوں کو اطلاع دے سکتا تھا۔ میری امی نے مجھے ان واقعات کے بعد سے رات دیر تک باہر رہنے سے منع کر دیا تھا۔ میں خود بھی ان واقعات سے بہت ڈر گیا تھا۔

آج بھی جب مجھے اس رات خود پر بیتے یہ واقعات یاد آتے ہیں تو شدید خوف محسوس ہوتا ہے اور میرے دل و دماغ کی کیفیت عجیب سی ہو جاتی ہے۔

☆☆......☆☆

برکاتِ رحمانی



مجید احمد جائی

روحانیت سے شیطانیت کا مقابلہ کرنے والے نوجوان کا قصہ، ملتان سے



آج کے اس دور میں لوگ جنات پر یقین نہیں رکھتے مگر یہ سچ ہے جہاں انسان بستے ہیں وہی پر جنات کے بسیرے بھی ہوتے ہیں۔ یہ آگ سے پیدا ہوئی خلائی مخلوق کہلاتی ہے۔ جو عام طور پر نظر نہیں آتی۔ ان کے ٹھکانے ویران کھنڈرات، پرانے قبرستان ہوتے ہیں۔ مجھے بھی جنات پر یقین نہیں تھا، مگر ایک دن میرے ساتھ دوست کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا تب سے میں تسلیم کر گیا کہ اشرف المخلوقات کی طرح جنات کی بھی دُنیا آباد ہے۔ انسانوں کی طرح یہ بھی شادیاں کرتے ہیں۔ ان کے بھی خاندان ہوتے ہیں۔ جس طرح اچھے بُرے انسان ہوتے ہیں اُسی طرح یہ بھی اچھے بھی ہوتے ہیں اور انتہائی کمینے بھی۔

سردیوں کے دن تھے۔ ہر بشر مغرب کی نماز پڑھتے ہی اپنے اپنے لحافوں میں گھس جاتے تھے۔ جمال اس وقت ڈیوٹی پہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ رات کی ڈیوٹی تھی۔ گھر سے تقریباً بیس کلومیٹر کا سفر تھا۔ نہر کنارے ویران، سنسان راستہ، دن دیہاڑے بھی جہاں سے گزرتے ہوئے خوف آتا تھا۔ راستے میں ایک پرانا قبرستان پڑتا تھا۔ جب جمال ڈیوٹی پر جاتا، دور دور سے گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں ماحول میں ارتعاش پھیلا رہی ہوتی تھیں۔ کہیں کہیں آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ایک دن حسب معمول جمال ڈیوٹی پہ گیا۔ اس دن کام تھوڑا تھا جو جلد ہی ختم ہو گیا۔ جمال کو گھر جانے کی سوجھی کیونکہ آفس میں سونے کے لئے کوئی انتظام نہیں تھا۔ جمال بائیک لئے آفس سے نکل پڑا۔ گھپ اندھیرا، رات کو اپنی چادر میں لپیٹ چکا تھا۔ اوپر سے قہر کی سردی۔ ہاتھ تو کیا پورے کا پورا جسم سردی سے سن ہو رہا تھا۔ موٹر سائیکل پر ویسے بھی ہوا لگتی ہے۔ جمال سردی سے ٹھر ٹھر کانپ رہا تھا۔ ابھی آدھا سفر باقی تھا نہر کنارے گھپ اندھیرا تھا تھوڑا دور پرانا قبرستان آتا تھا جمال کا خوف سے بُرا حال تھا۔ اب پچھتا رہا تھا کاش آفس سے نہ نکلتا۔ سہمے سہمے اپنے خیالوں میں گم محو سفر تھا کہ اچانک شور برپا ہوا۔ جیسے کوئی ہنگامہ ہو۔ کسی کی ''چیخ'' آ رہی ہو۔ مگر اس وقت، گھپ اندھیرے میں جبکہ ارد گرد کوئی بشر نظر نہیں آتا تھا۔ جمال کے خوف سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ سخت سردی میں بھی پسینے سے شرابور تھا۔ اچانک بائیک کے آگے کوئی چیز نمودار ہوئی۔ جمال نے بائیک روکی ہی تھی۔ پھر اسے ہوش ہی نہ رہا۔ ایک دن جمال نے مجھے یوں بتایا کہ جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو عالیشان محل میں پایا۔ خوشبوؤں سے معطر معطر ایسا عالیشان محل میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی چاروں طرف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔ ایک قوی ہیکل لڑکی اندر داخل ہوئی۔ ڈروانی شکل، لمبے لمبے ناخن، ہاتھوں پہ بال ہی بال تھے۔ کم از کم انسان تو ایسے نہیں ہوتے۔ میں سوچ ہی رہا تھا۔ میں کہاں آ گیا

ہوں۔؟ میرے چہرے کے تاثر دیکھ کر وہ لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ابن آدم کیسے ہو۔؟

آ،،،آ،،،آپ کون بمشکل میرے حلق سے آواز نکلی۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ تم ہی تو میری جان ہو۔ تم مجھے بہت پسند ہو۔ میں تم پہ قربان ہوں۔ مجھ سے شادی کرو گے۔ تم ہو کون۔؟ میں نے پوچھا۔ میں جنات سے ہوں۔ میں نے تمہیں اُس رات دیکھا جب میں اپنے رشتے دار کی شادی میں بارات کے ہمراہ جارہی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں تمہیں اُس دُنیا سے اپنے محل میں لے آئی۔ تم جہاں سے کہیں نہیں جاسکتے ؟ مجھ سے شادی کرو گے تو تمھاری ہر خواہش پوری کردوں گی۔

لیکن مجھے تو آپ سے شادی نہیں کرنی، تم جنات میں سے ہو اور میں ابن آدم۔ میری اپنی دُنیا ہے۔ میری اپنی قوم ہے، میں آپ سے شادی نہیں کرسکتا۔ ہرگز نہیں۔ آپ کو مجھ سے شادی کرنی ہی ہوگی۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تمہارا وجود آگ سے بنا ہے۔ میں ابن آدم ہوں میرا وجود مٹی سے بنا ہے۔ ہمارا ملاپ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ کیوں نہیں ہوسکتا۔؟ بس مجھے تم سے شادی کرنی ہے۔ میری ہی مرضی چلے گی۔ میری برادری، رشتے دار میری ہی بات مانتے ہیں۔ مجھے اس نے ایک خوبصورت کمرے میں قید کررکھا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کئی دن یونہی گزر گئے۔ میں ہار گیا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے شادی کرنی پڑی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس خوشی کے موقع پر شاندار جشن کا انعقاد کیا گیا۔ رات کے گہرے ہوتے ہی اس کی برادری جمع ہوگئی۔ انسانوں کی طرح ڈھول باجے والے آئے۔ گیت گائے گئے۔ ڈانس ہوئی، رنگے رنگ کے کھانے تیار کیے گئے۔ خوب ہلہ گلہ تھا۔ آج تو مجھے کوئی بھی بدصورت نہیں لگ رہی تھی۔ حسین سے حسین لڑکیاں شریک تھیں۔ ایسا لگتا تھا سارا حسن یہاں اُمڈ آیا ہے۔ رات کے آخری وقت میں جشن ختم ہوا تو سبھی اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ رات آخر گزر گئی۔ نئے سفر کا آغاز ہوچکا تھا۔ نئی زندگی کی شروعات ہوچکی تھی۔ میری بیوی حد سے زیادہ مجھ سے پیار کرتی تھی۔

مجھے اپنے ساتھ لیے مختلف علاقوں کی سیر کرواتی، جس چیز کی طلب ہوتی فوراً حاضر کردیتی۔ سب کچھ پا کر بھی میں خوش نہیں تھا۔ میں اپنی دُنیا میں جانا چاہتا تھا۔ مجھے امی جان بہت یاد آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ دل ہر چیز پا کر بھی خوش نہیں تھا۔ نجانے کیا چیز تھی جو اکسا رہی تھی۔ یہاں مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نجات چاہتا تھا وہ بھی اپنی بیوی سے، اپنی شریک حیات سے، جو تن من سے اپنا مان چکی تھی۔

وقت کا پنچھی محو پرواز رہا۔ دن سالوں پر محیط ہوتے گئے۔ میرے اس سے دو بچے بھی ہوگئے۔ بالکل ماں کی طرح شکل وصورت، بیٹا دو سال کا اور بیٹی ایک سال کی تھی جب میری بیوی مجھے اپنے کسی عزیز کی شادی پر لے گئی۔ وہاں پر میری ملاقات ایک بزرگ جن سے ہوئی۔ جو بہت نیک تھا۔ اس بزرگ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ آپ ابن آدم سے ہو ناں۔ میں نے سر جھکا کر ہاں میں جواب دیا۔ علیک سلک ہونے پر میں نے اپنی تمام کہانی اس کے گوش گوار کی۔ میں واپس اپنی دُنیا میں جانا چاہتا تھا۔ بابا جی میں سب کچھ پا کر بھی خوش نہیں ہوں۔ آپ ہی مجھے نیک لگتے ہیں۔ کیا مجھے میری بیوی سے نجات دلا سکتے ہیں۔ کوئی نہیں بیٹا، کام مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں ہے۔ اس نے مجھے چھوٹا سا رومال دیا اور کہا جب بھی مجھ سے ملنے کی طلب ہوں۔ اس رومال کو سونگھ لینا میں حاضر ہو جاؤں گا، یہ جادو



والا رومال ہے۔ اپنی بیوی کو خبر نہ ہونے دینا، ورنہ قیامت برپا کر دے گی۔ یوں میری اس نیک جن سے دوستی ہو گئی۔ میں جب بھی اداس ہوتا ہو رومال کو سونگھ لیتا۔ رومال کا سونگھنا ہوتا تھا کہ نیک جن حاضر ہو جاتا۔ پھر ہم ڈھیروں باتیں کرتے۔ نیک جن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ کئی دفعہ مجھے اپنے ساتھ بھی لے گیا۔ پل بھر میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جاتے تھے۔ نیک جن نے کئی حج کر لیئے تھے۔ مجھے اولیائے اللہ کی محفلوں میں لے جاتا۔ میں اس کی صحبت میں رہ کر خوش تھا۔ اداسی ختم ہو گئی تھی۔

پھر ایک دن نیک جن نے مجھے کہاں جمال تیار رہنا آج آپ کو آپ کی دنیا میں چھوڑ آنا ہے۔ پہلے تو ہم چند گھنٹوں کے لئے ملتے تھے۔ پھر میں اپنے بیوی بچوں میں آجاتا تھا۔ اس طرح میری بیوی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔

میں حسب وعدہ تیار تھا۔ نیک جن نے مجھے واپس اپنی دُنیا میں پہنچا دیا۔ وہی رات کا منظر تھا۔ میری بائیک نہر کنارے کھڑی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس کا انجن ابھی تک گرم تھا۔ میں بائیک لئے کام پر چلا گیا۔ سب کچھ نارمل تھا۔ جیسے کچھ ہوا نہیں ہے۔ میرے ساتھ کیا ہوا، کیا نہیں ہوا۔ مجھے ہی پتہ تھا۔ میرے علاوہ کسی کو کچھ بھی خبر نہیں تھی۔۔۔ خیر ماں جی مجھے ایک عامل کے پاس لے گئی۔ عامل نے اپنے عمل شروع کر دیئے۔

میری بیوی کو خبر ہوئی تو انتقام پر اُتر آئی۔ مجھے اذیت دینے پر تل گئی۔ کبھی بائیک کو نقصان پہنچا دیتی، کبھی میرے گھر میں توڑ پھوڑ کر دیتی۔ مجھے بار بار دھمکی دے رہی تھی کہ میرے پاس چلے آؤ اسی میں تمہاری بھلائی ہے ورنہ میں تمہیں ختم کر دوں گی۔ میری بیوی انتقام پر اتر آئی تھی۔ آخر کار ہم ایک عامل کے پاس پہنچ ہی گئے۔ عامل نے اپنے تمام منتر پڑھ ڈالے مگر وہ قابو میں نہ آئی۔ الٹا عامل صاحب ہاتھ جوڑ کر بھاگ گئے۔ میری بیوی نے عامل صاحب کی ٹانگیں توڑ دی اور مجھے وہاں سے اٹھا لے گئی۔ میں التجاء کرتا رہ گیا، مگر اس نے ایک نہیں سنی۔ میں نے تمہیں روکا تھا کہ ایسا کچھ نہ کرنا جس سے مجھے نقصان پہنچے، مگر تم نے میری ایک نہیں مانی۔ اب دیکھتے جاؤ میں تمہارے ساتھ کیا کیا کرتی ہوں۔ تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے خاندان کو بھی ختم کر دوں گی۔ اس نے مجھے قید کر کے رکھ دیا۔ میں قیدی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا رہ گیا۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ دل ہی دل میں اس نیک بزرگ جن کو یاد کر رہا تھا۔ کہتے ہیں ناں کچھ لمحے قبولیت کے ہوتے ہیں۔ ابھی میں اس بزرگ جن کو یاد کر ہی رہا تھا کہ وہ حاضر ہوئے۔ سلام و دعا کے بعد حال احوال ہوئے۔ کہنے لگے معاف کرنا، میں اجتماع میں گیا ہوا تھا۔ آپ کے حالات کی خبر مجھے ہو چکی تھی۔ مگر آ نہ سکا۔ جس دن میں نے تمہیں تمہاری دنیا میں بھیجا تھا، اسی دن تمہاری بیوی کے ساتھ میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ میرا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتی تھی۔ تمہیں نقصان ضرور پہنچاتی رہی۔ اب اس کا علاج کرنا ہی ہو گا۔ اسے خبر ہو چکی ہے کہ میں تمہارے پاس آیا ہوا ہوں۔ میں تمہیں ایک نسخہ دے رہا ہوں اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو اسے ختم کر دینا۔ بھلا ہو اس نیک جن کا جس نے میری مدد کی۔ اس نے مجھے وہاں سے آزاد کرایا اور گھر بھی پہنچا دیا۔

کئی دن گزرے تھے کہ میری بیوی آگ بگولہ، وحشت زدہ چہرہ لئے میرے گھر آ گئی۔ وہ مجھے مارنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا کام کرتی۔ میں نے اس نیک بزرگ جن کا بتایا ہوا عمل کرنا شروع کر دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے، میری بیوی آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ چند لمحوں میں آگ نے اسے ختم کر دیا۔ آگ سے پیدا ہوئی تھی آگ میں جل کر راکھ بن گئی۔ جانتے ہو وہ نسخہ کیا تھا۔ نہیں ناں۔ چلو آج میں تمہیں بھی وہ نسخہ دے دیتا ہوں۔ کیونکہ "کر بھلا ہو بھلا" اس نیک بزرگ جن نے مجھے آیت الکرسی کا نسخہ دیا تھا۔ میں نے آیت الکرسی پڑھ کر ہی اپنی بیوی پر پھونک ماری تھی، جس سے وہ جل کر ختم ہو گئی۔ اس دن سے آج تک میں نے آیت الکرسی پڑھنا نہیں چھوڑی۔ گھر میں ہوں، یا کسی سواری پر سوار ہو رہا ہوں آیت الکرسی ضرور پڑھ لیتا ہوں۔ سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیتا ہوں، اور اپنے گھر کو بھی آیت الکرسی کے حصار میں رکھتا ہوں۔ یوں رب کی ذات مجھے جنات سے محفوظ رکھتی ہے۔ میں آج تک اس نیک بزرگ جن کو دعائیں دیتا ہوں جس نے مجھے رہائی دلائی تھی۔ واقعی انسانوں کی طرح جنات میں بھی اچھے اور بُرے دونوں ہوتے ہیں۔ آپ بھی آیت الکرسی پڑھ کر آزما سکتے ہیں۔

☆☆.....☆☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1).....مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2).....منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3).....اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ سلطان بلوچ۔ کوئٹہ

○ السلام علیکم! محترم بابا جانی پیار و محبت، چاہت و آداب سے پُرخلوص جذبے کے ساتھ سلام قبول ہو۔ بابا جی! بڑی دردناک زندگی بن گئی ہے۔ نہ دن کو سکون نہ رات کو نیند۔ نہ دوستوں سے ملتا ہوں نہ اپنوں سے۔ بابا جی اپنے ہی گھر میں اجنبی سا رہنے لگا ہوں۔ گھر والے چھوٹے بڑے سب اب تو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ جیب میں ایک روپیہ بھی نہیں، کوئی وسیلہ روزگار نہیں۔ اس لیے گھر والے برا بھلا کہتے ہیں۔ سب دوستوں نے حالات دیکھ کر کنارا کرلیا ہے۔ گھر میں تو کوئی بات تک نہیں کرتا ہے۔ بابا جی عمر 23 سال ہے۔ F.A پاس ہوں، فنی ڈپلومہ بھی کر چکا ہوں۔ اس مہنگائی میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں مگر کوئی ساتھ تک نہیں دیتا۔ بابا جی ہر جگہ پر اپلائی کی ہر جگہ سے سفارش اور پیسے نے بنایا ہوا کام بگاڑ دیا۔ بابا جان نظروں کے سامنے جو لوگ ٹیسٹ و انٹرویوز میں فیل ہو جاتے ہیں پوسٹ بھی اُن کو ہی ملتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں غریب ہونا گناہ ہے یا تعلیم حاصل نہ کرتے تو شاید آج دفتروں کے چکر کاٹنے نہ پڑتے اور غریب نہ ہوتے تو شاید آج آپ کو تکلیف نہیں دیتے۔ بابا جانی بے روزگار سے کون ملتا ہے۔ کون اپنی بیٹی دے گا۔ کون گھر میں عزت کرے گا۔ بابا جانی زندگی کو ترس ترس کے گزار رہا ہوں۔ میرے درد میرے الفاظ جو کہ مختصر ہیں مگر مجھے امید ہے کہ آپ حالات سے واقف ہوگئے ہوں گے اور سمجھ گئے ہوں گے۔ اب بھی دل خون کے آنسو رو رہا ہے کہ آخر کیوں بابا جی غریبوں کا کیا قصور، آخر کیوں۔ بابا جی پلیز آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہے کہ بنا ہوا کام نہیں ہوتا۔ سب ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیں گے کیونکہ آپ لفظ نہیں پڑھتے ہیں احساس پڑھتے ہیں میں تاحیات آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ بابا جی استخارے کے ساتھ کوئی آسان وظیفہ بتائیں جو کہ چلتے پھرتے کرسکوں۔ نماز نہیں پڑھتا ہوں اور خط کا جواب دسمبر کے مہینے میں رسالے میں دیں مجھے بے حد بے چینی سے انتظار رہے گا۔ پلیز بابا جی استخارہ ضرور کرنا اور رونے کی وجہ سے خط میں کافی غلطیاں ہو چکی ہیں میں معذرت خواہ ہوں۔ خط فرضی نام سے شائع کیجیے گا۔

☆ بیٹے سلطان! تم صرف نماز کی پابندی شروع کردو پھر دیکھنا معاملات کیسے تمہارے حق میں ہوتے ہیں۔ اللہ کے حضور سر جھکاؤ تاکہ انسانوں کے سامنے سر نہ جھکانا پڑے۔ میں تمہاری پریشانی سمجھتا ہوں اور اس کا حل بھی جانتا ہوں۔ تم پابندی سے نماز پڑھنا شروع کردو اور بکثرت درود شریف پڑھا کرو، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

□ تسنیم۔ مقام نامعلوم

☆ بیٹی تسنیم! تمہارا خط شائع کرنا اس لیے ممکن نہیں کیونکہ اس میں تم نے تمام افراد کے درست نام تحریر کیے ہیں۔ اب صرف تمہارا فرضی نام لکھنے سے بات پردے میں رہ سکتی ہے۔ جو حالات تم نے تحریر کیے ہیں اس میں تمہیں تعویذ کا مشورہ ہی دوں گا۔ بیٹی یاد رکھو حالات کبھی بھی کسی ایک کی غلطی سے خراب نہیں ہوتے کچھ نہ کچھ حصہ دوسرے شخص کا بھی ہوتا ہے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ رشتوں میں سدھار پیدا ہو اور سب آپس میں مل جل کر خلوص کے ساتھ رہیں کیونکہ اس سے بہت برکت ہوتی ہے۔ تم تعویذ منگوالو، ورد ہمراہ دوں گا۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ ع۔ خ۔ کلر سیداں

☆ بیٹی اللہ کا شکر ہے کہ معاملہ کسی حد تک قابو میں آیا۔ بیٹی ورد جاری رکھو۔ گھر اینٹوں اور دیواروں کا نہیں ہوتا گھر انسانوں سے ہوتا ہے۔ تم ورد جاری رکھو انشاء اللہ تمہارا شوہر قید سے رہائی پائے گا۔ بہن سے کہو وہ وظیفہ مزید 21 روز جاری رکھے، خیر ہوگی۔

□ شاہ فرید۔ بدین

○ بابا جی! میں نوکری کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ میرا گھر ہیڈ بیکانی میں ہے مگر نوکری کے سلسلے میں عرصہ 5 سال سے سندھ کے مختلف شہروں میں کام کر رہا ہوں۔ پچھلے دنوں حالات کی وجہ سے میرا آفس غیر معینہ مدت کے لیے بند ہے۔ بابا جی! میں چاہتا ہوں کہ جب دوبارہ میں کام پر جاؤں تو میرا تبادلہ پنجاب کی طرف ہو جائے۔ اب اپنے گھر سے قریب رہنا چاہتا ہوں۔ بہت جلالی وظیفہ دیجیے۔ وظیفہ میری بیوی کرے گی۔

☆ بیٹے فرید! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ

فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ الانعام پڑھو اور دُعا کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ نمرہ انیس۔ ڈھرکی

☆ بیٹی نمرہ! صبر اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ اپنے بچوں کو توجہ دو۔ خود بھی نماز پڑھو اور انہیں بھی نماز کا عادی بناؤ۔ بیٹی استخارہ رشتہ آنے کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ بچوں کی خوراک متوازن رکھو، پانی خوب پلایا کرو۔ جس قدر ممکن ہو یَا اَرْحَمَ الرّٰاحِمِین کا ورد کیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ آسیہ۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی

☆ بیٹی آسیہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمام مسائل کے لیے ایک نہایت مجرب وظیفہ ارسال کر رہا ہوں۔ سورۃ یونس آیت 68 ہر نماز کے بعد 101 بار پڑھو اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار، پھر دُعا کرو۔ انشاء اللہ مسائل رفتہ رفتہ حل ہوں گے۔

□ انعم۔ کوٹری

☆ بیٹی انعم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی انعم نمازِ عشاء کے بعد 7 تسبیح پڑھو۔ یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ اول و آخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ شہر ناز۔ تربت

o بابا جی! تین مہینے قبل میرے میاں کی پوسٹنگ تربت جیسے پسماندہ علاقے میں ہوگئی۔ بابا جی! یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا۔ ظاہر ہے نوکری ہی ایسی ہے مگر میرے لیے بچوں کے ساتھ یہاں رہنا بہت مشکل ہے۔ بچوں کی پڑھائی بہت متاثر ہو رہی ہے پھر بابا جی! آس پاس کوئی جان پہچان نہیں، زبان کا بھی مسئلہ رہتا ہے۔ میں ان 3 مہینوں میں بری طرح اکتا چکی ہوں۔ سارا دن فرصت ہی رہتی ہے۔ مجھے کوئی بہت جلالی وظیفہ دیں۔ میں کچھ بھی کروں گی تاکہ میاں کی پوسٹنگ جلد از جلد واپس پنجاب کی طرف ہوجائے۔

☆ بیٹی شہر ناز! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو۔ دُرود شریف بہت پڑھو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ بیٹی! بعد نمازِ فجر اور عشاء 7-7 بار یا حافظ، یا سمیع کی تسبیح پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو۔ وظیفہ لگاتار 21 روز کرو پھر ایک ہفتے کا وقفہ پھر لگاتار 14 دن۔ وظیفہ مکمل ہونے کے بعد مجھے حالات سے آگاہ کرنا۔

□ ناجیہ فاطمہ۔ منگلا۔ کینٹ

o محترم بزرگ! السلام علیکم! میری عمر 25 سال ہوچکی ہے لیکن ابھی تک میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ بابا جانی! میں چاہتی ہوں کہ میری شادی کسی اچھی جگہ اور سلجھے ہوئے لڑکے سے فوراً ہوجائے۔ اس کے لیے میں مشکل سے مشکل وظیفہ کرنے کو تیار ہوں۔ میں نمازوں کی بھی پابندی کرتی ہوں۔ بابا جانی! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ مجھے ایسا کوئی آزمودہ وظیفہ دیجیے جس سے میری شادی جلد از جلد ہوجائے۔ میرے والدین کو میری کوئی بھی فکر نہیں ہے۔ اس لیٹر کا جواب دسمبر شمارے میں ضرور دیجیے گا۔

☆ بیٹی ناجیہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح یَا سَمِیعُ یَا بَصِیرُ پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ عبدالحمید۔ مانسہرہ

o بابا جی! دُعا کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں۔ بابا جی! بات کچھ اس طرح سے ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے دُکھوں کو اپنے اردگرد گھومتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اللہ نے ہمارے باپ اور چچا کو اتنی دولت دے رکھی ہے کہ ان کو خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس کتنی دولت ہے؟ مگر اس کے باوجود وہ اتنے کنجوس ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا۔ بابا جی! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جہاں پر اس نے ہمیں اتنا کنجوس باپ دیا ہے وہیں پر اس نے ہمیں پہاڑ جیسا حوصلہ رکھنے والی ماں بھی دی ہے۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے باپ کے خلاف اتنا کیوں ہوں؟ تو بات یہ ہے کہ ان کے پاس دولت تو ہے مگر ہمارا گھر اتنا خراب ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ تو پھر میں یہ سوچتا ہوں یہ دولت کس کام کی ہے؟ آج تک کسی اولاد نے اپنے باپ پر لعنت نہیں بھیجی ہوگی مگر میں اپنے باپ پر اور اس کی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ دوسری بات یہ

ہے کہ وہ بات بات پر میری ماں سے جھگڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے میری ماں نے کئی مرتبہ خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اللہ نے اس کو بچالیا ہے۔ باباجی! میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ہماری ماں کو کچھ ہوگیا تو میں اپنے باپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ برائے کرم آپ مجھے کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیں کہ جس کے کرنے سے ہم اپنا گھر بنانے میں کامیاب ہوجائیں بلکہ ہمارے باپ اور چچا کے دل کو اللہ نرم کردے اور باباجی! آپ بھی ہمارے لیے دُعا کریں کہ اللہ ہمیں بھی خوشی کے دن دکھائے۔ (آمین!)

☆ بیٹے حمید! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہمارا مذہب ہمیں توازن کی نصیحت کرتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال کا راستہ اپنانا چاہیے۔ ہم سب کو یہی دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ اپنے تمام بندوں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ کچھ بھی ہے، وہ تمہارے والد ہیں، ان کے بارے میں برا مت سوچو۔ والدہ کو سمجھاؤ، زندگی اللہ کی امانت ہے، اس کی حفاظت کریں۔ رزق کا وعدہ اللہ کا ہے لہٰذا بے فکر رہو۔ والد اور والدہ دونوں کا خیال رکھو اور اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ والدہ سے کہو نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار سورۃ فاتحہ پڑھیں۔ مدت 41 دن ہے۔

☐ صنم اقبال۔ لاہور

○ السلام علیکم! باباجی! اس سے پہلے بھی میں نے خط لکھے اور آپ نے میرے مسائل کو حل کیا۔ باباجی! میری عمر 40 سال ہے، اچانک میرے منہ پر داڑھی اور مونچھوں والی جگہ بال نکل رہے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بال مستقل ختم کرنے کا نسخہ بتائیں تاکہ میں اس پر عمل کروں۔ اگلے شمارے میں ضرور میرے لیے نسخہ لکھ دیجیے گا۔ بہت بہت شکریہ!

☆ بیٹی صنم! تمہارا مسئلہ شدید نوعیت کا نہیں۔ کسی اچھے پارلر سے رابطہ کرو۔ اس مسئلے کے لیے خواتین گرم ویکس استعمال کرتی ہیں مگر تجربے کار خاتون سے ہی رجوع کرو۔

☐ صفیہ علیم۔ کوئٹہ

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرا یہ پہلا خط ہے اور میرا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ میری شادی کو 12 سال ہوگئے ہیں اور میں اولاد کی نعمت سے اب تک محروم ہوں۔ ہم میاں بیوی تمام ٹیسٹ کرواچکے ہیں۔ میں اپنی جگہ ٹھیک ہوں، خرابی میرے شوہر میں ہے۔ انہوں نے کافی علاج کرایا لیکن بات نہیں بنی۔ باباجی! میں بہت پریشان ہوں۔ میں اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی ہوں اور اُن کو الزام نہیں دیتی، بس صبر کرتی ہوں۔ میرے شوہر بھی اس بات پر بہت پریشان ہیں۔ اتنی ٹینشن ہے کہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر جیسے مرض میں مبتلا ہوچکے ہیں۔ میں اُن کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہوں۔ آپ کے بارے میں پڑھ چکی ہوں کہ آپ خلقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں، سو اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مہربانی کرکے کوئی اچھا سا وظیفہ ارسال کردیں۔ زندگی بھر دُعاؤں میں یاد رکھوں گی۔ میرے اور میرے شوہر کے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ (آمین!) میرا دوسرا مسئلہ میرے بہنوئی کا ہے۔ میرے بہنوئی کی کوئی مستقل سروس نہیں ہے۔ فی الحال سروے کا کام کرتے ہیں۔ تنخواہ بھی زیادہ نہیں۔ دو بچے ہیں۔ گزارہ بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ مہینے کا آخر تو ہمیشہ ادھار پر چلتا ہے۔ اُن کے لیے بھی کوئی اچھا سا وظیفہ دیں۔ ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی صفیہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ جو شخص اللہ کو راضی کرلیتا ہے، وہ کامیاب رہتا ہے۔ بیٹی! اولاد کے لیے تعویذ دیتا ہوں، تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو، میں تفصیل ارسال کردوں گا۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بہن سے کہو نمازِ فجر، ظہر اور عشاء کے بعد 7-7 بار سورۃ البقرۃ کی ابتدائی دو آیات پڑھے۔ اول وآخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ نسرین۔ راولپنڈی

○ باباجی! میری عمر اس وقت 50 سال ہے۔ میں نے ساری زندگی انتہائی غربت میں گزاری۔ ماں باپ کے گھر بھی ترستی رہی اور شوہر کے ساتھ بھی زندگی دُکھوں ہی میں گزری۔ باباجی! میں نے ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا مگر اب جب جوان بیٹوں کو مایوس دیکھتی ہوں تو بہت دُکھ ہوتا ہے۔ خود کو بہت بے بس اور بے کار محسوس کرتی ہوں۔ بچے مجھے کچھ نہیں کہتے مگر میں اُن کا دُکھ محسوس کرسکتی ہوں۔ باباجی! اب اللہ سے شکوہ کرنے کا دل

چاہتا ہے مگر پھر ڈر جاتی ہوں' کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں۔ باباجی! بہت مایوس ہوں' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی نسرین! تم مایوس ہو اس لیے بچے بھی مایوس ہیں۔ تم نہیں جانتیں کہ ماں اپنی اولاد کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی ہے۔ تم اِن سخت حالات میں بچوں کو مقابلہ کرنا سکھاؤ۔ مایوسی تو موت ہے۔ تمہارے حالات بھی اِسی لیے نہیں بدلے کہ تم مایوس رہیں۔ بتاؤ' اللہ اُس شخص کو نوازے گا جو شدید حالات کے باوجود مایوس نہیں اور مستقل جدوجہد کر رہا ہے یا اُس کو نوازے گا جو مایوس ہے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے؟ بیٹی! ہر حالت میں اللہ کی شکر گزار رہو۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی کرو۔ دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ مزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ خیال رہے' نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ مجھے حالات سے ضرور آگاہ رکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ تاج الدین۔ کراچی

○ باباجی! میں مالی طور پر بہت پریشان ہوں۔ گھر سے دور پڑا ہوں صرف روزی کے چکر میں مگر پھر بھی حالات تنگ ہی رہتے ہیں۔ گھر والے سکھر میں رہتے ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بیماری یا پریشانی رہتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی لگتا ہے جیسے کسی کو میری ضرورت نہیں' صرف پیسا اہم ہے۔ ماں باپ ہوں یا بہن بھائی یا بیوی بچے' سب مجھ سے پہلے اپنی ضرورت کی بات کرتے پھر مجھے پوچھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے پوچھنا ہی بھول جاتے ہیں۔ مجھے یہ احساس اَب شدت سے ہونے لگا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اَب ملک سے باہر چلا جاؤں اور کبھی واپس نہ آؤں۔ صرف پیسا بھیجتا رہوں۔ باباجی! میں نے اپنا یہ دُکھ کبھی کسی سے نہیں کہا۔ آپ کا کالم پڑھ کر دل چاہا کہ آپ سے اپنا دُکھ کہوں۔ باباجی! میں بہت چھوٹی عمر سے محنت مشقت کر رہا ہوں اس لیے محنت کرنے سے نہیں گھبراتا مگر چاہتا ہوں کہ کم از کم میرے اپنے تو مجھ سے محبت کریں۔ صرف مجھے ضرورتیں پوری کرنے کی مشین نہ سمجھیں۔ آپ مجھے بتایئے' اگر میری سوچ غلط ہے تو پھر میرا دل و ذہن دونوں صاف ہو جائیں؟

☆ بیٹے تاج! تم مجھے اپنا بڑا جان کر اپنا مسئلہ بتا رہے ہو لہٰذا میرا بھی فرض ہے کہ تمہیں بڑوں کی طرح مشورہ دوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج کل بڑے' بچوں کی طرح اپنا رویہ رکھتے ہیں۔ بیٹے! تمہاری سوچ غلط ہے۔ لوگ اپنی ضرورت انہی سے کہتے ہیں جو اس قابل ہوں کہ اُن کی ضرورت پوری کر سکیں۔ ہر شخص' ہر کسی کے سامنے اپنی ضرورت نہیں رکھتا' صرف جس پر بھروسا کرتا ہے اور محبت رکھتا ہے' اُن سے کہتا ہے۔ جیسے تم نے اپنے دل کی بات مجھ سے کی کیونکہ تمہیں یقین ہے کہ میں تمہیں درست مشورہ دوں گا' اِسی طرح تمہارے گھر والوں کو تم پر یقین ہے۔ اُن کے یقین کو مت توڑو۔ کتنے سارے لوگ تم سے وابستہ ہیں۔ اپنے تمام رشتوں کو سنبھال کر محبت کے ساتھ چلو۔ خوشی خوشی اپنی ذمے داریاں پوری کرو۔ نماز ضرور پڑھا کرو۔ جتنا اللہ کو یاد کرو گے' اتنا ہی دل کو سکون ملے گا۔ رشتوں پر اعتماد بڑھے گا۔ وہم کو دل میں جگہ مت دو۔ خوش رہو۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ بیٹے! وہم پال کر اس کو ضائع مت کرو۔ میری بات کا کیا اثر ہوا' مجھے ضرور بتانا۔

□ گل محمد۔ راولپنڈی

○ باباجی! السلام علیکم! ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں آپ کا کالم پڑھا' جس طرح آپ دُکھی انسانوں کی خدمت کرتے ہیں' اللہ آپ کو اس کا اُجر دے۔ (آمین!) باباجی! میں نے دو سال پہلے کرائے کی دُکان لی' دُکان میں' میں نے بچوں کی چیزیں ٹافی' چاکلیٹ' بسکٹ وغیرہ رکھے ہیں۔ دُکان کا کرایہ 1,500 نکال کر میرے پاس 2,000 روپے بچتے تھے۔ میں نے دُکان میں پی سی او بڑھایا تاکہ میری آمدنی زیادہ ہو۔ پہلے پہلے یہ کام خوب چلا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ رمضان میں عید کارڈز لگائے کہ ان میں کچھ بچت ہو جائے لیکن وہ بھی نہیں چلے۔ باباجی! سردی کے مہینے میں چکن سوپ لگایا' ایک ہفتے تک تو آٹھ کلو سوپ روز نکل جاتا تھا لیکن اَب دو کلو سوپ بھی نہیں نکلتا تھا۔ باباجی! اَب میں دُکان میں مال بڑھانے سے بھی ڈرتا ہوں کہ جتنا بھی مال بڑھا لوں' بچت وہی کرایہ نکال کر 1,500 سے 2,000 روپے تک ہی ہوتی ہے۔ باباجی! میری روزی میں رکاوٹ ہے یا کسی نے بندش کروائی ہے؟ آپ استخارہ کر کے بتائیں۔ باباجی! ہمارا گھر مین صرافہ بازار میں ہے۔ اَب میں سوچتا ہوں کہ میری اِسی گھر میں کھانا بنا دیں تو میں دُکانوں میں

ٹفن دے آؤں لیکن بابا جی! ڈر لگتا ہے کہ اگر سوپ کی طرح ٹفن بھی نہیں چلے تو ہمارا سارا پکا ہوا کھانا بے کار جائے گا۔ بابا جی! میں اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا ہوں۔ میں نے انٹر کا امتحان دیا ہے۔ دُعا کریں میرا رزلٹ اچھا آئے۔ بابا جی! اگر تعویذ کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دیں کہ تعویذ کس طرح منگواؤں؟ بابا جی! وظیفہ زیادہ بڑا نہ ہو، اتنا ہو کہ میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ میری روزی کے دروازے چاروں طرف سے کھل جائیں تاکہ میں اپنے والدین کو حج پر بھیج سکوں۔ (آمین!)

☆ بیٹے گل! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے! تعویذ منگوانے کے لیے تفصیل درکار ہوتی ہے۔ تم مجھے اپنا مکمل نام مع والدہ ارسال کرو۔ جوابی لفافے پر واضح پتا لکھو تاکہ تمہیں تعویذ ارسال کیا جاسکے۔

□ فاطمہ شاہین۔ کراچی

○ بابا جان! السلام علیکم! آپ سے مسلسل رابطے میں رہتی ہوں اور اللہ کا بڑا احسان ہے کہ آپ کی بدولت بہت دفعہ مشکلات سے بھی بچی ہوں۔ بے شک بڑوں کا سایا بہت ضروری ہے۔ بابا جان! آپ تو جانتے ہیں کہ میرے سسرال والے مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔ شوہر بھی انہی کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں کچھ بھی کرلوں، سب کے منہ بنے رہتے ہیں۔ الٹی سیدھی شکایتیں شوہر سے کرتے رہتے ہیں اور وہ مجھ سے بات پوچھے بنا ہفتوں منہ بنائے پھرتے ہیں۔ پھر مجھے بھی غصہ آتا ہے اور میرا سارا غصہ بچوں پر اترتا ہے۔ اُن کو مارنے کے بعد مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ بابا جان! مجھے بتایئے کہ کیا میں کسی کی بیٹی نہیں؟ کیا میری کوئی عزت نہیں؟ جب میں دُکھی ہوں تو کس سے کہوں؟ شوہر بھی بات نہیں سنتے۔ بابا جان! زندہ رہنے کا ہی دل نہیں چاہتا۔ کوئی خوشی، خوشی نہیں لگتی۔ ہر وقت لوگوں کی ناراضگی کا خوف رہتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں، جس کی بدولت میں بھی سکون سے رہ سکوں۔

☆ بیٹی فاطمہ! ایک بات تو ذہن میں بٹھا لو کہ زندگی اللہ کی امانت ہے۔ جب اللہ چاہے گا، اپنی امانت واپس لے لے گا لہٰذا بندوں کو یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ زندگی کو کب اور کیسے ختم کیا جائے؟ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! ہم ہر وقت ہر کسی کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ اچھائی کی امید اللہ سے رکھو۔ بندہ کہاں اس قابل کہ کسی کو کچھ دے سکے؟ جتنا بس میں ہے وہ کرو اور صلہ اللہ سے چاہو۔ نماز کی پابندی رکھو، دُرود شریف بہت پڑھو۔ جس قدر ممکن ہو سورۃ الفاتحہ کا ورد کیا کرو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ مکہ خاتون۔ خیبر پختونخوا

○ بابا جی! ہم اپنی بہنوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ ہم 7 بہنوں میں سے صرف میری شادی ہوئی ہے۔ مجھ سے بڑی بہنیں بھی بیٹھی ہیں اور چھوٹی بھی۔ بابا جی! ہمارے والدین بہت پریشان ہیں کیونکہ ہم پٹھانوں میں بہت کم عمری میں شادی ہوتی ہے لہٰذا ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ ملنے جلنے والے بھی ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کی شادی کیوں نہیں کرتے؟ بابا جی! اب کوئی خوشی سے تو بیٹیوں کو نہیں بٹھاتا؟ ہم نے اکثر آپ کے کالم میں پڑھا ہے کہ آپ شادی کے لیے تعویذ دیتے ہیں۔ ہمیں بھی تعویذ بنا دیں تاکہ یہ مسئلہ حل ہو۔ ہمارے والدین بوڑھے ہیں، وہ اپنی زندگی میں سب بہنوں کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تعویذ منگوانے کا طریقہ بتا دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ خط میں کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کردیں۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بہنوں سے کہو نماز کی پابندی رکھیں اور بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ اَحزاب ضرور پڑھیں۔ والدہ سے کہو روزانہ چڑیوں کو دانہ پانی ضرور دیں۔ حسبِ حیثیت صدقہ خیرات ضرور نکالیں۔ تعویذ کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تعویذ گھر کے پتے پر ارسال کیا جاسکے۔

□ فرحانہ منصور۔ مقام نامعلوم

☆ بیٹی فرحانہ! اللہ تمہاری والدہ کو اولاد کا سکھ نصیب کرے۔ بیٹی! تمہیں براہِ راست بھی خط لکھا ہے مگر تم خط پر پتا نامکمل لکھتی ہو۔ شہر کا نام نہیں ہوگا تو خط کیسے پہنچے گا؟ بہر حال بیٹی! دو بہنیں سورۃ اَحزاب فجر کے بعد پڑھیں اور دو بہنیں بعد عشاء پڑھیں، انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ نسیم۔ کراچی

○ بابا جی! میں آپ کی بہت بدنصیب بیٹی ہوں۔

32 سال کی زندگی میں اتنے دکھ دیکھے ہیں کہ اب زندگی سے خوف آنے لگا ہے۔ اللہ نے مجھے 4 بچے دیئے ہیں۔ مجھے اپنی اولاد سے بہت محبت ہے مگر بابا جی! مالی حالات اتنے خراب ہیں کہ میں اور بچے اکثر بھوکے ہی رہتے ہیں۔ شوہر میرا سال بھر پہلے حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ اس کی زندگی میں تو روکھی سوکھی مل ہی جاتی تھی مگر اب تو حالات بہت خراب ہیں۔ میں ان پڑھ عورت ہوں، رشتے دار بھی میرے جیسے ہی غریب ہیں۔ چار بچے کون پال سکتا ہے؟ بابا جی! میری ماں کہتی تھی، اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے اور یہ اچھے لوگوں کی وجہ سے ہی چل رہی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ سب اچھے لوگ میری ماں کے ساتھ ہی مر گئے۔ اب صرف برے لوگ ہی زندہ ہیں کیونکہ میں جس کے پاس بھی گئی مدد مانگنے، سب نے منع کر دیا۔ میں یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ اللہ کرے، آپ کو میری بات سمجھ آ جائے۔ مجھے کوئی ایسی دعا بتائیں جس کے پڑھنے سے اللہ مجھ سے راضی ہو جائے اور میرے بچے بھی سب کے بچوں کی طرح پیٹ بھر کر روٹی کھا سکیں۔

☆ بیٹی نسیم! اللہ تمہاری مشکلات دور فرمائے۔ بیٹی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اللہ تم سے راضی نہیں؟ اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ بیوہ اور یتیم کا خیال یقیناً وہی لوگ رکھتے ہیں جو جنت میں گھر بنانا چاہتے ہیں۔ یقین رکھو، دنیا میں بہت اچھے لوگ موجود ہیں، اسی لیے یہ دنیا قائم بھی ہے۔ مایوس مت ہو، کڑا وقت سدا نہیں رہتا۔ صبر اور مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 33-33 بار الحمد شریف پڑھو اور دعا کرو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ اپنا مکمل پتا مجھے ارسال کرو۔

□ آصفہ۔ آسٹریلیا

o بابا جی! میں بہت دور سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ قریبی شمارے میں جواب دیں گے۔ میں اور میرے میاں قرضوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں، اس لیے میں جاب نہیں کر سکتی۔ میرے شوہر جو کچھ کماتے ہیں، وہ گھر پر بھی خرچ ہوتا ہے اور پاکستان ماں باپ کو بھی بھیجتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے پاس کچھ نہیں بچتا بلکہ قرضہ ہی بڑھتا جاتا ہے۔ بابا جی! یہاں زندگی بہت مشکل ہے مگر پاکستان میں بیٹھے رشتے دار نہیں سمجھتے۔ مجھے آسان سا وظیفہ دیں تاکہ میں بچوں کے ساتھ آسانی سے گزر کر سکوں۔

☆ بیٹی آصفہ! بے شک پردیس میں زندگی بہت مشکل ہے۔ اپنے ملک میں اپنوں کے درمیان رہنا بہت سارے مسائل حل کر دیتا ہے مگر پھر بھی ہم میں سے بیشتر کو اپنے ملک کی قدر نہیں۔ بیٹی! اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یَاغَنِیُّ یَامُغْنِیُّ کا ورد کرو۔ کوشش کرو کہ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کر دیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ راشدہ مغل۔ جعفر آباد

☆ بیٹی راشدہ! اللہ تمہیں بے شمار خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو اور بہ کثرت یَامُجِیبُ کا ورد کیا کرو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ مدثر پڑھو اور حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ یہی وظیفہ بعد نماز عشاء کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ یاسمین۔ کراچی

☆ بیٹی یاسمین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو ایک گلاس گرم دودھ اور چوتھائی چمچہ گڑ کھا لیا کرو۔ یہ عمل ہر ماہ 7 دن کرو پھر ترک کر دو۔ بکثرت یَاشَافِی کا ورد کیا کرو۔ اللہ مکمل شفا عطا فرمائے گا۔

□ شزا احمد۔ کراچی

o بابا جان! میری عمر 21 سال ہے۔ پچھلے 2 سال سے میرا وزن بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے حالانکہ میں کھانے میں بہت احتیاط کرتی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ اگر وزن اسی طرح بڑھتا رہا تو جوڑوں کے درد میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ وزن کم کرنے کی دوا دیتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے بھی طریقہ کار بتا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ بابا جان! دوسرا مسئلہ میری نند کا ہے۔ اس کے چہرے پر بہت دانے نکل رہے ہیں، اس کے لیے بھی دوا دے دیں۔

☆ بیٹی شزا! مجھے اپنی عمر اور وزن ضرور تحریر کرو۔ دوا میں تیار کر دوں گا۔ اس کے لیے مجھے اپنا پتہ ارسال کرو۔ ادویات کتنے عرصے کے لیے چاہئیں، یہ بھی تحریر

کرو۔ انشاءاللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

□ انجم پرویز۔ چکالہ

☆ بیٹی انجم! نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دَم کرو۔ والدہ سے کہو خوب صدقہ خیرات کیا کریں۔ تم اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ بھی بنا استخارہ کیے مت کرنا۔ خواب پریشان کن ہیں۔ ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر رکھنا۔ سورۃ الناس بکثرت پڑھا کرو۔

□ رضا خان۔ وہاڑی۔ ملتان

○ باباجی! میں ایف۔اے میں پڑھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ بہت تعلیم حاصل کروں مگر جو بھی پڑھتا ہوں' بھول جاتا ہوں۔ ٹیچر کے سوال کا جواب بھی نہیں دے پاتا حالانکہ جواب آتا ہے۔ بہت جلدی گھبرا جاتا ہوں اور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔ لڑکے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ باباجی! اگر یہی حالات رہے تو میں کیسے پڑھ سکوں گا؟ شاید میرا مسئلہ آپ کو بہت اہم نہ لگے مگر میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ خدا کے لیے' میری مدد کریں۔

☆ بیٹے رضا! میں جانتا ہوں کہ تمہارا مسئلہ بہت اہم ہے کیونکہ اس پر تمہارے مستقبل کا دارومدار ہے۔ تم سب سے پہلے تو اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اگر دن میں 4 گھنٹے پڑھتے ہو تو اب 8 گھنٹے پڑھو یعنی دوگنا وقت دو۔ نماز پابندی کے ساتھ ادا کیا کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو۔ نہار منہ 4-3 بادام اچھی طرح چبا کر کھا لیا کرو۔

نصرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتحٌ قَرِیب کا بہت ورد کیا کرو۔

□ عامر خان۔ کراچی

○ باباجی! میں پہلی بار آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ میری عمر 25 سال ہے اور میرا سر تقریباً گنجا ہو چکا ہے۔ پورے سر میں خشکی بھری رہتی ہے حالانکہ میں سرسوں کا تیل بھی لگاتا ہوں۔ بال کم ہونے کی وجہ سے اپنی عمر سے بہت بڑا لگتا ہوں۔ میں نے پڑھا ہے کہ آپ بالوں کی دوا دیتے ہیں۔ پلیز' مجھے جلدی سے دوا بھیجیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو سکے۔

☆ بیٹے عامر! خط میں اپنا پتہ ضرور لکھا کرو۔ میں دوا کے ساتھ طریقہ استعمال بھی ارسال کروں گا۔ مگر دوا آفس سے دستی ہی حاصل کرنا ہوگی۔

□ فرخندہ۔ کراچی

☆ بیٹی فرخندہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ خصوصاً نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ زیب۔ ملتان

☆ بیٹی زیب! تمہارے دونوں خط مجھے ملے مگر پھٹے ہوئے۔ میں نے دونوں خطوط کے جواب بھی دیے مگر مجھے محسوس ہوا کہ تمہارا پتا بھی مکمل تحریر نہیں ہوتا۔ آیندہ خط لکھو تو مکمل پتا ضرور لکھا کرو۔ شہر کا نام واضح لکھو۔ مکان نمبر اور گلی نمبر بھی صاف لکھا کرو۔

□ محسن۔ میانوالی

○ باباجان! میری بیوی نے آپ سے میری نوکری کے لیے تعویذ لیا تھا۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ 3 سال بعد مجھے اپنی پسندیدہ جگہ پر نوکری مل گئی۔ فی الحال تنخواہ کم ہے مگر میں مطمئن ہوں۔ یہاں ترقی کے بہت مواقع ہیں۔ باباجان! میرا ایک اور مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ میری کچھ زمین ادھر ڈی۔جی۔خان میں ہے جو میں بیچنا چاہتا ہوں مگر مناسب قیمت نہیں لگتی۔ کوئی وظیفہ عنایت کیجیے جس کی برکت سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ میرے رشتے کے چچا یہ زمین مارکیٹ ویلیو سے کچھ کم پر خریدنا چاہتے ہیں مگر وہ یہ رقم دو اقساط میں ادا کریں گے۔ اب آپ مشورہ دیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سودے بازی کا ہمارے آپس کے تعلقات پر برا اثر پڑے۔ آپ کے جواب کا منتظر۔

☆ بیٹے محسن! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں ہمیشہ یہ بات سمجھاتا ہوں کہ جو لوگ اللہ سے پورے یقین کے ساتھ مدد مانگتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم پر اپنا کرم فرمایا۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد 99 بار پڑھو اور سورۃ لیسین کی آیت نمبر 7 اوّل و آخر دُرود شریف 9-9 بار پھر حاجت بیان کرو۔ یہی عمل بعد نمازِ عشاء بھی کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بس خیال رہے' حاجت پوری ہوتے ہی حسبِ استطاعت رقم اللہ کی راہ میں دو گے۔

□ حاجرہ ظہور۔ لودھراں

○ باباجی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ

خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی! میری عمر 18 سال ہے۔ میں میانوالی سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو چاہتی ہوں' وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی اور کو چاہتا ہے اور میں اس کی چاہت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اس لڑکے پہ اس کی چاچی نے کافی جادو تعویذ وغیرہ کیے ہیں اور وہ اسی کی باتوں پر عمل کرتا ہے۔ بابا جی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو میں چاہوں تو میری شادی اس کے ساتھ ہو جائے۔ یہ وظیفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ کر سکوں گی۔ بابا جی! میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتی رہوں گی۔ بابا جی! میرا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میرے ابو بہت سخت ہیں' وہ ذرا ذرا سی بات پہ ہماری بے عزتی کر دیتے ہیں۔ بابا جی! مجھ کو ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ ہم سے پیار کریں اور انہیں کوئی اچھی سی نوکری مل جائے۔ میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔

☆بیٹی حاجرہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بہ کثرت پہلے کلمے کا ورد کرو اور سورۃ البقرۃ کی ابتدائی دو آیات ہر نماز کے بعد 7 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ رزق میں برکت کے لیے یَاغَنِیُّ یَا مُغْنِیُّ کا بہت ورد کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ سلیمہ۔ مرید کے

○ بابا جی! میں بہت مصیبت میں ہوں۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ بابا جی! میں پسند کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میرے گھر میں تمام لوگ اس رشتے پر تیار ہیں' بس ایک بڑا بھائی ہے جو کہتا ہے کہ تمہارا رشتہ خاندان سے باہر نہیں کرنا۔ بابا جی! ہم نے استخارہ بھی کروایا تھا' وہ بھی بہت اچھا نکلا ہے۔ لڑکے کے گھر والے بھی اس رشتے پر تیار ہیں۔ وہ تو اس سلسلے میں ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں' لیکن بڑا بھائی مان نہیں رہا۔ بابا جی! آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میرا بھائی فوراً مان جائے۔ بابا جی! میں ڈاک کے ذریعے جواب نہیں منگوا سکتی۔ آپ رسالے میں میرے مسئلے کا جواب دیں۔ یہ کام فوراً ہونا چاہیے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ بھائی میرا رشتہ کہیں اور نہ کر دیں۔ میری شادی کی عمر بھی نکل رہی ہے۔ بابا جی! میری مدد کریں' میں کہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس ماہ میرے مسئلے کو شائع کر دیں۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔ یہ خط آپ سلیمہ۔ مرید کے کے نام سے شائع کرنا۔ بابا جی! میں بڑی امید لے کر حاضر ہوئی ہوں' میرا مسئلہ ضرور حل کروا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے وظیفہ ضرور بتا دیں۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ میں کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤں' سب کچھ ٹھیک طریقے سے' بڑوں کی رضامندی سے ہو۔ اللہ آپ کو اس کا نیک اجر دے۔ (آمین!)

☆بیٹی سلیمہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 14 دن ہے۔

□ عروبہ۔ کشمیر

☆بیٹی عروبہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ کچھ معاملات بڑوں کے طے کرنے کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چاہتے ہوئے بھی اُس میں نہیں بول سکتے۔ تم اللہ سے اچھے حالات کی دُعا کرتی رہو' وہ ضرور سنے گا۔ والدہ سے کہو' اپنے تمام بچوں پر چاروں قل اور الحمد شریف پڑھ کر ضرور دَم کیا کریں۔ اپنی بھاوج سے کہو' بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ انعام ضرور پڑھیں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ انور حسین۔ فیصل آباد

○ بابا جی! السلام علیکم! ہم دُعا گو ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت سے رکھے اور آپ کی عمر دراز کرے۔ (آمین!) اور آپ یونہی درد کے ماروں کا علاج کرتے رہیں۔ بابا جی! میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا' مگر آپ نے جواب نہیں دیا جبکہ خط کے ساتھ ہدیہ بھی بھیجا تھا۔ بابا جی! اس خط کا جواب ضرور دیجیے گا' آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ بابا جی! میرے دو مسئلے ہیں' ایک میرا اور ایک میری بہن کا۔ بہن کا مسئلہ یہ ہے کہ اُس کی شادی پھوپی کے لڑکے سے ہوئی ہے۔ شادی کو 9 سال ہو گئے مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی' جس کی وجہ سے اُس کا خاوند اور ساس لڑتے ہیں۔ بابا جی! میری والدہ والد وفات پا گئے ہیں جس وجہ سے انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ بابا جی! بہن کو کئی ڈاکٹر وغیرہ کو دکھایا مگر اُس میں کوئی خامی نہیں اور نہ ہی خاوند میں خرابی ہے۔ بابا جی! ایک مولوی نے اس مسئلے کو بہن پر ہندو لڑکی کا سایہ بتایا ہے مگر وہ

مولوی میرپور خاص میں رہتا ہے۔ وہاں اُس کا خاوند نہیں جاتا۔ بابا جی! آپ میری بہن کا کوئی علاج کردیں' وہ غم کے مارے کانٹا ہوگئی ہے۔ بابا جی! میری بہن پانچ وقت کی نمازی ہے اور قرآن پاک پڑھتی ہے، پھر اللہ نے اُسے کن آفتوں میں ڈال رکھا ہے؟ بابا جی! میرے چاچو کے ساتھ بھی یہ مسئلہ تھا' اُن کے بھی بارہ سال تک بچے نہیں ہوئے تو انہوں نے 3 سال تک عبداللہ شاہ اَصحابیؒ کے دربار پر حاضری دی پھر اُن کی اولاد ہوئی۔ بابا جی! برائے کرم میری بہن کا علاج کردیں' میں آپ کو مرتے دَم تک دُعائیں دوں گا۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے فیصل آباد آئے ہوئے 5 سال ہوگئے مگر روزگار کے حوالے سے کوئی خاص کام نہ کرسکا۔ جو کماتا ہوں' بیماری کی نذر ہوجاتا ہے۔ کبھی سینے میں' کبھی گردے میں' کبھی پیروں میں تو کبھی سارے بدن میں درد ہوتا ہے۔ رات کو سردی سے بخار چڑھتا ہے' کبھی ڈراؤنے خواب اور کبھی حقیقت میں کچھ چیزیں نظر آتی ہیں۔ اگر میں نماز پڑھنے لگتا ہوں تو سر میں درد اور سینے پر دباؤ سا رہتا ہے۔

بابا جی! میں اندرونِ سندھ کا رہنے والا ہوں' جہاں ہم رہتے تھے' وہاں پہلے ہندوؤں کا مرگھٹ تھا۔ یہ ہم نے لوگوں سے سنا ہے۔ بابا جی! کوئی ایسا تعویذ دیں جو یہ سایہ دور ہوجائے۔ بابا جی! مجھے اور بہن کو کیرے کی بیماری ہے۔ مجھے تو زیادہ یہ سینے پر گرتا ہے۔ بابا جی! سنا ہے' جس کے اوپر سائے کا اثر ہوتا ہے' انہیں سینے' گردے' بلغم' کیرے وغیرہ کی بیماری ہوجاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ بابا جی! ہمیں بیماری کی دوا اور ایسے تعویذ بنا دیں جس سے یہ آفت دور ہوجائے۔ بابا جی! میرے کاروبار کا بھی کچھ کریں جو میں خود اپنا کام کرلوں۔

☆ بیٹے انور! اپنی بہن سے کہو' نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ انبیاء پڑھے اور دُعا کرے۔ بیٹے! تم الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر دن میں 3 سے 4 بار اپنے اوپر ضرور دَم کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دُودھ بسم اللہ پڑھ کر ضرور پیو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ ابھی فی الحال تعویذ کی ضرورت نہیں۔

☆☆......☆☆



خود غرض

نئے گھر میں قدم رکھتے ہوئے
تمہارے تو سارے خواب پورے ہو گئے
مگر خواب ٹوٹے بھی تو ٹوٹے صرف
میرے بوڑھے والدین کے
جو مجھ سے اپنی خدمت کی
آس لگائے بیٹھے تھے
تم نے کتنی آسانی سے
مجھ کو ان سے چھین کر
اُن کے سارے خواب توڑے
محض اپنے ایک سکون کی خاطر.....!!

شاعرہ: زیب ملک۔ گھوٹکی

باعزت بری

جب کبھی محبت نبھاتے نبھاتے
تھک جاؤ.....
تو چپکے سے ہمیں بتا دینا.......
ہم محبت کی عدالت میں ہر الزام
خود پہ لے لیں گے
اور تمہیں.......
باعزت بری کر دیں گے

شاعرہ: ثانیہ ثانی۔ سیالکوٹ

غزل

فریہ بے مثال ہے یہ دل
تیرے غم سے نہال ہے یہ دل
میرے محبوب کا ٹھکانہ ہے
شہر حسن و جمال ہے یہ دل
ٹوٹ جائے گا بے رخی سے تری
زندگی کا سوال ہے یہ دل
بات رو کر منا یہ لیتا ہے
گویا بچوں کی مثال ہے یہ دل
اپنی کوئی خبر نہیں لیکن
تیرا خیال رکھتا ہے یہ دل
ظلم سہتا ہے دوسروں کے لیے
مہرباں خوش حال ہے یہ دل
زخم کھا کر بھی مسکراتا ہے
آپ اپنی مثال ہے یہ دل

شاعر: حکیم خان حکیم۔ ضلع اٹک

نظم

اگرچہ میں آندھیوں کی زد پہ ہوں
مگر زندگی کی تلاش میں
ٹوٹے پتوں کی مانند
لڑھک جاؤں گا میں
اور جب بھی تم مجھے
بھولنے کا قصد کرو گے
تبھی سینے میں دل کی طرح
دھڑک جاؤں گا میں
یہ حیات کے سبھی سلسلے
تیری نظر کرم کے دم سے ہیں
وقت پڑا تو جان سے
گزر جاؤں گا میں
اور میرا تیرا تعلق تو

جسم سے روح کی طرح ہے
بچھڑے اگر مجھ سے
اکھڑتی سانسوں کی مانند
بکھر جاؤں گا میں
شاعرہ: مون شاہ۔ سرگودھا

غزل

سنگ سالوں کے سال گزرے ہیں
کر کے عجب کچھ حال گزرے ہیں
ہر سال میں ہے کوئی بات نئی
قائم کر کے ایک مثال گزرے ہیں
سمیٹ لی زندگی میری
چل کے ایسی چال گزرے ہیں
یادیں بہت سی دے کر مجھ کو
خود بے خیال گزرے ہیں
بہت کچھ ان سے سیکھا میں نے
کر کے آئینے کا کمال گزرے ہیں
خوشیوں کے بس خواب کھائے
حقیقت میں بے حال گزرے ہیں
سکھ میرے اپنے ساتھ لے گئے
غم کا بچھا کے جال گزرے ہیں
شاعرہ: ارم خان۔ ڈی جی خان

سنو تم لوٹ آؤ نا!

یہ سردیوں کی سرد ہواؤں کے جھونکے
مجھے شدت سے وہ پل یاد دلاتے ہیں
وہ باتیں جن سے مہک سے اٹھتی تھی
وہ مہک مری زندگی میں لوٹا کر مجھے رلاتے ہیں
نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے میرے ساتھ
کہ لوگ دو قدم تو ساتھ چلتے ہیں
مگر پھر......!!!
بیچ راہوں میں تنہا مسافر کی طرح چھوڑ جاتے ہیں
سنو ایک بات کہتا ہوں تم سے
وہ باتیں مجھے بہت یاد آتی ہیں
یہ تنہائی بھی مجھے بہت رلاتی ہے
میں آج بھی تمہیں بہت چاہتا ہوں
ہر وقت تمہارا ہی انتظار کرتا ہوں
سنو......!!!!!
تم لوٹ آؤ نا میری جاناں تم لوٹ آؤ نا!!!
شاعر: شہزاد علی۔ گلستان جوہر کراچی

بیٹی

بیٹی بھی ہر جا اک رونق سی ہوتی ہے
یہ ہے دستور دکانچ جیسی ہوتی ہے
بہت نازک اور حساس ہوتی ہے
جو ہنستی ہے تو آنسو نکل آتے ہیں گالوں پر
جو غمگین ہو تو یہ چپ چاپ روتی ہے
ہوتی ہے ماں کی سہیلی اور باپ کی لاڈلی
یہ اللہ کا دیا ہوا ایک انمول موتی ہے
نہ ہو گھر میں تو سناٹا سا لگے ہر سو!!
اسی کے دم سے نیا کا جدا کرنا ہی پڑتا ہے
گھر سے دور رہ کر بھی ہمارے دل میں بستی ہے۔
شاعرہ: شائستہ جمال۔ شاہ فیصل کالونی کراچی

غزل

ہر قدم پر امتحاں لیتی ہے زندگی
اک نیا دکھ اک نیا درد دیتی ہے زندگی
مگر کچھ لوگ ایسے ہیں زمانے میں
جن سے شروع اور انہیں پر ختم ہوتی ہے زندگی
لیکن پھر بھی ہمیشہ یہی ڈر رہتا ہے
زباں پہ اک الفاظ رہتا ہے
اگر محبت موت سے ہو جائے
تو میری اک بات یاد رکھ میری جاناں
زندگی ختم نہیں ہوتی کسی کے دھوکہ دینے سے
زمانے بھر کی نظروں سے تو نے مجھے جو دیکھا ہے
تو یوں تو بھول نا جانا میری اس راز محبت کو
شاعر: ہمیر سیال۔ بھٹائی آباد کراچی

نقد ہنر

گہرے پانی میں شام اتر آئی ہے
بنجر موسم میں تاریکی بڑھ گئی ہے
ٹوٹی ہوئی دہلیز......
دکھ کی چادر پہن کر......
لمبی مسافت چل کر......
سو گئی ہے۔

شاعر: شفق شگی۔ سیالکوٹ

غزل

نہ سوچا تھا ان کو بلانے سے پہلے
دُکھائے گا دل وہ ہنسانے سے پہلے
اگر دُکھ اٹھانا ہے تقدیر اپنی
سکوں کیوں نہ ہو رنج اٹھانے سے پہلے
مقدر پہ اپنے یہ آنسو بہاتے
اگر سوچتے دل لگانے سے پہلے
کہو زلزلوں سے کریں نہ تباہی
مٹا دو مجھے تم زمانے سے پہلے
پشیمان ہوتا نہیں آدمی وہ
سنبھل جائے جو چوٹ کھانے سے پہلے
شفیق اپنے دل کو نہ بہلاؤ ایسے
نہ آئے گا اب وہ منانے سے پہلے

شاعر: محمد شفیق اعوان۔ شمس آباد اٹک

غزل

ہم خود پہ روا کیسا ستم رکھے ہوئے ہیں
ٹوٹی ہوئی کشتی میں قدم رکھے ہوئے ہیں
بپھری ہوئی موجوں کا کوئی خوف نہیں اب
شانے پہ محبت کا علم رکھے ہوئے ہیں
تم ساتھ نہ دے پاؤ گے یہ ہم کو خبر ہے
ہم پھر بھی وفاؤں کا بھرم رکھے ہوئے ہیں
جو لوگ بھی ملتے ہیں کسی لب پہ سجائے
سینے میں کئی رنج والم رکھے ہوئے ہیں
آئے گا کبھی تو ہمیں کہنے کا سلیقہ
اس عزم سے ہاتھوں میں قلم رکھے ہوئے ہیں
تسنیم کو معلوم ہے دنیا کا رویہ
یوں مصلحتاً رابطے کم رکھے ہوئے ہیں

شاعر: تسنیم کوثر۔ لاہور

نظم

گر ایسا ممکن ہو جائے
تمہارا اور میرا ملن ہو جائے
چاند ہتھیلی پہ میری آ جائے
اور ستارہ کہاں جائے
میری گفتگو ہو تجھ سے تو
اور بات ادھوری رہ جائے
جاگتی آنکھوں سپنے دیکھوں
سامنے تصویر تمہاری آ جائے
پھر عام ہو ذکر تمہارا
اور مدہوش سارا عالم ہو جائے
بات بے بات روٹھ جاؤ تم
اور تھوڑی سی ان بن ہو جائے
پھر منانے کی باری میری ہو
اور بگڑی بات سنور جائے!

شاعرہ: زرینہ جونیجو۔ بورڑی شریف

غزل

میری معصوم جوانی پہ ذرا ترس کرو
گرتے اشکوں کی روانی پہ ذرا ترس کرو
رات ٹھنڈی ہے ہوا تیز ہے چلتے آؤ
آج کی رات سہانی پہ ذرا ترس کرو
میں نے لکھی جو تیری یاد میں غزلیں نظمیں!
ان کے الفاظ کے معنی پہ ذرا ترس کرو
صرف الفت کے سوا اور کیا مانگا میں نے
میری آشفتہ بیانی پہ ذرا ترس کرو

تم جو کہتے تھے صرف تم ہی ہو میرے صاحب
اپنی اُس بات پرانی پہ ذرا ترس کرو
شاعر: جمالی صاحب

غزل

آنکھوں کا ہر ایک ستارہ گردش میں
آن پہنچا ہے وقت ہمارا گردش میں
گردش میں حالات ہمارے رہتے ہیں
میں بھی تو ہوں وقت کا دھارا گردش میں
دریاؤں کا پانی موج میں بہتا ہے
دریاؤں کا دور کنارا گردش میں
رات اچانک دور افق پر دیکھا تھا
روشن روشن چاند ستارہ گردش میں
اس نے مجھ سے پوچھ لیا ہے چپکے سے
لگتا ہے اب عشق تمہارا گردش میں
فری کالی رات سے ڈرتی رہتی ہوں
کیوں ہوتا ہے حال ہمارا گردش میں
شاعرہ: فریدہ فری۔ لاہور

ہجر

سنو
نہ اتنا سوچتے ہوتے
نہ اتنا یاد کرتے ہوتے
میرے بن ہر غم کی ڈھلتی شام میں
اپنے گیسوؤں کے سائے میں
اپنی آنکھوں کے سارے سنور چھپا لینا
دسمبر کی سرد بھیگی راتوں میں
میرے خیالوں میں میری باتوں میں
وصال کا ایک خیالی نقش بنا لینا
سفیر سارے انتظار میں رکھنا
نہ رت بتی کا بے قرار رکھنا
اک خواب سنور جانے کا پھر
اسے پلکوں پہ سجا لینا
تم سے جھونکے جب بھی گزریں گے

ہولے ہولے روگ اتریں گے
اگرچہ حوصلے ٹوٹ جانے سے
سو گلے مجھ کو پھر لگا لینا
شاعر: احمد فراز احمد تحصیل ہری پور ہزارہ

غزل

بہت یاد آتے ہو
ذرا ملنے چلے آؤ
مجھے تم سے کچھ کہنا ہے
زیادہ وقت نہیں لونگا
ذرا سی بات کرنی ہے
نا دکھ اپنے سنانے ہیں
نا کوئی فریاد کرنی ہے
نا یہ معلوم کرنا ہے
اب حالات کیسے ہیں
تمہارے ہمسفر تھے جو
تمہارے ساتھ کیسے ہیں
نہ یہ معلوم کرنا ہے
تیرے دن رات کیسے ہیں
مجھے بس اتنا کہنا ہے
مجھے تم یاد آتی ہو
بہت تم یاد آتی ہو
قسم سے یاد آتی ہو
شاعر: مقصود احمد بلوچ۔ میاں چنوں

دسمبر

کس قدر یہ دسمبر سرد ہے
اور تری یاد کا سمندر ہے
جتنی تنہائی ہے میرے باہر
اتنی تنہائی میرے اندر ہے
موم ہوتا نہیں کسی صورت
دل تمہارا نہیں ہے پتھر ہے
دشمنوں سے نہیں کوئی خطرہ
ہاتھ میں دوستوں کے خنجر ہے
اور کس سے گلہ کریں ریحان
جس کو چاہا وہی ستمگر ہے
شاعر: ریحان آفاق۔ حیدرآباد

فیضِ عشق



امجد جاوید



عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الخاص کہانی کا چھٹا حصہ

ایسی مغرور عورت کو میں اپنی عزت بناؤں، میرا ضمیر گوارہ ہی نہیں کرتا۔ ہمارے پاس زمین جائیداد کی کون سی کمی ہے۔ آپ میری بات مانیں۔ اسے اس کی جائیداد سے حصہ دے کر حویلی سے چلتا کریں۔ میرا تھوڑا سا وقت رہتا ہے۔ میں یہاں سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آ جاؤں گا۔ پھر میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔"

"تم مجھے مایوس کر رہے ہو بیٹا۔" پیر سائیں نے حتمی انداز میں کہا۔

"نہیں بابا سائیں، میں مایوس نہیں کر رہا ہوں۔ آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں۔ کیونکہ آپ ایک بہت بڑی غلطی کر چکے ہیں۔ شعیب کے ساتھ فرح کی شادی۔۔۔ وہ لوگ جو کبھی بھی جائیداد کے وارث نہیں بن سکتے تھے۔ وہ بھی زندہ ہو گئے ہیں۔ آپ کہاں کہاں کس کو قابو میں کریں گے۔ کیا اب آپ فرح کا حق اسے نہیں دیں گے۔ نہیں دیں گے تو وہ لے لے گی۔" ظہیر شاہ نے حقیقت بتاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو بعد کی بات ہے۔۔۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ حویلی ہی میں آ کر رہنا شروع کر دیں تو زیادہ اچھی بات ہے۔ نادیہ والا کانٹا نکلے تو شعیب ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ فرح اپنی ازدواجی زندگی میں بہت خوش ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ وہ بہت جلد میری راہ پر آ جائے گا۔ تم یہ سر دردی چھوڑو اور فوراً آ جاؤ۔ نادیہ کا زہر نکالنا بہت ضروری ہے۔" پیر سائیں نے اسے تحمل کے ساتھ پھر سمجھایا۔

"میں آپ کو کیسے سمجھاؤں بابا سائیں۔! میں اس عورت سے نفرت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کیا جائے۔ میری طرف سے اسے آج قتل کروا دیں۔ جب تک وہ حویلی میں ہے، میں نہیں آؤں گا۔۔ اگر آپ مجھے اپنی جائیداد سے عاق بھی کر دیں گے تو مجھے منظور ہے۔ اسے دفعان کریں تو میں آ جاتا ہوں۔" اس نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" پیر سائیں نے غصے میں پوچھا۔

"جی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ آپ مجھے اگر قبول نہیں کریں گے تو میں یہاں اپنی باقی زندگی گذار لوں گا۔ یہ میری ضد سمجھ لیں یا میری انا۔۔۔ میں اسے حویلی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لیے میں نے اس رات حویلی کو چھوڑا تھا۔ باقی جو آپ فیصلہ کریں۔۔۔"

"اب تو کوئی فیصلہ نہیں رہ گیا۔ تم نے حکم عدولی کر کے اچھا نہیں کیا۔" اس نے آزردگی سے کہا۔



"میں مجبور ہوں بابا سائیں۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں لیکن اپنی ہتک نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ میں حویلی میں ہوں اور اگلے دن میری اس سے شادی ہونے والی ہے۔ صرف مجھے ذلیل کرنے کی خاطر وہ حویلی سے بھاگی۔۔ میں نے اگر بھاگی ہوئی عورت کے ساتھ شادی کی ہے تو صرف آپ کی ضد کی خاطر۔۔۔ ورنہ۔۔۔ میں نے انکار کردیا تھا۔۔ لیکن میں نے سوچا، میں نے کون سا یہاں رہنا ہے۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔۔ ورنہ میں اسے طلاق بھجوا دوں گا۔ پھر میرا اور اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔"

"ٹھیک ہے تم جیسا چاہو۔۔ آؤ یا نہ آؤ۔۔ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" پیر سائیں نے روہانسے انداز میں کہا اور فون بند کردیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ظہیر شاہ اس طرح جواب دے گا۔ مایوسی اس کے اردگرد طواف کرنے لگی تھی۔ اسے ظہیر شاہ ہی سے امید تھی۔ وہ ہی نہیں رہی۔ اب اسے کچھ اور ہی سوچنا تھا۔ لیکن اب اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔

نادیہ کا وجود اس کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔ وہ جس قدر اس کے بارے میں سوچتا، اس قدر اسے اپنی راہیں مسدود دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرتا، اسی میں ناکام ہو جاتا۔ ایک کے بعد ایک فیصلہ اس کی نگاہوں میں گھومتا چلا گیا۔ نادیہ کے معاملے میں اس کی ضد پوری نہیں ہو پائی تھی۔ ورنہ اس نے جو بھی ارادہ کیا تھا، جو بھی فیصلہ اس نے کیا وہ پورا ہوتا چلا گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ظہیر شاہ اسے جواب دے گا۔ اور اس قدر نفرت انگیز انداز میں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آخر اسی کے معاملے میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس کے اندر کے ضدی انسان پر ایسی کاری ضرب تھی جس سے وہ حواس باختہ ہو گیا۔ وہ بجائے یہ سوچنے کے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اسے اپنی ضد سے ہٹ جانا چاہیے۔ وہ ان پہلوؤں پر غور کرنے لگا کہ اس سارے معاملے کو اپنے حق میں کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس کے پاس آخری آپشن کے طور پر ظہیر شاہ ہی کا مہرہ تھا۔ جسے چلتے ہوئے وہ نادیہ پر قابو پاسکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی سوچوں کے برعکس وہ ہوا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ شرط اسے بہت خوف زدہ کردینے والی تھی کہ جب تک نادیہ حویلی میں رہے گی، تب تک وہ حویلی میں نہیں آئے گا۔ اگر ایسا ہی ہو گیا تو پھر حالات اس کی دسترس میں نہیں رہیں گے۔ اور نہ ہی کھیل اس کے قابو میں آئے گا۔ سب کچھ بگڑ جائے گا۔ وہ ہی تو ایک سونے کی چڑیا تھی جیسے اس نے پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔ وہ تمام تر جائیداد میں سے آدھے کی اکیلی وارث تھی۔ اس پر دباؤ کی صورت میں زبیدہ سامنے آگئی، بلاشبہ اب وہ بھی وارث ہوگی۔ وہ شعیب کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔ مگر کیا تو بہت ٹوٹ پھوٹ ہو گی، تمام تر جائیداد کا اکیلا مالک ہونے کا جو خواب اس نے دیکھا تھا، وہ پورا نہیں ہو پا رہا تھا۔ کیا ہو بچی کھچی جائیداد پر ہی اکتفا کرے۔۔ یا پھر اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کچھ مزید سوچے، یہ وہ نکتہ تھا جس پر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ نادیہ کو حویلی سے اگر چلے جانے کا بھی کہہ دیا جائے تو وہاں کہاں جائے گی۔ یہ اچھا ہوتا کہ وہ شعیب کے ساتھ بیاہ دی جاتی اور وہ اپنی شرائط منوا لیتا۔ مگر وہ موقعہ بھی تو ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ یہ فائدہ تو ہوا کہ وہ شعیب سے فرح کو بیاہ کر اب وہ اسے اپنے ساتھ شامل کرسکتا تھا۔ اب اسے یہی امید کی کرن دکھائی دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

زندگی اس قدر خوبصورت بھی ہو سکتی ہے، اس کا احساس اسے پہلے کبھی نہ تھا۔ وہ جو مایوسی کے حصار میں بند ہو کر اپنی ہی ذات میں قید ہو گئی تھی، حویلی کی چاردیواری سے نکلی تو دنیا کے ہجوم میں آگئی۔ فرح کے لیے ہر منظر ہی نیا تھا۔ اتنی تعداد میں انسان اس نے شاید زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ باہر کی دنیا اس قدر پرہجوم اور پرشور، کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا کہ جیسے وہ خود ان مناظر میں تحلیل ہو گئی ہے۔ پرشور، پرہجوم اور رنگین دنیا کے ساتھ ایک محبت کرنے والا شوہر اس کے ساتھ تھا۔ اُسے لگا جیسے حویلی کی چاردیواری کے باہر جنت ہے۔ شمالی علاقوں کی سیر کے بعد جب وہ لاہور پہنچے تو اس کے انگ انگ کی تھکن خوشی میں بدل چکی تھی۔ وہ ایک ایک منظر کو اپنے ساتھ سمیٹ کر لے آئی تھی۔ دن کے

اجالے میں پہاڑوں کے درمیان سیر کرتے گزر جاتا۔ بھوک لگتی تو قریبی ہوٹل میں گھس جاتے، رات آتی تو اپنے ساتھ زندگی حسین لمحات لے کر آتی۔ جہاں دل چاہتا پڑاؤ کرتے اور پھر آگے نکل جاتے۔ اس طرح دس دن گھر سے باہر رہنے کے بعد وہ لوٹی تو اپنے ساتھ ڈھیروں یادیں لے کر آئی تھی۔ وہ زندگی کے لمحے لمحے سے خوشیاں کشید کر لینا چاہتی تھی جو اس نے کیں۔ ایک دن اور ایک رات تھکن اتارتے گزر گیا۔ اس صبح جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو کچن میں جا گھسی جہاں زبیدہ پہلے ہی چائے بنا رہی تھی۔

”پھوپھو۔ اگر آپ بھی ہمارے ساتھ ہوتی نا۔ تو مزہ آ جاتا۔“ اس نے یادوں کا لطف لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ پھر تم دونوں کو ہر دم میرا خیال رہتا۔ اب اگر زندگی رہی تو اگلے سال میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ کیونکہ تب تم دونوں کو میری بہت ضرورت ہوگی۔“ زبیدہ نے پیار سے مسکراتے ہوئے پیار سے کہا۔

”میں سمجھی نہیں، ضرورت۔۔۔“ فرح نے کہنا چاہا، پھر ایک دم اسے سمجھ میں آیا تو شرما گئی۔

”تم نے تو مجھے نہیں بتایا لیکن میں سمجھ گئی ہوں۔“ زبیدہ نے اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے پر دیکھ کر کہا۔ تب وہ بولی۔

”میں نے چھپایا نہیں، بلکہ شعیب کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر کے پاس چلیں گے، تصدیق ہونے پر امی کو بتائیں گے، تاکہ کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہ رہے۔“ وہ پروقار انداز میں بولی۔

”اچھا تو یہ بات تھی۔۔ کب جانا ہے ڈاکٹر کے پاس۔۔۔؟“ زبیدہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آج کسی وقت۔۔۔“ وہ بولی تو زبیدہ نے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔

”اس کا پتہ نہیں وہ کب جائے، میں تمہیں خود لے کر جاؤں گی۔ بس تم یہ ناشتہ وغیرہ بنا کر جلدی سے تیار ہو جانا۔۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو جاتی ہوں۔“ فرح نے سعادت مندی سے کہا اور کچن میں ہاتھ بٹانے لگی۔ زبیدہ تو چائے کا مگ لے کر باہر جا بیٹھی اور فرح انہونی سوچوں میں کھو گئی۔ اسے خود پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں جیسے مقدس رتبے پر فائز ہونے جا رہی ہے۔

دوپہر ہونے سے کافی پہلے وہ ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر کے کلینک جا پہنچیں۔ اگرچہ وہاں انتظار نہیں تھا مگر پھر بھی ڈاکٹر تک رسائی ہوتے انہیں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اچھی طرح تصدیق کے بعد جب وہ واپس لوٹیں تو ان کے ہمراہ یہ خوشخبری تھی کہ فرح ماں بننے والی ہے۔ زبیدہ نے تو وہیں کلینک ہی میں شعیب کو بتا دیا۔ اور پھر جب وہ گھر پہنچیں تو وہ مٹھائی لیے ان دونوں کا منتظر تھا۔ وہ اپنے رب کی شکرگزار تھی کہ اس نے اسے سب کچھ دے دیا تھا۔ وہ اب جلد از جلد سلامت نگر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ ایک نئی زندگی کا احساس ان کے لیے بہت خوش آئند تھا۔ بکھرا بکھرا سا خاندان ایک لڑی میں پرونے کے لیے بہانہ انہیں مل گیا تھا۔ جذبات میں ایک خواہ مخواہ کی نرمی در آئی تھی۔ اس وقت گہری ہو چکی تھی۔ جب وہ سلامت نگر پہنچ گئے۔

اگلی صبح فرح کا دل بہت مچل رہا تھا کہ وہ حویلی جائے اور یہ خوشخبری انہیں بھی سنا دے۔ اس کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ انہیں فون ہی کر دیتی۔ اسے یہ احساس اچھی طرح ہو گیا تھا کہ شعیب حویلی والوں سے رابطہ رکھنا اور تعلق بڑھانا پسند نہیں کرتا۔ اس کی شدت تبھی سامنے آئی تھی جب وہ یہاں سے نکلنے لگے تھے۔ راستے میں اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ خود حویلی والوں سے رابطہ نہیں کرے گی۔ اور اب جو بھی تعلق ہوگا وہ شعیب کے ذریعے ہی سے ہوگا۔ اب اس کی ترجیح شعیب تھا۔ جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی بتانا تھی تب سے اگر اس نے رابطہ نہیں کیا تھا تو حویلی والوں نے بھی فون نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے شعیب کے ساتھ رابطہ کیا ہو، اگر ایسا ہوا تھا تو اسے نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی یہ بھول گئی تھی کہ اس نے خود حویلی والوں سے رابطہ کرنا ہے۔ اب جبکہ وہ سلامت نگر آ گئی تھی۔ تب نجانے ان فضاؤں میں کچھ ایسا تھا کہ حویلی جانے کو جی مچل گیا۔ مگر اس نے لب پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ ناشتہ وغیرہ کروانے کے بعد جب شعیب کو تیار کروایا تو اس دوران



اس نے اپنی خواہش کا اظہار جھجکتے ہوئے کیا۔
"کیا آپ نے حویلی والوں کو نئے مہمان کے آنے کے بارے میں بتا دیا ہے۔۔"
"نہیں، میں نے تو نہیں بتایا، ممکن ہے امی نے بات کی ہو، ان سے پوچھ لو۔۔" یہ کہہ کر اس نے غور سے فرح کے چہرے پر دیکھا اور بڑی نرمی سے کہا۔ "اگر تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔"
"لیکن آپ کیوں نہیں جاتے؟" نجانے کیوں اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے لفظ پھسل گئے۔ تب پہلی بار شعیب نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ چند لمحے یونہی تکتا رہا، پھر دھیمے لہجے میں انتہائی نرمی سے بولا۔
"فرح یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی میرا حویلی جانے کو دل نہیں کرتا۔ میں چاہنے کے باوجود بھی اپنے آپ کو مطمئن نہیں کر پاتا۔ ایسی جگہ، جہاں جا کر میں بے چینی محسوس کروں۔ تم مجھے وہاں جانے کے لیے کہہ رہی ہو۔"
"جب آپ جائیں گے تو یہ بے چینی بھی دور ہو جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے اچانک وہ چونک گئی اور تشویش زدہ لہجے میں گویا ہوئی۔ "کہیں آپ نادیہ کی وجہ سے تو نہیں۔۔"
"ممکن ہے لاشعوری طور پر ایسی ہی کوئی وجہ ہو۔ مگر میرے ذہن میں تمہارے باپ کا رویہ ہے۔ وہ حاکمیت پسند ہے، اور ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کی حاکمیت اپنے اوپر مسلط کر لوں۔ میں مانتا ہوں کہ میرا اس سے میری ماں کی وجہ سے رشتہ ہے، لیکن یہ رشتہ کبھی بھی نہیں رہا۔ میرے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک میرا دوسرا تعلق اسی سے یہ بنا کہ اس نے ناجائز کام کروانا چاہا۔ اس وجہ سے اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ اور تیسرا تعلق تمہاری وجہ سے بنا، تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا اس نے اس تعلق کو بھی دل سے قبول کیا؟ اگر کیا ہے تو کوئی ایک دلیل دو۔۔" شعیب نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"نہیں میرے پاس کوئی ایسی ایک دلیل نہیں ہے۔" فرح نے صاف گوئی سے کہا۔
"پھر بھی میرا حویلی جانے کا جواز بنتا ہے؟" اس نے اسی دھیمے لہجے میں پوچھا۔
"نہیں بنتا۔" اس نے صاف لہجے میں کہا۔
"دیکھو! میں تمہارے باپ جتنا امیر نہیں ہوں۔ نہ ہی میرا وہ اسٹیٹس ہے جو اس کا ہے۔ میرے پاس مریدین کی قوت بھی نہیں، مگر اس کے پاس ہے، وہ کل میرے خلاف سلامت نگر میں جلوس نکلوا دے اور میرا تبادلہ ہو جائے۔ مجھے کرپٹ اور بے ایمان ثابت کر دے۔۔ میں۔۔۔"
"نہیں وہ ایسا نہیں کریں گے۔۔" فرح تیزی سے بولی۔
"میں جانتا ہوں کہ وہ نہیں کرے گا۔۔ اس وقت تک نہیں جب تک میں کرپٹ نہیں ہو جاتا۔ خیر۔ میں کہنا تم سے یہ چاہ رہا تھا کہ اسٹیٹس کا فرق اس نے رکھا۔ وہ پیر سائیں ہے، جاگیردار ہے، سیاست دان ہے، لیکن ایک بیٹی کا باپ نہیں ہے۔ ورنہ وہ اب تک ایک بار ہی سہی یہاں ضرور آتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"
"نہیں آپ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔" فرح نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔
"اب تم خود بتاؤ۔ جب اس نے وہ فرق رکھا ہوا ہے۔ جس میں تمہاری تضحیک ہو تو کیا مجھے حویلی جانا چاہیے۔ کیا اس تضحیک کو میں قبول کر لوں اور تمہارے باپ کے حضور جا کر گڑگڑاؤں کہ مجھے اپنا داماد دل سے تسلیم کر لیں۔" اس بار اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ جس پر وہ خاموش رہی تب وہ بولا۔ "دیکھو فرح۔ میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے کہ جب میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی ترس جایا کرتا تھا اور ایسا وقت بھی دیکھا ہے، جب میری ضروریات سے اتنا زیادہ مل جایا کرتا تھا کہ کوئی خواہش نہیں رہتی تھی۔ یاد رکھو۔ لالچ اور خواہش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ لالچ بڑھتا ہی چلا جایا کرتا ہے اور خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں۔ میرے خیال میں تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔" آخری لفظ کہتے ہوئے شعیب کے لہجے میں پھر وہی نرمی اور تحمل در آیا تھا۔ فرح کچھ نہیں بولی اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آفس چلا گیا۔

فرح سارا دن شعیب کی باتوں کو سوچتی رہی۔اس دن وہ زبیدہ کے پاس بھی بہت کم بیٹھی۔زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہی۔زبیدہ نے بھی اسے نہیں پوچھا۔اس کے ذہن میں تھا کہ ممکن ہے تھکن ہو۔یا پھر طبیعت ٹھیک نہ ہو۔اس نے خود ملازمین سے کہہ کر دوپہر کا کھانا بنوالیا۔دوپہر سے تھوڑی دیر قبل وہ ہونقوں کی طرح اپنے کمرے سے نکلی اور سیدھی زبیدہ کے پاس آئی۔وہ کافی شرمندہ سی لگ رہی تھی۔

''سوری پھوپھو۔!میری آنکھ لگ گئی تھی۔۔کھانے کو دیر ہوگئی۔۔''

''تم جاؤ،نہاؤ دھو اور تیار ہو جاؤ۔کھانے کی فکر نہ کرو۔وہ بن جائے گا۔''زبیدہ نے پیار سے کہا تو اسے اطمینان ہوگیا۔وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شام کب کی ڈھل گئی تھی۔شعیب گھر آ کر دوبارہ نکل گیا تھا۔پوچھنے پر یہی بتایا تھا کہ کوئی ضروری کام ہے۔پھر انتظار بڑھتا گیا اور وہ اس وقت واپس پلٹا جب رات کافی گہری ہوگئی تھی۔وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔لیکن ڈھلتی شام سے رات گہری ہو جانے تک عجیب قسم کے وسوسوں کا شکار ہوگئی۔اگرچہ شعیب نے اسے بڑے تحمل سے سمجھایا تھا۔لیکن آج ہی اس نے بات کی اور آج ہی اس کے معمولات میں فرق آ گیا۔بلاشبہ اس نے جو گھر میں وقت نہیں گذارا،اسے میرا پوچھنا اچھا نہیں لگا ہوگا۔وہ جس قدر ممکن ہے مجھ سے دور رہ کر اس بات کو بھلانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔کیا میں اپنے ہی ہاتھوں اپنے چمن کو آگ لگا رہی ہوں۔کیا یہ میرا عمل درست نہیں تھا۔ایسا تو تب ہوتا ہے کہ جب وہ کسی سے شدید قسم کی نفرت کر رہا ہو۔کیا اسے حویلی والوں سے نفرت ہو چکی ہے۔کیا وہ محض نادیہ کی وجہ سے نہیں جا رہا یا بابا سائیں کی وجہ سے۔۔اس نے جھوٹ بولا یا پھر سچ کیا۔وہ ان سوچوں کا اظہار زبیدہ پھوپھو سے بھی نہیں کر پا رہی تھی۔اس کے لیے نفرت ایک معمولی سی بات تھی لیکن کیا محبت میں بدگمانی کا زہر گھل گیا۔کیا اب شعیب مجھ سے متنفر ہو گیا۔کیا اب اس کا رویہ پہلے جیسا نہیں رہا۔کیا میں اپنی بنتی سنورتی زندگی کو شک اور بدگمانی کی بھینٹ چڑھا دوں گی۔میں نے اگر ضد کی تو کیا وہ مزید مجھ سے دور ہو جائے گا۔ایسے ہی نجانے کتنے سوال اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے اور وہ خوف کے مہیب سناٹوں میں یوں پھیلتی گئی کہ خود کو روکنا بھی چاہا تو نہ کر سکی۔اور جس وقت وہ پلٹ کر گھر میں آیا تو وہ انتہائی خوف زدہ ہو رہی تھی۔وہ ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوا ہے تجھے۔تمہارا رنگ اتنا پیلا کیوں ہو رہا ہے؟''

چاہتے ہوئے بھی وہ جواب نہ دے سکی۔لفظ اس کے منہ ہی سے نہیں نکل پائے تھے۔وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن پوری کوشش کر کے بھی نہ کہہ پائی۔پھر اس سے مزید کچھ ہو نہ سکا تو وہ شعیب کے سینے سے جا لگی۔آنسو تھے کہ ساون بھادوں کی مانند برسنے لگے۔اس نے بڑے پیار سے اسے تھام لیا اور پھر اسے تھپکتے ہوئے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''فرح پلیز۔بتاؤ کیا بات ہے۔امی نے کچھ کہا۔''

''نہ۔۔۔نن۔۔۔نہیں۔۔انہوں نے کچھ نہیں کہا۔''

''تو پھر کیا بات ہے۔۔''اس نے اسے کاندھوں سے پکڑا اور بیڈ پر بٹھالیا۔وہ اس وقت تک خود پر قابو پا چکی تھی۔اس نے دھیرے دھیرے اپنے ذہن میں چلنے والی شک کی آندھیوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔وہ کہتی چلی جا رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ مسکراتا چلا جا رہا تھا۔وہ جب کہہ چکی تو شعیب نے اس کے سر پر ہلکی سی دھپ مارتے ہوئے کہا۔

''اتنی سی بات پر خود کو ہلکان کر رہی ہو۔۔صبح کی بات تو میں اسی وقت ختم کر کے چلا گیا تھا۔وہ تو میرے ذہن میں بھی نہیں۔ہاں بس آج اتفاق ہی تھا جو میں اتنی دیر گھر سے باہر رہا،اب تو کئی دن تک ایسا چلے گا۔اتنی چھٹیاں بھی تو گذار کر آئے ہیں۔۔میں نوکر پیشہ بندہ ہوں۔اس طرح کیا تم روزانہ ہلکان ہوتی رہوگی۔''

''مجھے بس آپ کا اعتماد چاہیے۔۔۔میں۔۔۔اور کچھ نہیں چاہتی۔۔۔''وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اب بتاؤ۔۔تمہیں کیسا اعتماد چاہیے۔اب اس

سے زیادہ تجھے اور اعتماد کیا دوں۔۔ کہ تم اب میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تو فرح کو اس پر ڈھیروں پیار آگیا۔ وہ اُس کے کاندھے سے لگ گئی۔ ''اچھا۔ اب مجھے کپڑے بدلنے دو۔ تم جاؤ اور اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔ پھر دونوں مل کر پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔''

''میں ابھی لے کر آتی ہوں۔'' وہ جلدی سے اٹھ گئی۔

''نہیں یہاں نہیں۔ اوپر چھت پر۔ آج چاندنی بہت زیادہ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر شرٹ بدلنے لگا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کچن کی جانب چل دی۔

☆......☆......☆

حویلی میں بھونچال آ گیا تھا۔ اماں بی سکتے میں تھی۔ زہرہ بی کی خاموشی طویل ہوگئی اور پیر سائیں کی تو جیسے دنیا ہی اندھیر ہوگئی تھی۔ نادیہ نے جب سنا تو ایک لمحے کے لیے اس کے من میں دکھ کی لہر اٹھی اور پھر پہلے کی مانند وہی سکوت اس پر طاری ہوگیا۔ ظہیر شاہ نے نادیہ کے لیے طلاق بھجوادی تھی۔

''یہ تم نے کیا کیا بے وقوف اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار لی۔۔'' پیر سائیں نے فون پر چیختے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اسے الگ کر دیں۔ حویلی سے نکال دیں۔۔ تب میں آؤں گا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''وہ حویلی میں رہتی ہے یا نہیں رہتی۔ مگر اس کا طلاق سے کیا تعلق ہے۔'' اس پر اسے شدید غصہ آ گیا تھا۔

''وہ میری دنیا میں آئی ہی نہیں تھی۔ میرا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو پھر میں اسے باندھ کر کیوں رکھوں۔۔ جب تک وہ میرے نام سے بندھی رہتی، آپ اسے حویلی سے نکال ہی نہیں سکتے تھے۔ اب یہ آپ کا امتحان ہے، آپ نے مجھے اپنے پاس بلانا ہے تو اسے حویلی سے نکالنا ہوگا۔ ورنہ میں نہیں آؤں گا حویلی میں۔'' اس نے انتہائی سخت انداز میں کہا تو پیر سائیں کو ہوش آیا۔ ظہیر شاہ کی بات کو اس نے اہمیت ہی نہیں دی تھی، محض اپنی ضد منوانے کے لیے اسے حکم پر حکم دیتا چلا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ اس کے سامنے آگیا۔

''تو اتنا ہی کمزور ہے کہ ایک عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے سامنے نہیں جھکا سکا۔'' پیر سائیں دھاڑا۔

''میرا اس سے مقابلہ بنتا ہی نہیں ہے تو کیا جیت اور کیا ہار۔۔۔ مجھے اس سے کوئی اعتراض ہی نہیں ہے۔ اور پھر جس کے ساتھ میں نفرت کرتا ہوں۔ میں اسے اپنی زندگی میں نہیں رکھ سکتا۔'' اس نے واقعتاً نفرت انگیز انداز میں کہا۔

''یہ تو نے اچھا نہیں کیا ظہیر شاہ، تمہارے اس فیصلے کا نتیجہ بہت غلط بھی ہو سکتا ہے تمہارے حق میں۔'' پیر سائیں نے اسے احساس دلایا۔

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے عاق بھی کر سکتے ہیں تو کر دیں۔ جب تک وہ حویلی میں ہے، میں وہاں قدم نہیں رکھوں گا۔ میں یہیں رہ جاؤں گا۔'' اس نے تحمل سے کہا۔

''تم صرف اپنے اکلوتے ہونے کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔ مت سمجھنا کہ میری حکم عدولی کرلو گے تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ اب تم چاہو بھی تو حویلی میں نہیں آپاؤ گے۔ یہ میری حتمی فیصلہ ہے۔'' پیر سائیں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ بے جان سا ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ وہی خاص کمرہ جو اُن کے لیے بہت پرسکون ہوا کرتا تھا، اس دن وہی اسے قید خانہ لگ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی بھر کی کمائی وہ لٹا چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے بڑے مان اور اعتماد کے ساتھ جس کے لیے سب کچھ کرنے کی کوشش کی تھی، وہی اُسے یوں دھوکا دے جائے گا۔ یہ تو اس نے سوچا نہیں تھا۔ پہلی بار اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور یہ شکست اس لیے بھی زیادہ دکھ دے رہی تھی وہ اسے اپنے بیٹے ہی کے ہاتھوں ملی تھی۔ جس کا سب کچھ چھین لینا چاہتا تھا۔ وہ اب بھی پورے وقار اور طمطراق کے ساتھ حویلی میں موجود تھی اور جس کے لیے چھین لینا چاہتا تھا، اس پر حویلی کے دروازے اس نے خود ہی بند کر دیے

تھے۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ صیاد اپنے دام میں خود ہی آ گیا تھا۔ اس نے جو چاہا تھا اس کے برعکس ہو گیا تھا۔ اپنوں کے ہاتھوں سے لگا ہوا زخم کاری ہوتا ہے۔ جو بندے کو سلب کر دیتا۔ پھر ایسا وار جس سے بندہ تہی داماں ہو جائے۔ ہار جانے کا دکھ، اکلوتا بیٹا کھو جانے کا دکھ اور پھر سب سے بڑی بات تہی داماں ہونے کا دکھ، اسے سانس نہیں لینے دے رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس سے اچھا تھا کہ نادیہ کو شعیب ہی کے ساتھ بیاہ دیتا، اس کی بیٹی تو بچ جاتی۔ اب وہ بھی اس نے زبیدہ کے ہاتھ میں ذے دی تھی۔ وہ جو چاہے اس سے انتقام لے۔ اب چاہے تو وہ بھی اسے چھوڑ دے۔ کیا ہو گا؟ یہ سوال اس کے لیے سوہان روح بن گیا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ حویلی سے بلاوا آ گیا۔ دیوان نے انتہائی ادب سے کہا۔

''اماں بی حویلی میں یاد کر رہی ہیں۔''

اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کہیں گی۔ اس سے یہی سوال ہو گا کہ ظہیر شاہ نے کیا کیا۔ بیٹے کے عمل کا جواب دہ وہ خود تھا۔ حالانکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور حویلی کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ واضح طور پر اس نے محسوس کیا کہ اس کے وجود میں جان نہیں رہی ہے۔ وہ جو ہر وقت خود کو زندگی سے بھرپور خیال کیا کرتا تھا، بیٹے کے ساتھ ایک فون کال کے بعد خود کو انتہائی ناتواں محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ حویلی کی جانب چل پڑا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہوئے وہ پہلی بار شرمندگی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ کیا منہ دکھائے گا وہ جا کر۔ جس کے لیے اتنا کچھ کیا، اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

اماں بی صوفے پر بیٹھی ہوئیں تھیں۔ پیر سائیں خاموشی سے ان کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی جیسے وہ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہے ہوں۔ آخر اس خاموشی کو اماں بی نے ہی توڑا۔

''یہ بہت ظلم ہوا ناد یہ پر دلاور شاہ۔۔۔''

وہ اماں بی کا لہجہ سن کر چونک گیا۔ اس میں آگ ہی آگ تھی۔ پہلی بار ایسا لہجہ جس میں آگ کے ساتھ تذلیل کر دینے والی انتہا تھی۔ اس نے پوری قوت صرف کرتے ہوئے جواباً کہا۔

''ہاں واقعی، ظلم ہوا۔۔۔''

''یہ ظلم تم نے کیا ہے دلاور شاہ۔۔ اس یتیم بچی کے ساتھ جو تم نے کیا۔ اس کا بدلہ وہ کمزور تو نہیں لے سکتی اس کا بدلہ تو تم سے خدا ہی لے گا۔ لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔۔ بالکل بھی نہیں کروں گی۔۔''

''اماں۔ امیں نے تو ان کی بھلائی ہی چاہی تھی۔ آپ بھی سمجھتی ہیں کہ میری نیت ٹھیک تھی۔'' اس نے صفائی پیش کرنا چاہی تو اماں بی نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

''غلط۔! بالکل غلط کہہ رہے ہو دلاور شاہ۔ تمہاری نیت ہی تو ٹھیک نہیں تھی۔ اس بچی کی جائیداد ہتھیانے کی خاطر تم نے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ کیا انجام ہوا اس کا۔۔۔ تمہارے ہی بیٹے نے طلاق بھیج دی۔ میں پوچھتی ہوں کیا جرم تھا اس بن ماں باپ کی بچی کا۔ آج اگر اس کا باپ زندہ ہوتا۔۔۔ تو میں دیکھتی تیری اور تیرے بیٹے کی جرات کیا ہوتی کہ تم لوگ ایسا کر سکتے۔۔۔''

''میں نے اسے سزا دے دی ہے۔ میں نے اسے حویلی میں داخل ہونے سے روک دیا ہے۔'' پیر سائیں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''تم نے نہیں، اس نے خود حویلی آنے سے انکار کر دیا ہے۔ ابھی اس نے اپنی ماں سے ساری بات کر لی ہے۔ یہ سب تیرے کیئے کا پھل ہے۔ تیری اکلوتی اولاد تجھے چھوڑ گئی۔ ابھی تو تیرے ساتھ پتہ نہیں کیا کچھ ہونا ہے۔ تو دیکھتا جا۔''

''اماں آپ مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔ یہ ان دونوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کا نتیجہ ہے۔'' پیر سائیں چیخ پڑا۔

''اس جھگڑے کی بنیاد کون ہے۔ وہ بچی بے چاری چیختی رہی۔ چلاتی رہی۔ اس نے منع بھی کیا۔ لیکن۔۔۔ لیکن کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ تم نے ضد نہیں کی۔۔ تم نے اس شادی کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ تم نے ہر وہ جائز و ناجائز کوشش نہیں کی جو تم کر سکتے تھے۔۔۔ اب کیا ہوا۔ تیرا ہی لالچ تیرے منہ پر آن پڑا ہے۔'' اماں بی شعلہ جوالہ بن گئی تھیں۔

''اب کیا ہو سکتا ہے اماں۔۔۔ مجھے بتاؤ اس کا حل کیا ہے۔'' پیر سائیں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''حل۔ا میں کیا بتا سکتی ہوں حل۔۔۔ اب تو فیصلہ ہو چکا۔ اب جو کچھ بھی کرے گی، نادیہ ہی کرے گی۔ میری طرف سے تو یہی سزا ہے تمہیں کہ تم فوراً سے پیشتر یہ حویلی خالی کر کے چلے جاؤ۔ میں تمہیں یہاں برداشت نہیں کر سکتی۔ یا پھر میں اپنی پوتی کو لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔'' اماں بی نے شعلہ برساتی ہوئی آواز میں جب ختمی لہجے میں کہا تو وہ چونک گیا۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ عتاب اس پر آجائے گا۔ حویلی چھوڑنے کا مطلب کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کوئی بھی چھوڑتا، وہ خود اپنی بیوی کو لے کر جاتا تو سارے زمانے میں، مریدین میں، سیاست والوں اور جاگیرداروں میں اس کی کیا وقعت رہ جاتی۔ اور اگر اس کی ماں، اماں بی اور بھیجی جواب اس کی بہو بھی تھی۔ وہ اگر حویلی چھوڑ کر چلی جاتی ہیں تو پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک ایسی صورت حال میں پھنس گیا تھا کہ نہ نگلنے بنتی تھی اور نہ اگلتے۔ لمحہ بھر میں جو اس نے چشم تصور میں آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچا تو کانپ کر رہ گیا۔ اب تک کی بنی بنائی ساری عزت خاک میں مل جانے والی تھی۔ وہ جو ایک عقیدت مندی کا تصور اس کے ساتھ جڑ گیا تھا، اب کہاں رہتا۔ یہی وہ وقت تھا جسے سنبھالنا بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنے لہجے میں حد درجہ درد بھرتے ہوئے کہا۔

''اماں بی۔! ظہیر شاہ کی غلطی کی سزا آپ مجھے کیوں دے رہی ہیں۔ میں نے تو کبھی ایسا نہیں چاہا تھا اور نہ ہی چاہ سکتا ہوں۔''

''تم نے اگر اتنی ضد کر کے، اپنی انا کا مسئلہ بنا کے ظہیر کی شادی نادیہ سے کی تھی تو اس کے

ذمہ دار تم ہو۔ وہ بے چاری ایک رات کی سہاگن نہیں اور اسے طلاق یافتہ بنا کر رکھ دیا۔ اس نے کیا جرم کیا تھا تیرا۔ کیا قصور ہے اس بچی کا، کیوں مسلسل اسے ظلم کا شکار کر رہے ہو۔'' اماں بی پھٹ پڑیں۔

''اماں۔ا مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے کیا معافی مانگنا ہے تم نے۔۔۔ اس یتیم سے معافی مانگو جس پر تم نے ظلم کیا۔۔۔ وہ اگر معاف کر دیتی ہے تو کر دے۔۔۔ لیکن اگر اس نے تمہیں معاف نہیں کیا تو میں ہر حال میں اس کے ساتھ کھڑی ہوں۔۔۔ یہ یاد رکھنا۔۔۔ جو میں نے کہا ہے۔۔۔ اب وہی ہونا ہے۔۔۔''

''آپ نادیہ کو بلائیں۔! میں آپ کے سامنے اس سے معافی مانگتا ہوں۔'' پیر سائیں نے انتہائی لجالت سے کہا۔

ایسا کہتے ہوئے اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی نوکرانی کو اشارہ کر دیا کہ وہ نادیہ کو بلا لائے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی۔ ان دونوں میں خاموشی چھا گئی۔ کسی نے ایک لفظ بھی کچھ نہ کہا جیسے کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس لفظ نہ ہوں۔ کتنا ہی وقت یونہی گذر گیا۔ تبھی سفید لباس اور سفید آنچل میں ملبوس نادیہ وہاں آ گئی۔

گہری رات کا سناٹا مزید گہرا ہو گیا تھا۔ آخری دنوں کا چاند ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ نادیہ اندھیرے میں ٹمٹماتے ہوئے برقی قمقموں کو دیکھ رہی تھی۔ حویلی سے چھن کر جانے والی روشنی میں ذرا فاصلے تک منظر سسک رہے تھے۔ اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں اور اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں کہ اندھیرے انہیں نگل نہ جائیں۔ وہ اپنے آپ سے فرار حاصل کر کے دنیا سے بے خود ہو کر سو گئی تھی۔ شاید وہ تنہا ہوتی تو اتنی چبھن نہ ہوتی۔ جتنا اردگرد کی باتوں نے اسے دکھ دیا تھا۔ ظہیر شاہ تو پہلے ہی اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ اب اگر وہ لندن چلا گیا ہے تو اس کی زندگی میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر ایسا کر کے اس نے نادیہ کو کم مائیگی کا احساس ضرور دلا دیا تھا۔ اس نے بڑے مان اور حق سے ظہیر شاہ کے سامنے شرط رکھی تھی۔ اگر اس کے دل میں نادیہ کے لیے ذرا سا پیار یا تھوڑی سی ہمدردی بھی ہوتی نا تو وہ ضرور اس کی بات پر غور کرتا۔ اگر اس کے بس میں نہ ہوتا تو اچھی طرح سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ اس کی انا پر ذرا سی ٹھیس کیا آئی وہ پوری طرح کھل گیا۔ اس کے اندر کا سخت گیر انسان جو پیر سائیں کا جانشین تھا۔ ایک دم سے بول پڑا۔ اس نے اپنا آپ ظاہر کر دیا کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ وہ جتنا بھی تعلیم یافتہ ہو گیا تھا مگر اس کے ضمیر میں وہی حاکمانہ انداز

تھا۔ ضد اس کی گھٹی میں تھی اور اپنی عظمت کو منوانا ان کی فطرت بن گئی تھی۔ انہوں نے روایات کے سہارے تو خود کو بنا سنوار لیا تھا لیکن زندگی کی حقیقت اور فطرت کے تقاضوں کو نہیں اپنایا تھا۔ انہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ جو خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے وہی خون اس کی رگوں میں بھی تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اس کی ذہنی رو شعیب کی جانب ہوگئی تو ایک دم جیسے اس کے پورے وجود میں سناٹا پھیل گیا۔ ویسا ہی مہیب سناٹا جو حویلی کے درو بام ہمیشہ لپٹا رہتا ہے۔ یہی سناٹا اس کی بغاوت کی بنیاد تھا۔ وہ ایک دم سے خوف زدہ ہوگئی۔ تبھی اس کے اندر سے ایک چیختی ہوئی صدا بلند ہوئی۔

''کیوں اب تم کیوں خوف زدہ ہوگئی ہو۔ یہ سناٹے تم نے خود چنے ہیں۔۔۔ اب کیوں ڈرتی ہو؟''

''میں نے۔۔؟ نہیں تو۔۔۔ میں نے کیوں یہ سناٹے چنے تھے؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیوں جھوٹ بولتی ہو۔۔ محبت خود چل کر تیرے در تک آگئی۔۔ لیکن تم نے اس کی قدر نہیں کی۔۔ شعیب تجھے لینے کے لیے حویلی میں آگیا تھا۔۔''

''میں نے کب اسے کہا تھا کہ وہ یوں خاموشی سے سر نیہوڑے ہر حکم مان لے۔۔ وہ لڑتا میرے لیے۔۔ وہ مجھے لے جانے کے لیے ضد کرتا۔۔ وہ پاگل ہو جاتا میرے لیے۔۔''

''وہ کس برتے۔۔۔ کس ناطے وہ تیرے لیے یہ سب کرتا۔۔۔ کیا تو نے اسے مان دیا۔۔۔ عزت اور احترام کے اس استھان پر رکھا، جہاں پر کھڑا ہو کر وہ پورے اعتماد کے ساتھ تمہارے لیے لڑ سکتا۔ اجنبیوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک نہیں کیا جاتا جو تو نے اس کے ساتھ کیا ہے۔۔''

اس کے اندر سے احتجاج اٹھا تو وہ لمحے اس کی نگاہوں کے سامنے آگئے جب شعیب کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ کمرے سے باہر دروازے کی درز میں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کس قدر بے بسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ وہاں بیٹھا کسی اجنبی کی طرح سب کو دیکھ رہا تھا اور جب اس نے شرط رکھی تھی تو اس کا چہرہ کس قدر سرخ ہوا تھا۔ وہ کیا تھے۔۔۔ جذبات تھے۔۔۔ یا غصہ

تھا۔۔۔ کیا تھا۔۔۔

''تو نے وقت خود اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا ہے۔ تم لاہور میں اس کی تصویر دیکھنے سے لے کر اسے حقیقت میں اپنے سامنے دیکھنے تک، کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔ یہ مان لو کہ تم اپنے ہی فیصلے کے بوجھ تلے دب گئی ہو۔ اب اگر سناٹے تمہارے اندر پھیل گئے ہیں تو اس میں کسی کا قصور نہیں ہے۔ نہ حالات کا اور نہ ہی قسمت کا۔ تم نے اپنی خوشیاں خود دوسروں کو دے دی ہیں۔ اب تہی دامن ہو جانے کا کیا فائدہ۔ اپنی قسمت کو ریت کی مانند اپنی مٹھی سے اُڑا دیا ہے۔''

''نہیں، میں نے قربانی دی ہے۔۔'' اس نے چونکتے ہوئے سوچا۔

''غلط کہہ رہی ہو۔۔ اگر تم نے قربانی دینا ہوتی نا تو یوں تنہائی محسوس نہ کرتی۔ اپنے فیصلے پر افسوس زدہ، ماتم نہ کر رہی ہوتی۔ تم اپنے ذہن میں کچھ اور ہی لیے بیٹھی ہو۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا تم پیر سائیں سے نفرت نہیں کرتی ہو؟''

''ہاں۔ ! مجھے نفرت ہے۔۔ لیکن مجھے شعیب پر بھی غصہ ہے اور میں۔۔۔''

''تم خود الجھی ہوئی ہو۔۔۔ تمہیں اپنی ذات کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے پا رہا ہے۔ اور اگر کچھ دکھائی بھی دے رہا ہے تو تم سمجھ نہیں پا رہی ہو کہ آخر کرنا کیا ہے۔۔ اور اپنے اسی احمق پن کی وجہ سے تم اپنی بازی خود ہار گئی ہو۔ نہ تمہاری بغاوت تمہارے کسی کام آئی۔۔ اور نہ تمہاری محبت۔۔۔''

''نہیں شعیب کو مجھ سے محبت ہے۔ ورنہ وہ یوں تڑپ کر میرے لیے حویلی نہ بھاگا آتا۔''

''تو پھر تو نے اس کا مان کیا رکھا۔ اس کے سامنے تک نہیں گئی۔۔ اور اگر تجھے اب شعیب کی محبت کا احساس ہے تو کیا۔۔۔؟ وہ تو اب فرح کا ہو چکا۔ اب اگر تم اپنی محبت کا اظہار بھی کرو گی تو فرح کی گنہ گار ہو گی۔ جسے تم نے خود اپنے ہاتھوں سے سونپا ہے۔ مان لو، زندگی تمہارے در پر خوشیاں لے کر آئی، جیسے تم نے خود لوٹا دیا۔''

''میں اگر مان بھی لوں کہ میں نے خود اپنی خوشیاں

دوسروں کو سونپ دی ہیں تو پھر کیا میری زندگی کی تنہائی ختم ہو جائے گی۔۔؟"

"ختم نہیں ہوگی، لیکن سکون تو ہو جائے گا۔ اپنا قصور مان لینے میں بڑا حوصلہ چاہیے۔"

"میں کیا کروں۔؟"

"کچھ بھی نہیں، بس تسلیم کرو کہ تم نے زندگی کے تحفوں کو ٹھکرا دیا۔ جس کے لیے تنہائی تمہارے سنگ اب چلے گی۔ کرنا یہ ہوگا کہ بجائے تنہائی کو عذاب سمجھنے کے۔۔اس تنہائی کو اپنا دوست بنالو۔۔کسی کے سامنے اپنا دست سوال دراز نہ کرو۔ اپنی ذات میں کھو جاؤ۔ اپنی بے وقوفی، اپنے احمق پن۔ یا جذباتی لمحوں کا شاخسانہ۔۔جو بھی نام دو۔ اسے بھول جاؤ۔ اور دنیا پر یہ ظاہر کر دو کہ تم نے قربانی دی۔ اس پر قائم ہو۔"

"یہ تو منافقت ہوئی۔۔میں تو منافقت نہیں کر سکتی۔۔"

"نہ کرو منافقت۔ لیکن کسی پر اپنی کمزوری تو ظاہر نہ کرو۔"

"کیسے۔۔کیسے۔۔میں تنہائی کو اپنا دوست بنا سکتی ہوں۔"

"یہ سوچنا ہوگا۔۔۔یہ مجبوری ہے۔۔کرنا ہوگا یہ۔۔۔"

"ہاں۔ !میں اپنی تنہائی کو اپنا دوست بنا لوں گی۔ گذری یادوں کے سہارے۔۔" اس نے بے بسی سے سوچا تو کافی حد تک اس کے دل میں سکون اتر گیا۔ اسے لگا جیسے بہت بڑا بوجھ اس کے ذہن سے ہٹ گیا ہو۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بیڈ پر آن لیٹی۔ تبھی خوشبو کے آوارہ جھونکے کی مانند شعیب کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اختر رومانوی کا ہیولا جو اس کے ذہن میں بنا تھا۔ وہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ اس نے اختر کے بارے میں یہی ہیولا بنایا تھا کہ وہ پتلے سے بدن کا، عام سے لباس میں ملبوس ہوگا۔ اس کے چہرے پر بے روزگاری نے کافی حد تک بشاشت کو چھین لیا ہوگا۔ ایک عام سا نوجوان جسے زندگی سے تو کوئی حصہ نہیں لیکن زندگی کے لیے خاص جدوجہد کرنا بھی چاہتا ہوں۔ کیونکہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والے اکثر عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ لیکن جب اس نے شعیب کو دیکھا تو اس کا خیال یکسر بدل گیا۔ تصور تو پھر تصور ہوتی ہے۔ زندہ وجود جب سامنے آ جائے اور جذبات و احساسات کی مہکتی ہوئی پرچھائیں اس کے ساتھ خود پر اثر انداز ہو جائے تو بندے کو بے خود کر دیتی ہے۔ اس کو فون پر کی جانے والی طویل باتیں یاد آنے لگیں۔ گذری ہوئی راتوں کے وہ جذباتی لمحات، جن میں اپنا آپ کسی کو سونپ دینے کو جی ہمک اٹھتا ہے۔ باتوں کی آبشار میں وجود بھیگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو کرنے کے لیے دل ہی نہیں چاہتا۔ ہوا کے دوش پر بہہ جانے کو جی چاہتا ہے اور بدن سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی مہک بالکل کچی مٹی پر پانی چھڑکنے جیسی ہو جاتی ہے۔ جس سے بے خود ہو جانا اچھا لگتا ہے۔ وہ لمحے اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے گرد منڈلانے لگے۔ جیسے پرندے کسی سرسبز درخت پر ایک کے بعد ایک آ کر بیٹھنے لگتے ہیں۔ تبھی ان گذرے لمحوں نے اس کے احساسات اور جذبات میں ہلچل مچا دی۔ لیکن اس بار ان لمحات کی خوشبو تو پھیلی مگر اس میں ہجر کی وہ ٹیس بھی شامل تھی جس نے اسے بے قابو کر دیا۔ مایوسی کی لہر پورے وجود میں زہر بن کر پھیلنے کو تیار ہو بیٹھی۔ کھو دینے کے احساس نے اسے پوری طرح جکڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ تبھی وہ چونک گئی۔ زندگی کی راہ پر اپنے فیصلے کا زاد راہ لے کر ابھی تو وہ محض ایک قدم ہی چلی تھی کہ ہانپ کر بیٹھ گئی۔ کیا وہ روز اسی طرح خود جنگ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ سارا دن خود کو سمیٹنے اور رات بکھرتے گذرے گی۔؟ وہ تو کسی منزل تک پہنچنے سے قبل ہی اپنا وجود ریزہ ریزہ کر بیٹھے گی۔۔کیا وہ تنہائی کے سراب میں کسی سہارے کی تلاش میں سراب دیکھتی رہے گی یا پھر اس صحرا میں تڑپتی ہوئی پیاسی دم توڑ جائے گی۔۔کیا اس کے مقدر میں زندگی کی لطافتوں سے بھرا ہوا کوئی سائبان نہیں ہوگا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا پورا بدن پسینے میں نہا چکا تھا۔ وہ کیوں بہک رہی ہے۔ اسے تو اپنے فیصلے پر قائم رہنا ہے۔ اس نے بے بسی سے خود پر غور کیا۔ بدن کی تڑپ پکار رہی تھی اور وہ بے حال ہو کر خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اچانک اسے

خیال آیا کہ وہ اگر بے بس ہے تو اس کے بنانے والا تو بے بس نہیں اسے اپنے رب سے مدد مانگنی چاہیے۔ وہی تو سارے بے سہاروں کا سہارا ہے۔ وہ اگر اس کے ساتھ ہو گا تو کہیں بھی کمزوری اسے راہ سے بھٹکا نہیں سکے گی۔ اسے اپنے رب ہی سے مدد مانگنا ہو گی۔ اس خیال کے آتے ہی اسے یوں لگا جیسے دہکتی ہوئی آگ پر چھاجوں پانی برس جائے۔ ایک سکون کی لہر پورے وجود میں پھیل گئی۔ ٹھنڈک کا احساس اس کے پورے وجود میں مہکنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ کتنی ہی دیر تک پانی کے چھینٹے منہ پر مارتی رہی۔ پھر بڑے اہتمام سے وضو کیا اور کمرے میں آ گئی۔ اس نے جائے نماز بچھائی اور اپنے رب کے حضور کھڑی ہو گئی۔ کمرے سے باہر رات کا اندھیرا اپنا آپ منوا رہا تھا اور کمرے کے اندر نادیہ اس روشنی کا سراغ پانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جس میں وہ اپنے شعور کی لگامیں خود تھام سکتی تھی۔ ہر طرف سکون چھا گیا تھا۔

☆......☆......☆

زندگی میں جب بنا خواہش کے بہت زیادہ خوشیاں مل جائیں تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ خوشیاں جن کے بارے میں بندہ بالکل ناامید ہوتا ہے۔ سوکھے ہوئے پیڑ پر اچانک بہار آ جائے تو اس درخت کے ثمرات کو پانے کی بے چینی بندے کو بے حال کر دیتی ہے۔ ناامیدی سے امید تک کے سفر میں کھو دینے کا تو احساس ہی نہیں ہوتا، بس پانے کی جستجو اور خواہش بڑھتی رہتی ہے۔ جب پا لیا تو پھر کھو جانے کا خوف اپنی پوری ہیبت کے ساتھ بندے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ فرح کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا نہیں تھا کہ اس کی شادی ہو جائے گی۔ اب جبکہ وہ خواب کیں جیسے لمحات میں سے گزر رہی تھی۔ شعیب کی محبت نے اسے نہال کر دیا ہوا تھا۔ ایسے میں حویلی کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں خوف زدہ کر دینے والے احساسات اسے دہلا دیتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنی ہی سوچوں سے گھبرا جایا کرتی تھی۔ اس کے شادی کے پہلے ہی دن جب وہ حویلی گئی تھی۔ تبھی نادیہ کو بھی وہاں پایا تھا۔ لیکن آفرین ہے نادیہ پر اس نے شکوہ یا شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ بلکہ اسے زیادہ محبت سے اور خدمت کرنے کی تلقین کرتی رہی تھی۔ نجانے اسے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ خوشیاں جو اس کے حصے میں آئی ہیں، اس کی اپنی نہیں، نادیہ کی دی ہوئی ہیں۔

"فرح ... اری او فرح۔ کہاں ہو بیٹی ..."

زبیدہ پھوپھو کی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونکی، وہ باہر کہیں کھڑی اسے آوازیں دے رہی تھی۔ تب وہ جلدی سے نکل کر کمرے سے باہر آ گئی۔ زبیدہ کاریڈور کے کنارے کھڑی تھی۔

"جی پھوپھو۔!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے پاس چلی گئی۔

"ارے بیٹا، شعیب کے آنے کا وقت ہو گیا ہے اور ابھی تک تم ویسے ہی پھر رہی ہو۔ تھوڑا بہت تیار ہو جاتے ہیں بیٹی۔" زبیدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

"ابھی میں نے کھانا بنوایا ہے خانساماں سے ... کچن سے آ کر بیٹھی ہوں۔" اس نے وجہ بتائی تو زبیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تم تیار ہو کر آ جاؤ ڈرائنگ روم میں۔" زبیدہ نے کہا اور اس طرف بڑھ گئی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ یونہی سوچنے لگی کہ سنا ہے ساس بہت ظالم ہوتی ہے۔ یہاں تو یہ نعمت میسر تھی کہ وہ بالکل بڑوں کی مانند اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ اپنی قسمت پر مسکرا دی۔

وہ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گئی تو زبیدہ پھوپھو کو اپنی سوچوں میں گم پایا تب وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"پھوپھو۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ زیادہ تر سوچوں میں گم رہتی ہیں آخر ایسی کیا بات ہے۔"

"بیٹی۔ یہ جو یادیں ہوتی ہیں نا ... یہ انسان کا بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔ اچھے دن چاہے وہ بہت تھوڑے سے بھی ہوں ... وہ یاد آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں نا ..."

"اگر میں غلط نہیں تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ پھوپھا کاشف کو یاد کرتی ہیں نا۔" اس نے شرارت سے مسکراتے

ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹی۔! وہی تو میری زندگی کا حاصل تھا۔ اس کا اور میرا ساتھ جتنا بھی تھا۔ وہ ایسا تھا کہ بندہ چاہتے ہوئے بھی اسے نہیں بھلا سکتا۔" اس نے یادوں میں بھٹکتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ پھر چونکتے ہوئے بولی۔ "بیٹی۔! یہ جو تعلق ہوتے ہیں نا، بڑے نصیبوں سے بنتے ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا۔۔ خوشگوار تعلق ہوں نا تو زندگی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ ورنہ تعلق نبھانے میں خونِ جگر بھی رائیگاں چلا جاتا ہے۔ قسمت والے ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی میں اچھا ساتھ مل جاتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔ میں جو بھی ایسے تعلق کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے یوں مل گیا کہ سوچنا بھی نہیں پڑا۔ اور نادیہ کے من میں کیا ہے۔ یہ میں نہیں جانتی، لیکن اس نے نہ صرف اپنے ہر فیصلے پر خود لکیر پھیری ہے بلکہ وہ کسی بھی فیصلے تک پہنچنے میں خود اپنی سوچوں کا سہارا نہیں لیتی۔ ڈٹ جانے کی اس میں ہمت ہی نہیں ہے۔" زبیدہ نے اپنے تئیں تجزیہ کرتے ہوئے کہا تو فرح تیزی سے بولی۔

"لیکن پھوپھو۔! آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ اُسی میں حوصلہ ہے، ورنہ وہ حویلی کی روایات کو توڑ کر اتنی دور نہ چلی جاتی۔"

"وہی تو میں کہہ رہی ہو، فیصلہ کر کے اس پر ثابت قدم رہنا نہیں آتا اس کو۔۔ اگر وہ شعیب کے لیے گئی تھی تو پھر اسے ہر حال میں شادی بھی اسی سے کر لینی چاہئے تھی۔ اپنے فیصلے پر قائم رہتی۔۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"شاید یہاں قدرت کا فیصلہ تھا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"خیر۔ اجو ہوا سو ہوا۔ نجانے آنے والے حالات میں کیا ہے۔ اس بارے کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن۔ اتم اپنے اس تعلق کو بہت خوشگوار رکھنا۔ اس کے لیے زندگی کی راہوں پر چلتے ہوئے بہت ساری قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ شوہر اور بیوی کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ ٹوٹے نہیں ٹوٹ سکتا۔ لیکن اگر اس میں کہیں شک کی دراڑ پڑ جائے تو کچے دھاگے سے بھی نازک تعلق ہوتا ہے۔ یہ سارا تعلق اعتماد اور یقین پر ہوتا ہے۔"

"جی پھوپھو۔! آپ میری راہنمائی کرتی رہیں نا۔" اس نے کافی حد تک خوف زدہ لہجے میں کہا۔ اس پر زبیدہ مسکرا دی اور بڑے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور بڑے نرم لہجے میں بولی۔

"میں ہوں نا ادھر۔۔ لیکن تم خود کو مضبوط رکھنا۔۔"

یہ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز آگئی۔

"لگتا ہے شعیب آگئے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو زبیدہ نے اطمینان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، میں نے شعیب سے بات کرنی ہے، تم لوگوں کے بارے میں، میری ہاں میں ہاں ملاتی رہنا۔"

"ٹھیک ہے، پھوپھو۔" فرح نے سعادت مندی سے کہا اور شعیب کی راہ تکنے لگی۔

وہ جب کھانا کھا چکے اور گپ شپ کے لیے ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ زبیدہ نے یونہی بات چھیڑ دی۔

"شعیب تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری شادی کو آج ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔"

"جی امی۔" اس نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سوال ایویں نہیں، کسی خاص بات کہ تمہید ہے۔

"اب تمہیں بھی معلوم ہے کہ یہ شادی کس حال میں ہوئی اور حالات کیا تھے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں اپنے بیٹے کی بارات دھوم سے لے کر جاتی، چار دن خوب ہلا گلا رہتا اور میں ہر ماں کی طرح اپنے ارمان پورے کرتی۔" وہ بڑی مسرت سے بولی تو شعیب نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"امی۔ اس ساری تمہید کو چھوڑیں اور جو آپ نے اصل بات کہنی ہیں وہ کہیں۔ ورنہ پھر میں نے یہ ضد کر لینی ہے کہ میری بارات لے کر جائیں اور فرح کو دوبارہ سے دلہن بنا کر لے آئیں۔"

"ویسے ہونا تو یہی چاہیے، لیکن اب اس میں وہ مزہ

نہیں رہے گا۔'' اس نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔
''تو اصل بات بتائیں پھر۔؟'' وہ بولا۔
''دیکھو، میرے تو ارمان پورے نہیں ہوئے۔لیکن بے چاری کا کیا قصور ہے۔اسے تو کہیں لے کر جاؤ، گھماؤ ۔پھراؤ۔'' زبیدہ نے فرح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''امی، یہ سارا قصور آپ کا ہے۔آپ نے پہلے کہا ہی نہیں۔ورنہ میں اسے کب کا لے جاتا، ویسے کیا، یہ بات فرح نے آپ سے کہی ہے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔
''نہیں، میں نے خود سوچا ہے۔اب ایسا کرو، پورے ایک ہفتے کی یا دس دن کی چھٹی لو، اور نکلو یہاں سے۔مجھے بھی لاہور سے آئے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں۔''
''تو یوں کہیں نا، آپ کا جی یہاں نہیں لگ رہا۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔
''نہیں، اب میں نے کہاں جانا ہے پتر۔مرنا جینا تم دونوں کے ساتھ ہے۔تم ذرا شمالی علاقوں میں گھوم آنا اور میں اتنے دن لاہور رہ لوں گیا۔بس اتنی سے بات ہے۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔
''امی۔کیوں نہ ایسا کریں۔یہاں سے تبادلہ کروالیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔نجانے اس کے لہجے میں حسرت کہاں سے اتر آئی تھی۔زبیدہ نے اس کے لہجے پر توجہ دیے بغیر کہا۔
''اگر تو لاہور میں ہوتا ہے تو پھر ٹھیک ہے، ورنہ کسی اور شہر میں ہو تو پھر کوئی فائدہ نہیں، وہ بھی ایسا ہی ہو گا۔یہاں تو پھر حویلی نزدیک ہے۔فرح کے لیے آسانی ہوگی۔''
''او کے۔!تو پھر آپ سامان باندھیں۔میں نے پہلے ہی سے پندرہ دن کی چھٹی لے لی ہوئی ہے۔میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں جاؤں لاہور۔۔اپنے دوستوں یاروں سے ملوں۔۔کیوں فرح تم تیار ہو؟'' آخری فقرہ اس نے فرح کی طرف دیکھ کر کہا جو ان کی باتوں کے درمیان بالکل بھی نہیں بول تھی۔
''جی، جیسا آپ چاہیں۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔
''تو ٹھیک ہے کل دن کے وقت نکلتے ہیں۔'' شعیب نے حتمی انداز میں کہا اور اٹھ گیا۔زبیدہ نے فرح کی طرف دیکھا تو دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرا دیں۔ان کے دل کی بات شعیب نے پہلے ہی بوجھ لی ہوئی تھی۔
اگلی صبح جب وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تو شعیب نے فرح کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
''ہاں تو پھر چلنے کے لیے تیار ہو؟''
''جی، میں بالکل تیار ہوں۔''
''اور امی۔؟''
''وہ بھی تیار ہیں۔''
''تو پھر نکلیں۔سامان رکھواؤ گاڑی میں۔''
''وہ پھوپھو نے رکھوا دیا ہے۔ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔''
''چلو پھر۔'' یہ کہتے ہوئے شعیب اٹھا اور ڈرائینگ روم میں آگیا۔جہاں زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔اسے دیکھ کر وہ بولا۔''چلیں امی۔''
''ہاں، وہ ذرا ڈرائیور سے کہہ دینا، حویلی کی طرف سے ہوتا ہوا چلے، جاتے ہوئے ان سے مل لیں۔'' زبیدہ نے اٹھتے ہوئے تو وہ ایک دم سے چونک گیا۔پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔
''امی۔!اب چھوڑیں، وہاں پتہ نہیں کتنا وقت لگ جائے واپسی پر ہی۔''
''کتنا وقت لگے، زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ آدھا گھنٹہ۔وہاں ہم نے سارا دن تھوڑی رہنا ہے۔'' وہ حیرت سے بولیں۔
''تو امی، آپ پہلے حویلی سے ہو کر آجائیں۔پھر ہم نکل چلتے ہیں۔میں آپ کا یہاں انتظار کرتا ہوں۔اس نے کہا اور صوفے پر ٹک گیا۔تب فرح کے چہرے پر پھیلی ہوئی ساری خوشگوار ختم ہوگئی۔جیسے سورج کے آگے بادل آگئے ہوں۔
''کیا تمہیں حویلی جانا اچھا نہیں لگتا؟'' زبیدہ نے پوچھا تو اس نے صاف لفظوں میں کہا۔
''اچھا لگنے یا نہ لگنے کی بات نہیں، بس میں نے سوچ لیا ہے کہ وہاں نہیں جانا تو بس نہیں جانا۔''
''اس کی وجہ؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے یہ کہہ کر لاجواب کر دیا۔ ماحول میں ایک دم سے تلخی در آئی تو گزرتے ہوئے لمحے بھاری لگنے لگے۔ تبھی فرح نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"پھوپھو۔! اگر شعیب حویلی نہیں جانا چاہتے تو اس میں سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ جائیں یا نہ جائیں۔ انہوں نے ہمیں تو نہیں روکا۔ اگر آپ حویلی جانا چاہیں تو آپ ہو آئیں۔ میں بھی یہیں آپ کا انتظار کروں گی۔"

اس کے یوں کہنے پر زبیدہ نے بڑی گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ وقت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی کوئی بات منوا سکے۔ جب فرح ہی اپنے حق سے دستبردار ہو رہی ہے تو وہ اپنے بیٹے کی ضد کو تسلیم کیوں نہ کرے۔ یہ ایسا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے حویلی نہ جانے کی وجہ پوچھے۔ وہ جتنا پوچھتی ماحول اتنا ہی کشیدہ ہو جانا تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو۔! سیدھے نکلتے ہیں۔ بعد میں جب آؤں گی تو حویلی چلی جاؤں گی۔"

اس نے یوں کہنے پر شعیب چند لمحے اپنی ماں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر تحمل سے بولا

"امی۔! آپ حویلی سے ہو آئیں بلکہ فرح کو بھی ساتھ میں لے جائیں۔ وہ ہمارا یوں اچانک جانا کسی اور ہی معنی میں نہ لے لیں۔"

"میں انہیں فون پر بتادوں گی۔ اور ہم ان کے پابند تھوڑی ہیں۔ جو انہیں بتاتے پھریں۔ جیسے ضرورت ہوگی وہ خود ہی فون کرلے گا۔ چلو نکلو، اب دیر مت کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب چل دیں۔ وہ صوفے پر بیٹھا چند لمحے سوچتا رہا، پھر اٹھ گیا۔ فرح اس کے پیچھے پیچھے پورچ تک آ گئی۔ ذرا سی تلخی اب بھی اس کے من میں تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔ فرح نے پہلی بار سلامت نگر دیکھا تھا۔ بچپن میں شاید وہ ان گلیوں اور راستوں سے گزری ہوگی، جو اب بہت بدل گئے تھے۔ اب اس کے سامنے جو منظر بھی تھے، وہ سب نئے تھے۔ وہ ان مناظر میں کھو جانا چاہتی تھی جو اسے شعیب دکھاتا۔

☆......☆......☆

کئی دن گزر گئے تھے۔ نادیہ کا من نجانے کیوں بھاری بھاری رہتا تھا۔ وہ لاکھ اپنی توجہ شعیب اور فرح کی طرف سے ہٹاتی، مگر پھر بھی ذہنی رو ان کی طرف چلی جاتی۔ نجانے کب کے کہانیوں میں پڑھے ہوئے واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو جاتے۔ اگرچہ ہر کہانی اور افسانے کا ہیروئین اور ہیرو الگ الگ تھے لیکن نادیہ کے ذہن میں آنے والے واقعات میں سارے ہیرو اب شعیب اور ہیروئین فرح بن چکے تھے۔ جو بھی واقعہ اس کے ذہن میں در آتا۔ اس میں صورت حال جو بھی ہوتی، اس ساری صورت حال میں اسے وہ دونوں دکھائی دیتے۔ انسان چاہے جتنا بھی خود کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ دماغ بھی عجیب شے ہے۔ سوچوں کے اتنے پہلو اس میں ابھرتے ہیں، شعور اور لاشعور کی اتنی کارفرمایاں اس میں ہیں کہ انسان خود اسی کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ ان دونوں کے بارے میں سوچے لیکن کوئی نہ کوئی سوچ وہ سوچتی چلی جاتی۔ وہ چونکتی اس وقت جب من میں ایک طرح کی یاسیت اور کھو دینے کا احساس جاگزیں ہو جاتا۔ دل سے اٹھنے والی ہوک اسے کہیں کا نہ رکھتی تو وہ خود سے شرمندہ ہو جاتی۔ جب اس نے اپنی محبت کسی دوسرے کی جھولی میں ڈال دی تو پھر پچھتانا کاہے کا۔ یہیں سے اس کے اندر کشمکش کا آغاز ہو جاتا اور اس کے اندر بیٹھی ہوئی نادیہ سے گفتگو اس قدر بڑھتی کہ بحث تک جا پہنچتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بحث کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہی گفتگو، یہ بحث، یہ ہمکلامی، اس پر سوچیں، ہمکلامی میں کبھی ہار جاتی اور کبھی جیت جاتی، لیکن اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس نے غلط کیا، کیونکہ اسی دوران اس کا اپنا مقصد پوری طرح تن کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ باوجود شدید خواہش کے وہ اپنے مقصد کے لیے ایک بھرپور کوشش نہیں کر پائی تھی۔ وہ ابھی اس حصار ہی سے باہر نہیں نکلی تھی جو خود اس نے اپنے گرد باندھ لیا تھا۔ شاید وہ ان دونوں کو بھول کر اپنی دنیا میں کھو جاتی، جہاں اس کے اپنے تصورات تھے اور اپنی مرضی کی مملکت تھی مگر اس کی دنیا میں روزانہ ہی ہلچل پیدا ہو جاتی۔ اماں بی، زہرہ بی، یا پھر پیر سائیں کسی نہ کسی حوالے سے ان دونوں کا ذکر کر دیتے۔ بات یہیں

سے شروع ہوئی تھی کہ وہ حویلی میں آئے بغیر لاہور کیوں چلے گئے؟ یہی سوال ان کے لیے سوہان روح تھا۔ کہیں محبت کا تقاضہ تھا، لیکن کھو جانے کا خوف تھا اور کہیں انا پر ٹھیس پڑی تھی۔ خود اس کی سوچ میں کیا تھا۔ یہ جاننے کی اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کے اندر سے خود بخود کوئی واقعہ ابھرتا اور چشم زدن میں وہ ان دلوں کو پالیتی۔ جب من کی دنیا میں عجیب طرح کی لہریں اٹھ جاتیں۔ جنہیں وہ خود سمجھ نہ پاتیں اور جو سمجھ آتیں اسے نظرانداز کر جاتی۔

چاہیے تو یہ تھا کہ گزرتے دنوں کے ساتھ اس کی یہ کیفیات ماند پڑ جاتیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب تو اس میں جذبات بھی شامل ہو گئے۔ حسرتیں بھی منہ کھولے آ جاتیں۔ امیدیں آنکھیں کھولے اس کی طرف تکنے لگتیں۔ اور خواہشات اپنے بال کھولے اس کا طواف کرنے لگتیں۔ ایسے میں وہ بے انتہا گھبرا جاتی۔ فرار کی کوئی راہ اس کے پاس نہیں تھی۔ یہی وہ کمزور ترین لمحات تھے جن میں وہ بے بسی محسوس کرتی تھی۔ وہ بے حال ہو جاتی۔ وہ جب ایسے لمحات پاتی، تو اپنی توجہ مبذول کرنے کی بجائے فرار چاہتی۔ تب اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ سیدھے جا کر وضو کرتی اور اپنے رب کے حضور جا کر کھڑی ہو جاتی۔ یہی وہ وقت ہوتا جب وہ دنیا سے ناطہ توڑنے میں پوری طرح تو نہیں مگر کافی حد تک کامیاب ہو جاتی۔ وہ جب تک حاضر رہتی، تب تک سکون میں ہوتی۔ پھر معمولات زندگی کی ابتداء ہوتی اور ایک دورانیے میں پھنس کر دوبارہ اسی کیفیت میں آ جاتی۔ رسائل، کتابوں اور میگزین کے انبار لگ گئے تھے لیکن ایک لفظ بھی پڑھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وجہ صرف یہی تھی کہ کسی بھی کہانی کا ہیرو شعیب ہوتا اور ہیروئن فرح۔ دوسرا اسے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس لیے پڑھنے والی چیزیں اس کی منتظر رہنے لگیں۔ سوائے رب کے حضور کھڑے ہونے کے اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اس سہ پہر بارش ٹوٹ کر برسی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ سارے بادل آج ہی برس جائیں گے۔ کچھ دیر پہلے ہی بی اماں اسے بتا کر گئیں تھیں کہ شعیب اور فرح سوات کی حسین وادی میں ہیں۔ وہیں سے انہوں نے فون کر کے بتایا ہے کہ وہ کہاں کہاں کی سیر کر رہے ہیں۔ اور کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ وہ تو چلی گئیں لیکن موسم کی گھٹن کے ساتھ اس کے اندر کی گھٹن بھی بڑھنے لگی تھی۔ پھر اچانک ہی بارش ہونے لگی تو وہ اپنی کھڑکی سے آن لگی۔ دور تک برستا ہوا پانی سارے منظروں کو دھندلا کر رہا تھا۔ اور وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے وجود کو بھلانے کی ناکام کوشش میں تھی۔ بارش کا شور کم اور اس کے اندر کا شور کہیں زیادہ تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب بارش تھم گئی، اس کے اپنے اندر کی اور باہر بھی۔ اس نے اچانک ہی ایک فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل کرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنا بہترین لباس چنا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

کافی دیر بعد جب سورج مغرب میں غروب ہو گیا اور شہر کے سارے برقی قمقمے روشن ہو گئے تب وہ کاسنی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس اور بڑی ساری سیاہ چادر میں خود کو چھپائے ڈرائنگ روم میں تھی۔ اس کے ساتھ تاجاں مائی تھی، جس کے ہاتھ میں اگربتیاں اور ڈھیر سارے پھول تھے۔ اماں بی اور زہرہ بی دونوں وہیں (براجمان) تھیں۔ اسے یوں دیکھ کر اماں بی نے پوچھا۔

"نادیہ بیٹی۔! کہاں جا رہی ہو؟"

"میں مزار پر جا رہی ہوں۔۔۔ میں صاحب مزار کے لیے شاید اتنا نہیں، بلکہ اپنے والدین کی آخری آرام گاہ پر جانا چاہتی ہوں۔"

"لیکن تمہیں معلوم ہے کہ پیر سائیں نے حویلی کی سب خواتین کو مزار پر جانے سے منع کیا ہوا ہے۔" زہرہ بی نے دھیمے سے لہجے میں اسے یاد دلایا۔

"آپ ایسا کریں، انہیں اطلاع دے دیں۔ میرے خیال میں وہ مجھے منع نہیں کریں گے۔۔۔ اور اگر انہوں نے منع کر دیا تو میں نہیں جاؤں گی۔ واپس اپنے کمرے میں چلی جاؤں گی۔۔۔ ایک ذرا بحث نہیں کروں گی۔" نادیہ نے بڑے تحمل سے کہا۔ اس پر بی اماں چند لمحے سوچتی رہیں۔ پھر نادیہ کے چہرے پر پھیلے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر بولی۔

"ٹھیک ہے، میں ایک بار پوچھ لوں۔"

"جی ضرور۔!" نادیہ نے کہا اور وہیں سے پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اماں بی نے تاجاں بی بی ہی سے کہا کہ وہ جائے اور پیر سائیں سے اجازت لے

آئے۔ وہ فوراً ہی مردان خانے کی جانب چلی گئی۔ کافی دیر بعد جب کہ مغربی افق پر سرخی ختم ہو گئی۔ تاجاں اس کے کمرے میں آئی۔

"بی بی سئین۔ پیر سائیں نے اجازت دے دی ہے۔ بس اتنا کہا ہے کہ عشاء کی اذان ہوتے ہی واپس حویلی پلٹ آئیں۔"

"اماں بی اور زہرہ بی کو بتا دی ہے یہ بات۔۔۔" نادیہ نے پوچھا۔

"جی، میں انہیں بتا آئی ہوں۔"

"تو پھر چلو، ہمارے پاس تھوڑا سا وقت ہوگا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنی سیاہ چادر کو اپنے اردگرد یوں لپیٹ لیا کہ صرف آنکھیں دکھائی دیں۔

وہ درگاہ کے احاطے میں پہنچی تو وہ روشن تھا۔ لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ یوں جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔ اچانک اسے درگاہ کی ایک جانب مزار کی جالی کے پاس بہت ساری خواتین دکھائی دیں ورنہ وہاں کسی مرد کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ اس حیرت میں تھی کہ وہ ادھیڑ عمر خاتون اس کی طرف بڑھ آئی جو درگاہ کی خدمت گذاروں میں سے ایک تھی۔ وہ اسے دیکھ کھچی چلی جا رہی تھی۔ اس کے انداز سے یہی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس کی آمد کی منتظر ہو۔ پھر اس نے اظہار کر ہی دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی بی بی سئین آپ یہاں تشریف لائیں۔ عرصے بعد مرشد خاندان کی کوئی بی بی یہاں تشریف لائیں ہیں۔"

"تو کون ہے اور تجھے میری آمد کے بارے میں کیسے پتہ ہے۔" نادیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"بی بی سئین آپ ہم سے کیا بھولی ہوئی ہیں۔ زندگی گذار دی ہے یہاں خدمت کرتے۔ پہلے حویلی میں تھی اب یہاں ہوں۔۔۔ اور باقی رہی بات کہ آپ کی آمد بارے کیسے پتہ ہے تو ابھی کچھ دیر پہلے پیر سائیں کا حکم ہوا تھا کہ بی بی سئین درگاہ پر آ رہی ہیں۔ اس لیے کوئی بھی مرد احاطے میں نہ ہو۔ اور جب تک آپ یہاں ہوں، کسی کو آنے کی اجازت نہ دی۔ صرف خواتین رہ سکتی ہیں ادھر۔"

"اچھا تو یہ پیر سائیں کا حکم تھا۔" وہ ہمکلامی کے سے انداز میں بولی۔

"جی بی بی سئین۔" وہ خدمت گار خاتون کو سمجھ نہ آیا تو اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، تم جاؤ اپنا کام کرو۔" نادیہ نے کہا اور درگاہ کے اس کونے کی جانب دیکھا جو احاطہ پار کر کے تھوڑا فاصلے پر تھا اور اسی کونے میں پہلو بہ پہلو اس کے والدین دفن تھے۔ وہ مزار پر حاضری دینے کی بجائے سیدھا اپنے والدین کے مرقد پر گئی۔ وہاں جاتے ہی اس نے قبر پر پھول ڈالے، اگر بتیاں سلگائیں اور دونوں قبروں کے درمیان بیٹھ گئی۔ سفید پتھروں سے آراستہ پختہ قبروں کے درمیان، سیاہ چادر ڈالے، آنکھیں بند کر کے سر جھکائے وہ کافی دیر تک زیر لب پڑھتی رہی۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ سیاہ چادر کے پس منظر میں اس کے دونوں گورے ہاتھ یوں دکھائی دینے لگے۔ جیسے چمک رہے ہوں، حنائی ہاتھ، جڑاؤ کنگن اور بھرے بھرے ہاتھ۔۔۔ آنکھیں بند، ہلتے لب اور روشن چہرہ، اس وقت وہ کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگ رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک یونہی بیٹھی دعا مانگتی رہی۔ پھر جیسے اسے سکون آ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے اردگرد دیکھا، ویسا ہی سناٹے سے بھرا ماحول تھا۔ دور کہیں اکا دکا خواتین آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے والدین کے مرقد سے اٹھی اور درگاہ کے صاحب مزار کی جانب بڑھ گئی۔ وہ اس کے پڑدادا تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صاحب کرامات اور مستجاب الدعا شخصیت تھے۔ ان دنوں ان کی نہ حویلی تھی اور نہ ہی جاگیر، وہ فقیر آدمی تھا اور نجانے کہاں سے آ کر بستی کے باہر ڈیرے ڈالے تھے۔ ادھیڑ عمری میں انہوں نے یہاں کی ایک خاتون سے شادی کی اور پھر ایک گھر بنا کر رہنے لگے تھے۔ یہ حویلی تو ان کے دادا کی جوانی کے دور میں بنی تھی جب مریدین نے اصرار پر درگاہ تعمیر کی تھی۔ انہی دنوں ملک تقسیم ہوا تو درگاہ کے نام پر کافی ساری زمین دادا کی کوششوں سے الاٹ ہو گئی۔ انہوں نے اپنے مریدین کے ذریعے ان زمینوں کو آباد کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستی تیسری نسل آنے تک تحصیل کا درجہ پا گئی اور بڑے قصبے کا روپ دھار گئی۔ نادیہ کو اپنے خاندان بارے ساری

معلومات تھیں۔ وہ انہیں خیالوں میں کھوئی ہوئی مزار کی جالی کے پاس چلی گئی۔ جہاں کچھ خواتین پہلے ہی سے موجود تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ وہاں سے ہٹ گئیں۔ جالی سے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سنگ مرمر کی جالی منقش تھی۔ اور اس پر لوگوں نے مختلف رنگوں کے دھاگے باندھے ہوئے تھے۔ بڑے چھوٹے، نیلے پیلے، سرخ، سبز، ہر رنگ اور ہر طرح کے دھاگے۔۔۔ وہ انہیں دیکھنے لگی۔ بظاہر تو ان دھاگوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، لیکن جس وقت یہ دھاگے اس جالی سے باندھے گئے تھے، تب دھاگہ باندھنے والے کے من میں نجانے کیسی خواہش ہو گی۔ وہاں جتنے بھی دھاگے بندھے ہوتے تھے ہر دھاگے کی گرہ میں کم از کم ایک خواہش تو پنہاں تھیں۔ اس جالی پر نجانے کتنی خواہشیں پوری ہونے کی منتظر تھیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ پوری بھی ہو گئی ہوں۔ یہ گرہیں خواہش کے نجانے کتنے سپنوں میں لپٹی ہوتی ہوں گی۔ کاش اس میں کوئی ایسی صلاحیت ہوتی کہ وہ جس گرہ پر ہاتھ رکھتی اسے معلوم ہو جاتا کہ اس میں کون سی خواہش پنہاں ہے۔ تب کتنا اچھا لگتا۔ تب اگلے ہی لمحے وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گری۔ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ کس گرہ میں کون سی خواہش بندھی ہوئی ہے تو کیا وہ کسی بھی خواہش کو پورا کرنے کی مجاز ہے؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔ یہ تو قدرت کے کارخانے میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ رنگوں بھری یہ گرہیں خواہش کی نجانے اپنے اندر کتنی رنگین و سنگین حسرتیں رکھتی ہوں گی۔ وہ یہ سوچ تو سکتی ہے کہ ان گرہوں میں خواہشیں لپٹی ہوئی ہیں، وہ خواہشیں کیسی ہیں یہ نہیں جان سکتی تھی۔ وہ پوری توجہ سے اس بارے سوچتی چلی گئی تھی۔ تب اس نے ایک گہری سانس لی، اور مزار کے اندر دیکھنے لگی، وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک احساس اس کے سراپے میں پھیل گیا کہ زبیدہ پھوپھو نے یہیں کاشف پھوپھا کو دیکھا تھا، اسی جالی سے جہاں رنگین دھاگوں میں خواہش وقت کی صلیب پر لٹکی ہوتیں ہیں۔ انہوں نے جو خواہش کی وہ پوری تو ہوئی لیکن یوں کہ پوری زندگی ایک گرہ کی مانند ہو کر رہ گئی۔ کاشف پھوپھا، کچھ عرصہ زندہ رہے اور پھر یہ دنیا چھوڑ گئے۔ ساری رنگینیاں پھر سنگینی میں بدل گئیں۔ اور پھر اس کے اپنے ساتھ کیا ہوا۔۔۔؟ یہ سوچ آتے ہی وہ چونک گئی۔ وہ گھوم پھر کر اپنی ہی ذات کے بارے میں سوچنے لگ جایا کرتی تھی۔ کیا وہ خود کو مظلوم سمجھتی ہے؟ یہ سوال بذات خود اسے اپنی ذات کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ اور ایصال ثواب کے لیے قرآنی آیات پڑھنے لگی۔

دعا مانگنے کے بعد جب اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے تو ایک سکون اس کے من میں اترتا چلا گیا۔ وہ اٹھ گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ مزار پر ڈالنے کے لیے پھول تو ابھی تاجاں مائی ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ آگے بڑھی اور تاجاں مائی سے پھول لیے اور اس کمرے میں داخل ہو گئی جہاں مزار تھا اور اس میں کسی عورت کو جانے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ دہلیز پار کرتے ہی وہاں موجود خواتین کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ تاجاں مائی کے ساتھ ساتھ وہاں پر موجود خدمت گار خواتین کے رنگ بھی فق ہو گئے۔ ایک طرف انہیں یہ خوف تھا کہ پیر سائیں کو کیا جواب دیں گی اور دوسری طرف بی بی سئیں کو روک بھی نہیں سکتی تھیں۔ مزار پر آتے ہی نادیہ نے اس روایت کو بھی توڑ ڈالا تھا۔ اس نے مزار پر پھول چڑھائے۔ واپس پلٹنے لگی تو نجانے اس کے دل میں کیا آئی۔ اس نے مزار پر پڑی بہت ساری چادروں میں سے ایک چادر اٹھا کر اپنی سیاہ چادر پر اوڑھ لی۔ چند لمحے وہاں کھڑی رہی اور پھر وہاں سے نکل آئی۔ وہ کمرے سے نکلی اور احاطے میں آ گئی۔ واپسی پر درگاہ کے احاطے میں موجود ایک پرانے درخت پر اس کی نگاہ پڑی۔ جس پر مختلف رنگوں کے دھاگے باندھے ہوئے تھے۔ وہاں اور کچھ بھی باندھا ہوا تھا۔ رنگین رومال، رنگ برنگے شیشوں والے پراندے، چھوٹی بڑی گھنٹیاں، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے جھولے۔۔۔ اور نجانے کیا کچھ اندھیرے اور ذرا اونچائی کے باعث وہ اچھی طرح دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس نے سوچا، یہ بھی تو گرہیں خواہش کی ہیں۔ کس گرہ میں کیا ہو گا؟ لیکن یہ وقت سوچنے کا نہیں تھا۔ وہ اب واپسی کی راہ پر تھی۔

(جاری ہے)